غالب نامہ

آثارِ غالب

حصۂ نثر

اکرام

آثارِ غالب

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی زندگی اور تصانیف کا تفصیلی مُطالعہ
جدید علمِ نفسیات اور فنِ تنقید کی روشنی میں

از

شیخ محمد اکرام - ایم - اے - ایم - آر - سی - اے - ایس
آئی - سی - ایس

ناشر:- تاج آفس، محمد علی روڈ - بمبئی

مرکنٹائل پریس لاہور میں شیخ محمد اقبال ایم۔اے پرنٹر و پبلشر
نے چھپوا کر تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی سے شائع کیا ۔

فہرس

تبصرہ

غالب کے تذکرہ نگار

غالب کا ادبی ارتقا

تبصرۂ عمومی

دیباچہ

آج سے کوئی آٹھ سال پہلے، ہم نے غالب نامہ کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ جس میں مرزا غالب کی زندگی اور تصانیف کے متعلق ہماری تحقیق اور ریسرچ کے نتائج جمع تھے۔ کتاب کا بیشتر حصہ غالب کے اُردو اور فارسی کلام کے طویل انتخاب پر مشتمل تھا۔ جسے تاریخی ترتیب سے مدوّن کیا گیا تھا۔ اور شروع میں قریباً ڈیڑھ سو صفحے کا مقدمہ تھا۔ جس میں مرزا کے حالاتِ زندگی کا خلاصہ اور ان کی نظم و نثر اور شخصیت پر تبصرہ تھا۔

غالب نامہ ایک خشک سی تحقیقی اور تنقیدی کتاب تھی۔ جسے بعض اُردو تذکرہ نگاروں کی روش کے مطابق قصص و لطائف سے، یا مرزا غالب کے بہار آفریں قلم سے نکلے ہوئے خطوط کے طویل اقتباسات اور اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تھی۔ کتاب میں عام پسند کی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اسے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ علامہ اقبالؒ۔ مرزا محمدؐ سعید۔ ڈاکٹر عابد حسین اور دوسرے اہلِ نظر نے کتاب کے متعلق حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ اور عامۃ الناس میں بھی کتاب اِس درجہ مقبول ہوئی۔ کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسکے دو ایڈیشن ختم ہو گئے۔

صفحاتِ آئندہ میں اُس کام کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کی ابتدا غالب نامہ کے مقدمہ سے ہوئی تھی۔ اساس وُہی ہے۔ لیکن عمارت میں گوناگوں اضافے ہُوئے ہیں۔ کتاب کا حجم قریب قریب دُگنا ہوگیا ہے۔ دوسرے حصّے میں جو غالباً بعض لحاظ سے کتاب کی جان ہے، متعدد مباحث بالکل نئے ہیں۔ مثلاً غالب کی عشقیہ شاعری، غالب اور مغلیہ تہذیب کی ترجمانی، غالبؔ اور اقبالؔ، غالبؔ اور میرؔ، غالب کے اُردو خطوط اور نثرِ اُردو میں ان کا مرتبہ۔ بعض مضامین ایسے ہیں۔ جن کا سُراغ غالب نامہ میں بھی مِل جائے گا۔ لیکن جو اب نئے سرے سے طویل تصحیح و اضافہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ مثلاً غالب کا فلسفہ، غالب اور حبِ وطن وغیرہ سوانحی حصے میں اسقدر نمایاں تبدیلیاں نہیں۔ جس قدر حصۂ تنقید میں لیکن یہاں بھی بعض اجزا بہت حد تک بالکل نئے ہیں (مثلاً بابِ اوّل) بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو غالب نامہ میں قطعاً درج نہ تھیں (مثلاً غالبؔ کی گرفتاری کے متعلق منشی گھنیشام لال عاصی دہلوی کا معاصرانہ بیان)۔ ان کے علاوہ مکاتیبِ غالب کی اشاعت سے فرمانروایانِ رامپور، مرزا اور مرزا کی بیگم کے متعلق جو نئی معلومات فراہم ہوئی تھیں۔ وہ بھی درجِ کتاب کرلی گئی ہیں۔

کتاب میں اس قدر اضافہ اور تغیر و تبدّل ہُوا ہے۔ کہ شاید نام کی تبدیلی کو ناجائز نہ سمجھا جائے۔

ہمارا ارادہ تھا۔ کہ کتاب کے شروع میں آئینِ تنقید کے متعلق چند صفحے لکھیں گے۔ اور قدیم اور جدید کی جو بحث ڈاکٹر لطیف اور ڈاکٹر

کلیم الدین احمد کی تصانیف کے بعد شروع ہو گئی ہے۔ اس کی روشنی میں اپنے طریق کار کی وضاحت کرینگے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اس کی فرصت نہ ملی۔ اور معاملہ آئندہ اشاعت تک ملتوی رہا۔

مولٰینا غلام رسُول مہر نے اپنی کتاب غالب کی دوسری اشاعت میں مولٰینا ابو الکلام آزاد کا ایک بیان شائع کیا ہے۔ جس میں مولٰینا نے مرزا غالب کی ان مستند اور معاصرانہ تصاویر کی فہرست دی ہے۔ جو ان کی نظر سے گزری ہیں۔ اس فہرست میں وہ تصویر نہیں۔ جو غالب نامہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اور بعض حضرات کو خیال ہوا ہے۔ کہ شاید یہ تصویر اصلی اور معاصرانہ نہیں۔ جن اصحاب نے ہم سے لکھ کر دریافت کیا۔ ہم نے ان کی تشفی کر دی۔ لیکن اگر ان کے علاوہ کوئی اور بزرگ اس معاملے میں شبہ رکھتے ہوں۔ تو ہم ان کی اطلاع کے لئے فقط یہی کہنا چاہتے ہیں۔ کہ جس تصویر کو پہلے پہل شائع کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہُوا تھا۔ وہ وُہی تصویر تھی۔ جس کی نسبت مرزا نے اپنے رقعات میں لکھا ہے:۔

"ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے۔ اگر ہاتھ آجاوے گی۔ تو وہ ورق بھیج دوں گا۔"

مرزا کو تو غالباً یہ تصویر نہ ملی۔ اور انہوں نے پھر عالمِ ضعیفی میں وہ تصویر کھچوائی۔ جو اب عام طور پہ ملتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کی ایک نقل ہمارے ہاتھ آگئی۔ اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کی اجازت سے ہمیں موقع ملا۔ کہ اسے اہلِ نظر کے پیش کریں۔

اس تصویر میں دورِ حاضر کے کسی موقلم نے رنگ آمیزی نہیں کی۔ اور اس کا پسِ منظر بہت روشن نہیں۔ لیکن اس کے مستند اور معاصرانہ ہونے میں کلام نہیں۔ اور شاید مرزا کی کسی تصویر سے ان کی رئیسانہ تمکنت، عقابی تیز نگہی اور بشرے کی ذہانت اس طرح نمایاں نہیں ہوتی۔ جس طرح اِس تصویر سے +

اکرام



تذکرہ

باب اوّل

اکبر آباد

مغلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہجہاں آباد تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ نہ صرف ان کے فن تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے۔ بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلدۂ حسن و شعر ہے:

مرزا غالبؔ خود مغل تھے۔ اور ان کے دادا ان کے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان میں رہائش اختیار کی۔ مرزا کے دادا کی زبان ترکی تھی۔ یہاں کی زبان بہت کم سمجھتے تھے لیکن اعلےٰ خاندان کے

تھے۔ اس لئے انہیں مناسب منصب حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے۔ اور جب وہ وفات پا گئے۔ تو دہلی پہنچ کر نواب ذو الفقار الدولہ کی وساطت سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور ایک پرگنہ (پہاسو) اپنی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے حاصل کیا۔

مرزا کے دادا کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ خان تھا۔ اور عرف مرزا دولہا۔ اُن کی شادی آگرے کے ایک معزز گھرانے میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی عزت النسا سے ہوئی۔ وہ پیدا تو دہلی میں ہوئے تھے۔ لیکن جب والد کی وفات کے بعد پہاسو کی جاگیر جاتی رہی۔ تو انہیں تلاشِ ملازمت کیلئے جا بجا پھرنا پڑا۔ پہلے وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے۔ پھر حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں وہ کئی برس تک تین سو سواروں کے افسر رہے۔ لیکن حیدر آباد کی پُرانی خرابی یعنی "خانہ جنگی کے بکھیڑے" میں یہ نوکری جاتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے الور کا قصد کیا۔ ابھی انہیں الور میں کوئی خاطر خواہ ملازمت نہ ملی تھی۔ کہ اتفاق سے انہیں دنوں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے بھڑ گئے۔ اور جو فوج باغیوں کی سرکوبی کے لئے گئی۔ اس کے ساتھ مرزا عبداللہ خاں کو بھی بھیجا گیا۔ یہاں بدقسمتی سے انہیں پہنچتے ہی گولی لگی۔ جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ راج گڑھ ہی میں دفن ہوئے[1]۔

---

[1] مرزا نے ایک خط میں لکھا ہے "میرا باپ... مہاراجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی۔ اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے مجھ کو برائے دوام ملا"۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کے تین بچے تھے۔ مرزا غالب، مرزا یوسف اور چھوٹی خانم
مرزا غالب جن کا پورا نام اسداللہ بیگ خاں اور عرف مرزا نوشہ تھا، شب ہشتم ماہِ
رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ جس وقت ان کے والد کی
وفات ہوئی۔ وہ فقط پانچ سال کے تھے۔ اس کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے
انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ مرزا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے
صوبیدار تھے۔ لیکن جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دی۔ اور آگرے اور دوسرے
علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تو یہ عہدہ جاتا رہا۔ اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہوا۔ لیکن
فخرالدولہ نواب احمد بخش نے جنکی بہن ان سے منسوب تھیں۔ اور جن کے لارڈ لیک سے
دوستانہ مراسم تھے اس وقت مرزا نصراللہ خاں کی مدد کی۔ اور انہیں انگریزی فوج
میں چار سو سوار کے ایک دستے کا رسالدار مقرر کرا دیا۔ نواح آگرہ کے دو سیر حاصل پرگنے
سونک اور سونسہ مرزا نصراللہ خاں کی ذات اور رسالے کے اخراجات کے لئے انہیں
حینِ حیات تفویض ہوئے۔ لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا۔ کہ وہ چل بسے۔ اور
سارا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ اس وقت نواب احمد بخش نے ایک دفعہ پھر اپنے اثر و رسوخ
اور حکمتِ عملی کا وار چلایا۔ انہیں لارڈ لیک کی فتوحات کے بعد فیروز پور جھرکہ اور کچھ اور
علاقہ حسنِ خدمت کے عوض اس شرط پر ملا تھا۔ کہ وہ سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ
سالانہ دیں۔ اب مرزا نصراللہ کی وفات پر انہوں نے فیصلہ کرایا۔ کہ چار سو سوار کا جو
رسالہ مرزا نصراللہ سے وابستہ تھا۔ وہ توڑ دیا جائے۔ اور اس کی جگہ پچاس سوار کے
ایک دستے کا وہ خود بندوبست کریں۔ جو بشرطِ ضرورت حاضر ہو۔ اور اس کے ساتھ وہ
مرزا نصراللہ کے ورثا کی غور و پرداخت کا بھی اہتمام کریں۔ جس کے عوض میں پچیس ہزار

روپے سالانہ جو وہ سرکار کو دیتے تھے۔ معاف کر دئے جائیں۔ یہ فیصلہ ۴۔ مئی ۱۸۰۶ء کو ہُوا۔ اور اس کے مُطابق یہ طے ہُوا۔ کہ پندرہ ہزار روپیہ نواب احمد بخش پچاس سوار کے دستہ پر خرچ کریں۔ اور باقی رقم اپنے بہنوئی کے ورثا کی نگہداشت پر+

ننھیال

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "نصر اللہ بیگ خاں بہادر میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ اُس نے مجھے پالا"۔ اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ چچا کی وفات کے بعد اُس کا وارث ہونے کی بنا پر سرکار انگلشیہ کی طرف سے مرزا کی غور پرداخت کا انتظام کیا گیا۔ لیکن اُن کا بچپن اپنے چچا کے ہاں نہیں بلکہ اپنے نانا کے ہاں گزرا۔ مولٰینا حالی لکھتے ہیں۔ "مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سُسرال میں بسر کی۔ اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی"۔ مرزا غالب کے ابتدائی حالات سے واقف ہونے اور ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے لئے جنہوں نے اُن پر اُس زمانے میں اثر ڈالا' جب انسانی ذہن ایک لوحِ سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے'۔ ہمیں ان کے ناناہیال کے حالات سے آگہی کرنی چاہئے۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے متعلق بہت تھوڑی مُستند اور معاصرانہ معلُومات حاصل ہیں۔ البتہ اس اُردو خط سے جو مرزا نے اخیر عمر میں منشی شیو نرائن کو لکھا' پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کی ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھی۔ اور یہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ وہ منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق کو اپنے اور ان کے خاندان کے تعلقات کا حال بتاتے ہُوئے لکھتے ہیں :-

"تمہارے دادا کے والد عہدِ نجف خاں ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو

تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی۔ اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میری ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خان صاحب کے ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے جو کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں۔ اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں۔ یا چھوٹے ہوں۔ انیس ۱۹ بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان میں تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک اور کٹرہ کہ وہ کشمیرن دار کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

عنفوانِ شباب مندرجہ بالا اقتباس سے ایک تو کچھ اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کی ننھیال کس قدر متمول تھی۔ اور ان کا سلسلہ کتنا وسیع تھا۔ اور دوسرے غالب کے مشاغل شباب کا بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔ راجہ بلوان سنگھ، جن کا اس خط میں ذکر ہے۔ بنارس کے راجہ چیت سنگھ کے (جن کی وارن ہیسٹنگز سے کشمکش تاریخِ ہند کا ایک اہم باب ہے) صاحبزادے تھے۔

لیکن غالب کے سبھی ہمجولی اور ساتھی اس طرح بلند رتبہ اور عالی خاندان کے نہ تھے۔ بلکہ ان کے ایک بیان سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مرزا کی آزادروی انہیں بُری صحبت میں بھی لے گئی۔ وہ مہرِ نیمروز میں اپنے ابتدائی ایام پر تاسف کر کے لکھتے ہیں:۔

"سینۂ من نفسے داشت بروں آسانی نفسے کہ از نشتر زار زار زبان زدۂ من ا کہ دم جز بہ نابالیست نزدم و بنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باریٔ ابرے کہ از قبلہ خیزد بپہند گوش من کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم ؎

بااین فروغِ گوہرِ درخشانیٔ نہاد   زیں ساں سیاہ روز کرا کرد روزگار

با فروفرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگاں ہمنشیں و با اوباش ہم رنگ، بادۂ بیراہہ پوئے و زباں بیہودہ گوئے، در شکست خویش گردوں را دستیار و در آزار خویش دشمن را آموزگار"۔

منشی شیو نرائن کے نام مرزا نے جو خط لکھا ہے۔ اس میں اپنی شطرنج بازی اور پتنگ بازی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ مرزا کی دلچسپیاں انہی تک محدود تھیں۔ وہ اس وقت جوان تھے۔ ننھیال خوشحال تھی۔ اس لیے عیش و آرام اور لہو و لعب کے سارے وسیلے میسر تھے۔ اور اس پر اضافہ یہ کہ والد کا سایہ سر پر نہ تھا۔ کہ کوئی خاص روک ٹوک ہوتی۔ وہ تو حافظ کا شعر بزبانِ حال پڑھتے ہوں گے ؎

شہریست پر ز خوباں، ز ہر طرف نگارے   یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

اُن کے ایک ابتدائی قصیدے کی تشبیب ہے ؎

آں بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار   بود آشیانِ من شکنِ طرۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی   فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت بیشکار

ہر جلوہ راز من تبقاضائے دلبری — از غنچہ بود محملِ نازے بہ بگزار
ہم سینہ از بارِ سے جفا پیشہ دلبراں — فرہنگِ کاروائیٔ بیدادِ روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہداں — فہرستِ روزنامۂ اندوہِ انتظار

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سُور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار!

جوانی میں تھوڑی بہت دل لگی کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ لیکن مرزا غالب کا یہ زمانہ اِس قدر رنگینیوں سے بھرا ہُوا تھا۔ کہ معاصرانہ تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ نواب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"اسد اللہ خاں اسدؔ عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند مولدش اکبر آباد، جوان قابل، یار باش، دردمند، ہمیشہ بخوش معاشی بسر بُردہ ...... در خاطرِ متمکن غمہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ خمکدۂ نیاز"

انسان کو ان گلیوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ جہاں بچپن کے دِن گزارے ہوں۔ اور اگر ان گلی کوچوں سے رنگین اور پُرکیف ماحول کی یاد وابستہ ہو۔ تو ان سے تعلقِ خاطر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ مرزا کو بھی آگرے کے گلی کوچے عزیز تھے۔ اور جب یک دفعہ نواب ضیاء الدین خاں آگرے گئے ہیں۔ تو انہوں نے بڑے ولولہ انگیز طریقے سے اپنے "وطن" کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں:۔

"... شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستادہ تا ہمدوشِ غربت از شادمانیٔ دیدارِ وطن نیز نوائم داد۔ زینہار اکبر آباد را بچشمِ کم ننگرند۔ و در رہگذرہائے آں دیار الحفیظ گوے و الاماں سرائے گذرند۔ کہ آں آباد چہ ویراں و آں ویرانہ آباد بازی گاہِ جوشِ

مجنونے، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خون نے ست۔ روزگارے بودے کہ
دراں سرزمین جز مہر گیاہ نہ رُستے۔ و ہیچ نہال جز دل با، بنا وردے۔ نسیمِ صبح دراں گل کدہ
بہ مستانہ وزیدن و لہارا آں مایہ از جا بر انگیختے۔ کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر و پارسایان را
نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرہ خاک آں گل زمیں را از تن پیامے بود دلنشیں
و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، اما تازگیٔ وقتِ شمارا در نظرِ داشتہ
در دو پردہ شور پرسش انگیختہ بود و چشم براہ داشت کہ کسے نویسند و دریغ کہ ہیچ گاہ
نوشتند۔ کہ رخش سنگیں (یعنی اسپِ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است) دعائے مرا
بکدام ادا پذیرفت و دریا بپاسخ سلام من بزبانِ موج چہ گفت؟"

مرزا کا عنفوانِ شباب رنگ رلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ان کی یاد بھی ایک لحاظ
سے نشاط انگیز تھی۔ لیکن مرزا کو ان کا خمیازہ بڑا سخت بھگتنا پڑا۔ اور جب وہ ٹھنڈے
دل سے ان ایام کی بے حاصلگی، اور اوقاتِ عزیزہ کی تلفی پر غور کرتے۔ تو دل میں رنج و
کرب اور مایوسی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ ہم مہرِ نیمروز سے وہ اقتباس درج کر چکے ہیں جس میں
انہوں نے اپنی بے راہروی پر، اور ان قیمتی لمحوں کی یاد میں جو بے نتیجہ بلکہ مضر دلچسپیوں میں
تلف ہوئے، آنسو بہائے ہیں۔ ان احساسات کا اظہار اشعار میں بھی کئی جگہ ہے۔ ایک
فارسی مثنوی میں جو ان کی باطنی کشمکش کا آئینہ ہے۔ اور جو کسی ایسے زمانے میں لکھی گئی جب
وہ کوشش اور ہمت سے اپنے آپ کو انحطاط اور مایوسی کے گڑھے سے نکال رہے تھے۔ اور
اپنی پراگندہ قوتوں کو مجتمع کر کے اپنے آپ کو ایک بلند تر مطمحِ نظر کے قابل بنا رہے تھے۔ وہ
اس زمانے کی نسبت لکھتے ہیں ؎

گر مے خونت کہ ازیں بیش بود صرف بر انداختنِ خویش بود

آتشِ ہنگامہ بجاں داشتی   داغِ مغاں شیوہ بتاں داشتی
بود بہ پیچ و خمِ سودائے کار   کارِ تو چوں زلفِ بتاں تار و مار
بسکہ ہمی تیرہ تر از شام بود   روزِ تو داغِ دلِ ایّام بود
چشمِ پریشاں نظرے داشتی   جلوہ بہ ہر رہگذرے داشتی
بسکہ بلا بر اثرہ انداختے   دیدہ بصد جا سپر انداختے
زاں ہمہ اجزا زمانیکہ رفت   واں ہمہ خونابہ فشانی کہ رفت
ہر چہ کنوں می رسدم در نظر   شاہد و شعر است و شراب و شکر
چرخ بسا روز نگشت اینچنیں   آہ ز عمرے کہ گزشت اینچنیں!!

تعلیم

مرزا کے عنفوانِ شباب کا بیشتر حصّہ کھیل کود اور لہو ولعب میں صرف ہوا لیکن اتنا مُسَلّم ہے۔ کہ ان کی تعلیم سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ مرزا کی والدہ خود پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ اور قرینِ قیاس ہے۔ کہ انہوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہو گا۔ معاصرانہ تذکروں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور مرزا کے اساتذہ میں آگرہ کے دو مشہور مدرسین نظیر اکبر آبادی اور مولوی محمد معظم کے نام لئے جاتے ہیں۔ مرزا کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ علومِ مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی۔ منطق۔ فلسفہ اور علمِ ہیئت کی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے ماتحت علمِ طب کی تھوڑی بہت واقفیت ہر ذی علم کے لئے ضروری تھی۔ اور مرزا کی تصنیفات اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے واقف تھے۔ عربی صرف ونحو سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ اور بقولِ حالی جن بڑی بڑی ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں شعر گوئی علمِ عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم کی واقفیت

سے زیادہ جو چیز مرزا کو ممتاز کرتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرت اظہار ہے۔ اُنہوں نے گیارہ برس کی عمر میں ہی فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری کتابیں زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ فارسی سے دلچسپی مولوی محمد معظم کی شاگردی کے زمانہ سے ہی ہو گئی تھی۔ لیکن شاید اس بارے میں مُلا عبدالصمد ہرمزد کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ ہرمزد ۱۸۱۰ء کے قریب آگرے میں ایک سیاح کے طور پر آیا تھا۔ وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا۔ اور جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی آئے۔ تو وہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا ہو گا۔ یا مرزا میں اس کی دلچسپی بہت گہری ہو گی۔

مرزا اپنی تعلیم کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسانِ پنجم کی نسل میں سے معہٰذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص) اور غوامضِ فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پہ چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوندِ ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپِ عہد و بزرجمہرِ عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی۔"

تذکرۂ گلشنِ بے خزاں میں مرزا کی تعلیم کی نسبت ذیل کا اندراج ہے :۔

"غالب و اسد تخلص۔ اسد اللہ خاں نام۔ ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے

ہیں۔ کچھ تو سبب ہے۔ کہ وہ تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبائر غلام حسین خاں کمیدان۔ قبل اس سے جدِ دہلی (آگرہ) میں ان کی سکونت کا مکان۔ اُستادانِ باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعرا (نظیر اکبر آبادی) جو بے نظیر روزگار تھے۔ ان سے تعلیم پائی۔ ایام صبا سے بہ برکتِ انفاسِ متبرکہ ان اُستادوں کے بمرتبۂ علم پہنچے۔ تب ان کی فکرِ رسا نے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوشگو ہوں۔ جن کے اُستاد دو ہوں۔ چونکہ وہ اُستاد مر گئے۔ یہ جدِ دہلی (آگرہ) سے اُدھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں۔ یا شاید اقرار کریں۔"

یادگارِ غالب میں مرزا کے اُستاد کا نام شیخ معظم لکھا ہوا ہے۔ آگرے کے ایک مشہور مدرس میر اعظم علی اکبر آبادی کے نام مرزا کا ایک فارسی خط پنج آہنگ میں درج ہے۔ غالباً یہ بزرگ مرزا کے اُستاد نہ تھے۔ لیکن خط میں بڑی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور چونکہ میر اعظم علی بڑے عالم اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ عجب نہیں۔ کہ شاگرد نہ ہونے کے باوجود مرزا نے ان سے کسبِ فیض کیا ہو۔ میر اعظم علی نے ۱۸۰۵ء میں جب مرزا ابھی نو سال کے تھے۔ سکندر نامہ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اور ۱۸۴۵ء تک ان کا سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری رہا +

مرزا کی تعلیم کے متعلق جو منتشر اندراجات ملتے ہیں۔ ان سے ایک دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرزا کو سپاہیانہ فنون کی تعلیم جسے حاصل کر کے وہ اپنا آبائی پیشہ جاری رکھ سکتے تھے۔ نہ ملی۔ دوسرے اگرچہ ادبی اور عام درسی علوم سے انہیں اتنی واقفیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس کے بعد وہ اپنے مطالعہ اور اہلِ علم کی صحبت سے اس میں اضافہ کر سکے۔ اور اس مختصر سی بنیاد پر ایک گراں قدر قصرِ ادب کی تعمیر کر گئے۔ لیکن اس تعلیم کو کسی طرح

مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مرزاؔ کی اگر ابتدائی درسی تعلیم مکمل ہوتی۔ تو وہ ادب اور شعر کے غلط راستوں پر اتنی دیر نہ بھٹکتے۔ اُن کے ابتدائی ادبی رجحانات سے ظاہر ہے۔ کہ اگرچہ مولوی محمد معظم اور ہرمزد کے زیر اثر انہیں فارسی زبان اور بعض فارسی شعرا کے کلام سے واقفیت ہوگئی تھی لیکن مذاق کی وہ 'تربیت' اور 'اصلاح' جو بعد میں مولوی فضل حق اور نواب مصطفےٰ خاں کے اثرِ صحبت اور عرفی و نظیری اور دوسرے نغز گو شعرا کے کلام کے مطالعہ سے ہوئی' ابھی باقی تھی +

مرزا ابھی تیرہ برس کے طفلِ مکتب تھے۔ کہ ذوق ولی عہدِ سلطنت ظفر کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ اُس وقت ولی عہد کے اُستاد کا مشاہرہ چار روپے ماہوار تھا لیکن ولی عہد کی تخت نشینی کے وقت اُس کے اُستاد کا اُستادِ شاہ ہو جانا لازمی تھا۔ اس لئے اس تقرر سے مرزا کا راستہ بند ہو گیا +

شادی

مرزا کیلئے اس سال کا اور بھی اہم واقعہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے اُن کی شادی تھا۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو اُنہوں نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ شادی کو "دامِ سخت" ہی سمجھتے رہے اور "اڑنے" سے پہلے "گرفتار" ہو جانا انہیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کیلئے یہ شادی ہزار آسانیوں اور برکتوں کا باعث ہوئی +

غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے "آبِ حیات" میں کئی صفحے لکھے ہیں۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ اور نہایت پاکیزہ اور مؤثر شعر کہتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش جو لارڈ لیک کے بڑے منظورِ نظر تھے۔ مرزا الٰہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب کی اولاد سے مرزا غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئیگا۔ لیکن مندرجہ ذیل شجرۂ نسب پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اُنکی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز اور روبہ ترقی تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا +

مرزا غالب کا سسرال



ابتدائی اشعار

غالب نے قیامِ آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخۂ حمیدیہ میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کونسے اشعار آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو اکبرآباد کا ساکن بتایا گیا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخِ کتابت درج نہیں۔ اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری میں تذکرۂ سرور کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں بھی نہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً

دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا — جگر سے ٹوٹے ہوئے مُو کی ہے سناں پیدا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط — یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط

محفل شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں — شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو — دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو

شمشیرِ صاف یار جو زہر آب دادہ ہو | وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے | یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے | دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش | اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اِک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے | رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ | ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

مرزا کی خصوصیاتِ شاعری کے متعلق نواب اعظم الدولہ لکھتے ہیں:۔

"در فنِ سخن سنجی متتبع محاورات میرزا بیدل و در ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند بالجملہ موجدِ طرزِ خود است۔ و اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ۔ رُو بہ خیال بندی بیش از بیش بیش نہاد خاطر دارد"

عیار الشعرا میں جو خوب چند ذکا نے اپنے اُستاد شاہ نصیر کی فرمائش پر لکھا۔ غالب کے متعلق ذیل کا اندراج ہے:۔

"مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خان عرف مرزا دولہ نبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد شاگرد مولوی محمدؐ معظم۔ شاعر فارسی ہندی"۔

اس تذکرے میں دو شعر ایسے انتخاب ہوئے ہیں۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے نہیں گزرے ؂

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے   ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی   کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں بھر جائے

ان تذکروں کے قلمی نسخے ہندوستان کے چند کتب خانوں میں بھی ہیں اگر ان میں کوئی ایسا مل گیا۔ جس پر تاریخ کتابت درج ہوئی تو مرزا کے چند نہایت ابتدائی اشعار کے متعلق کہا جا سکے گا۔ کہ وہ کس عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ تاہم اب بھی اتنا یقینی ہے کہ مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر میں اردو اور دس گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً ان اشعار کا معتد بہ حصہ جنہیں مرزا نے پندرہ بیس سال بعد دیوانِ ریختہ سے حذف کیا۔ آگرے ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالات اسدؔ اور دوسرے میں غالبؔ کے تحت میں دئے ہوئے ہیں۔ مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اردو میں بھی غالب تخلص لکھنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص قائم رکھا اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے بعد کی چند غزلوں میں اسدؔ بھی استعمال کیا ہے +

نقلِ سکونت

مرزا کا دہلی میں آنا جانا اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جب ان کی عمر ابھی پانچ چھ سال کی تھی۔ لیکن یہ حقیقی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے میں وہ مستقلاً آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے۔ البتہ ان کے بعض خطوط سے خیال

ہوتا ہے۔ کہ وہ غالباً پندرہ سولہ برس کے ہوں گے۔ جب اُنہوں نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چونکہ ننھیال آگرے میں تھی۔ اس لئے وہاں اس کے بعد بھی جاتے تھے اور دیر تک مقیم رہتے۔ چنانچہ اُنہوں نے منشی شیونرائن کے خط میں جس پتنگ بازی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مرزا کی والدہ زندہ تھیں۔ اور ننھیال خوش حال۔ ایسی حالت میں اُن کا آگرہ چھوڑنا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے چچا مرزا نصراللہ خاں کی وفات پر اُن کی پنشن نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی۔ اور نواب نے اس کے عوض مرزا نصراللہ خاں کے ورثا کی غور و پرداخت اپنے ذمے لی تھی۔ اس کے علاوہ نواب کی بھتیجی سے مرزا کی شادی ہو جانے کے بعد ان کے تعلقات اس خاندان سے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور قرینِ قیاس ہے۔ کہ انہی تعلقات نے مرزا کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔

قیامِ آگرہ کے اثرات

مرزا کے قیامِ آگرہ کے متعلق معاصرانہ تذکروں اور مرزا کی اپنی تصانیف سے جتنا بھی مواد ملتا ہے۔ اُسے ہم نے گزشتہ صفحات میں یکجا کر دیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا قیامِ آگرہ انتہائی عیش و مسرت کا زمانہ تھا۔ اور ان دنوں رنج و الم یا کسی طرح کی مایوسی و بے اطمینانی ان کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی۔ مرزا کے بالکل ابتدائی ایام کی نسبت، ممکن ہے، یہ خیال درست ہو۔ لیکن اتنا کہنا ضروری ہے۔ کہ غالب کے ابتدائی ایام اور ان کے ننھیال کے متعلق مستند معاصرانہ اندراج تھوڑے ہیں۔ صرف نواب اعظم الدولہ کا بیان اور مرزا کا منشی شیونرائن کے نام خط ہی دو ایسے بیان ہیں۔ جنہیں اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی اشعار اور خطوط مرزا کے بعد کے تاثرات کا اظہار ہیں۔ اور اس لئے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ کہ

جب انسان بڑھاپے کو پہنچ کر (اور بالخصوص اس حالت میں جب ابتدائی ایام کے سوا باقی ساری زندگی مایوسیوں اور کلفتوں سے بھری ہوئی ہو) اپنے بچپن اور عنفوانِ شباب پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اسے یہ سارا زمانہ ایک رنگین اور مسرت افزا گہر میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی کلفتیں اور تکلیفیں سب بھول جاتی ہیں۔ اور صرف بے فکری اور عیش و آرام کے نقش نمایاں ہوتے ہیں۔ جن دو اندراجات کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ وہ ضرور اہم ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا بیان کس زمانے کا ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے۔ کہ اس کے بعد "خوش معاشی" کی حالت نہ رہی ہو۔ اور مرزا کے اپنے خط کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کہ مرزا کی ننھیال کی غیر معمولی خوشحالی اور فارغ البالی کب تک برقرار رہی۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ مرزا کے ابتدائی ایام اور ننھیال کے متعلق کئی ایسے سربستہ معمّے ہیں۔ جنہیں یہ مان کر کہ مرزا کی طفولیت اور عنفوانِ شباب تمام تر خوشی اور عیش و مسرت کا گہوارہ تھا۔ ہم کسی طرح حل نہیں کرسکتے۔ اور تمام حالات اور واقعات کا جائزہ لینے سے خیال ہوتا ہے کہ اگر مرزا کے ابتدائی ایام میں خوشی و بے فکری اور عیش و مسرت کا حصہ وافر تھا۔ تو ایسے ثرات بھی تھے۔ جو ناگوار خاطر تھے۔ اور جن سے مرزا کو اپنی کوتاہیوں اور اپنے گرد و پیش کے مقابلے میں اپنی کہتری کا احساس ہوتا تھا۔ مرزا کا آگرے میں قیام ایک پھولوں کی سیج پر تھا۔ لیکن ان پھولوں میں کانٹے بھی تھے۔ جو چبھتے تھے۔ اور جن کی خلش دیر تک قائم رہتی ÷

مرزا ابھی پانچ برس کے تھے، کہ ان کے والد وفات پاگئے۔ وہ جب زندہ تھے۔ تب بھی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" رہتے تھے۔ اپنے بھائی نصراللہ خاں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نہ کوئی ریاست نہ جاہ و ثروت! کیا مرزا کے حساس دل پر

ان حالات اور واقعات کا اثر نہ ہوتا ہوگا؟ وہ جب اپنے گردوپیش بڑی بڑی حویلیاں، اور اپنے قرابت داروں میں بڑے بڑے رئیس دیکھتے ہوں گے۔ اور اپنے ہمجولیوں سے پوچھتے ہونگے کہ میرا باپ کون تھا؟ کیا تھا؟ تو کیا اس کا جواب انہیں پسندِ خاطر ہوتا ہوگا۔ اور کیا وہ دل ہی دل میں اپنے ماحول کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور ضعیف بنیادی محسوس نہ کرتے ہوں گے۔

آگرے میں مرزا کا قیام اپنی ننھیال میں تھا۔ ان کی ننھیال خوشحال تھی۔ اور اپنے نانا اور نانی کو وہ بے حد عزیز ہوں گے۔ لیکن قدیم گھرانوں میں بھی اس بیٹی کی زندگی، جس کا شوہر 'خانہ داماد' ہو۔ اور تلاشِ معیشت میں بہت کامیاب نہ ہو، قابلِ رشک نہیں ہوتی۔ والدین تو اپنی بیٹی کو اور اس کی اولاد کو سینے سے لگا کے رکھتے ہیں۔ لیکن کئی دوسرے ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے تعلقات اتنے قریبی نہیں ہوتے۔ اور جو اس صورت حالات کی تلخی فریقین پر روشن کرتے رہتے ہیں۔ مرزا کے نانا کے متعلق معلوم نہیں۔ کہ وہ کب تک زندہ رہے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں۔ کہ مرزا کے کتنے ماموں تھے۔ اور ان کے نانا کی وفات کے بعد ان کے ماموؤں اور ممانیوں کا ان کے ساتھ کیا سلوک رہا؟ اس کے علاوہ یہ بھی ایک معمہ ہے۔ کہ اگر مرزا کی ننھیال اِس قدر خوش حال تھی۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ تو انہیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی پھوپھی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے۔ کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں۔ تو ماں انہیں آگرے سے کبھی کبھار کچھ بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں۔ ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا۔ قرض خواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ قماربازی کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا۔ غرضیکہ ان کے سر پہ مصیبتوں اور رنج و الم کے

پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن اُن کے خطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں۔ کہ ان کی ننھیال میں سے کسی نے آکر ان کی خبر بھی پوچھی ہو۔ ان کے خطوط میں سے کوئی خط کسی ماموں، یا ماموں زاد بھائی، یا کسی ایسے قریبی کے نام، جس کا تعلق ان کی ننھیال سے ہو محفوظ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان قرابتداروں کا ذکر بھی خطوط میں اتنا تھوڑا ہے۔ کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک اُردو خط میں مرزا اورنگ خاں کا ذکر ہے۔ جس نے مرزا کو اس زمانے باندا بلایا تھا جب وہ دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یا قدر بلگرامی کے نام کے خطوط میں مرزا عباس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا ذکر ہے۔ جو مرزا کے بھانجے تھے۔ لیکن یہ ذکر بھی اِس طرح ہے، کہ مرزا عباس کی طرف سے کسی چاہ اور محبت کا نشان نہیں ملتا۔

کیا اس تمام صورتِ حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا ہوگا۔ کہ مرزا کے لئے ننھیال میں فقط خوشی اور بے فکری نہ تھی۔ کلفتیں اور باطنی کشمکش بھی تھی؛ اور پتہ نہیں۔ کہ مرزا کی ننھیال کی اپنی حالت کمزور ہو گئی۔ یا مرزا سے وہ کسی وجہ سے دِلسرد ہو گئے۔ لیکن اتنا ظاہر ہے۔ کہ جو عیش و آرام انہیں ابتدا میں میسر تھا۔ اور جو پاسِ خاطر ان کا شروع میں ہوتا تھا۔ وہ اخیر تک برقرار نہ رہا۔

مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ اور اس نے انہیں دہلی کے ایک ممتاز ترین گھرانے سے گہرے طور پر وابستہ کر دیا۔ لیکن مرزا الٰہی بخش کی حیثیت اپنے بھائی نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو و فیروز پور جھرکہ کے مقابلے میں ایک 'طفیلی' کی تھی۔ اور نواب احمد بخش بھی کبھی کبھی اپنے اخراجات کی زیادتی کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ مرزا کو اس ماحول میں اپنی پستی کا احساس ہوتا ہوگا۔ جو ان کے اُس احساسِ کمتری کے لئے جو ظاہری وضعداری اور عیش و عشرت کے باوجود ان کے دماغ کی عمیق ترین گہرائیوں میں پرورش پا رہا

تھا۔ تازیانے کا کام دیتا ہوگا ؛

نفسیات کے عالم کہتے ہیں۔ کہ ایک اِنسان کی شخصیت اور ذہنی نشوونما کی بنیادیں مستحکم طور پر پہلے پانچ دس سال میں رکھی جاتی ہیں۔ اس مدت میں اگرکسی بچے کے ضمیر میں احساسِ کہتری (Inferiority complex) گہری جگہ پالے۔ تو وہ غیر شعوری طور پر اس احساس کا ازالہ کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ احساس بے حد قوی ہوتا ہے۔ اور ان کا ذہنی توازن جاتا رہتا ہے۔ ان کا تحت الشعور تو اس کی تلافی' ان بیچاروں کے خیالات کو اِس احساس کے متقابل دوسری انتہا پر لے جاکر کرتا ہے۔ اور وہ اپنے وہم کے فریب میں آکر اپنے آپ کو بادشاہ۔ نبی یا اسی طرح کی کوئی اور فوق العادت ہستی سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے انسان بالعموم عقل و ہوش سے عاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ ذہنی بے قاعدگی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس قدر خطرناک نہیں۔ اس ذہنی بے قاعدگی کی ایک مثال تو اُن لوگوں میں دیکھی جاسکتی ہے جو طبعاً بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اور اپنی اس باطنی کمزوری کا ازالہ بڑے بڑے جھوٹے دعوے باندھ کر یا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر کرتے ہیں۔ احساسِ کہتری کے یہ مثلاً مریض جن میں اپنی باطنی کمزوریوں کی تلافی عملی اصلاح اور ٹھوس محنت سے نہیں' بلکہ وہم و پندار کو طول دے کر' یا لفاظی اور ریاکاری کو بڑھا کر کی جاتی ہے۔ مضحکہ خیز بلکہ افسوس ناک ہوتے ہیں۔ لیکن اگر احساسِ کہتری مناسب حدود میں رہے۔ اور انسان اس کی کمی' اپنی اصلاح کرکے یا اپنی دوسری قوتوں کو ترقی دے کر اور انہیں معراجِ کمال پر پہنچا کر' پوری کرے۔ تو نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے انسانی تاریخ میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں بلکہ نفسیات کا ایک مشہور عالم ایڈلر کہتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے فوق العادت ترقی کی ہے۔

ان کے دل میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کا احساس کہتری ہوتا ہے۔ جو ان کے توسن ہمت کے لئے تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ اور جس کی بدولت وہ اس طرح کی کوشش اور محنت گوارا کر لیتے ہیں۔ جس سے عام لوگ دل چراتے ہیں۔ مثلاً تیمور کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ایک پاؤں سے لنگڑا تھا۔ طبعاً وہ بلند ہمت اور اولوالعزم تھا۔ لیکن ایک عضو کی کمزوری سے جو احساس کہتری وہ احساس کرتا تھا۔ اس کی تلافی اس نے اپنا زور و اقتدار بڑھا کر اور ایک مشہورِ عالم فاتح بن کر لی۔ اسی طرح نپولین کا قصہ ہے۔ جو قد میں اپنے ساتھیوں سے بہت چھوٹا تھا۔ اور جسے اس کے ہم جماعت مذاق و حقارت سے بونا کارسیکی (Little Corsican) کہا کرتے تھے۔ اس نے اپنے احساس کمتری کا جس طرح ازالہ کیا۔ اس سے ساری دنیا واقف ہے۔ غور سے دیکھا جائے۔ تو مرزا کی ذہنی نشوونما اور حالاتِ زندگی میں بھی اس نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شاندار ماحول میں پیدا ہوئے۔ اور پلے۔ لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انہیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انہوں نے شعر و سخن کا رستہ چنا۔ تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل کی جائے۔ کہ اپنے ہم چشموں میں کسی سے کمتر نہ رہیں۔ اور اپنے بزرگوں کی طرح امتیاز حاصل کریں۔ وہ خود ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:۔

"آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بآئینِ نیاگانِ خویش سلطانِ سنجر دارائے کلاہ و کمرے، و نہ بفرہنگ فرزانگانِ پیش بوعلی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بود۔ رہزنی کرد۔ و مرا بداں فریفت۔ کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است۔ سرلشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگزار و بسخن گستری روے آر۔ ناگزیر بہ پہناں کردم و سفینہ در بحرِ شعر ... رواں کردم۔"

شروع شروع میں مرزا نے شعر و سخن میں امتیاز اور ناموری حاصل کرنے کے لئے سہل الحصول لیکن مضر اور کم مایہ طریقہ اختیار کیا ۔ اور یہ خیال کیا ۔ کہ طرزِ بیان میں جدّت، بلکہ غرابت حاصل کرنے سے مَیں شعرا میں بے نظیر ہو جاؤں گا ۔ مرزا کے ابتدائی اشعار، ایک حد تک "ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ" کے مصداق ہیں ۔ لیکن وہ ازل سے اصلاح پذیر طبیعت اور مضبوط ہوش و خرد لائے تھے ۔ اُنہوں نے چند سالوں میں ہی سمجھ لیا ۔ کہ یہ راستہ بحرِ معانی کی طرف نہیں بلکہ ایک سرابِ بے آب کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ چنانچہ اُنہوں نے طبیعت کی باگ عام پسند طرزِ شاعری کی طرف موڑی ۔ جس میں امتیاز دیر سے اور محنت اور سخت جانفشانی کے بعد حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن جس میں فروغِ حقیقی امتیاز اور دائمی شہرت کا پیش خیمہ ہوا ✦

باب دوم

شاہجہاں آباد

لال قلعہ | مرزا کا دہلی میں آنا جانا اُس وقت شروع ہُوا۔ جب شاہ عالم ثانی جنہیں غلام قادر روہیلے نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا۔ تختِ شاہی پر متمکن تھے۔ روہیلوں کی بغاوت کے بعد۔ دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار بحال ہُوا۔ تو سندھیا نے انہیں قید خانے سے نکال کر پھر بادشاہی تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بعد جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم و نسق قائم ہُوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا بلکہ مورخین لکھتے ہیں کہ بعض باتوں میں ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ مسٹر آرچیبالڈ سٹین ریذیڈنٹ دہلی۔ بادشاہ کے جذبات کا ہر بات میں خیال رکھتے تھے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی۔ بادشاہ کی جو خاصہ کی جاگیریں تھیں ان کی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں سکوں پر بادشاہ ہی کا نام ہوتا تھا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت پر بادشاہ کی مہرِ توثیق کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہُوئی اور ان کی بجائے شاہ اکبر ثانی تخت نشین ہُوئے۔ ان کے زمانے میں

مسٹر آرچیبالڈ سیٹن کی پالیسی قائم نہ رکھی گئی۔ لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ اور شہر میں شاہی جلوس اور سواری کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا۔ جو اس سے پہلے تھا۔ علاوہ ازیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہتے۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو ان کی ملاقات بادشاہ سے اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ بادشاہ نے ان کو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا! +

علمی چہل پہل

قلعہ سے قطع نظر اس وقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھی۔ شہر کے گرد گرد فصیل تھی۔ اور سارا شہر اس کے اندر آباد تھا۔ شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دئے جاتے۔ جہاں شہر دہلی کا موجودہ سٹیشن ہے۔ وہاں اس زمانے میں ایک آباد محلہ تھا جہاں امراء و ارکین سلطنت رہتے تھے۔ چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار رہا۔ شہر اور شہر کا قرب و جوار لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہ تھا۔ جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں علم و فن کا زوال قدرتی ہے۔ چنانچہ دہلی میں جو کوئی شعر و سخن یا کسی اور فن میں نام پیدا کرتا۔ اُسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لے جاتی۔ لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نظم و نسق قائم ہوا۔ تو نہ صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حالی "دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے"۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعراء کے حالات لکھے

ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعرا میں شاہ نصیرؔ۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ علماء میں شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ اسمٰعیلؒ۔ شاہ عبدالقادرؒ حضرت سید احمد بریلویؒ۔ مولینا فضل حق خیرآبادی۔ اطبا میں حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ موجود تھے۔ (اور یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے زیر اثر سرسید۔ حالیؔ۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ اور داغؔ کی تربیت ہوئی۔ جنہوں نے خود پرانے نظام کے پروردہ ہونے کے باوجود بیس سال کے عرصے میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم، نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دے دئے)۔ توہمیں غالبؔ کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جس کی ناواقفیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معمہ بن کر رہ گئی ہے +

حالیؔ اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں بت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے ؎

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم — اے کہ تھی علم و ہُنر کی تیرے اِک عالم میں دُھوم
تھے ہُنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم — تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و رُوم
زیب دنیا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم و دیں — جیسے اگلے تجھ میں تھے۔ عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں علمِ محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں — تھی محدث خیز اے پائے تخت تیری سرزمیں
تھا الفقہ بھی مُسلّم تیری خاکِ پاک کا
بیہقیٔ وقت تھا اِک اِک فقیہ اِس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم   آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم   بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم   جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم   کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے انکے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا   بجھتے بجھتے تھا چراغ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں پھر تری اُگلے وہ لعلِ بے بہا   جن سے روشن ہوگیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آگیا

جاہ و حشمت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویرِ دورِ اکبری
علم دین و شعر و حکمت۔ طب و تاریخ و نجوم
ڈالدی پھر تو نے اپنی چار سو ہر فن میں دھوم!

جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ریفارمیشن (Reformation یعنی اصلاحِ مذہب) اور رینائسنس (Renaissance یعنی نشاۃِ ثانی) کی دو تحریکوں سے واقف ہوں گے۔ جنہوں نے سولھویں صدی میں

وہاں نئی رُوح پھُونک دی تھی۔ اور علمی اور مذہبی نقطہ نظر سے ایک نئے دَور کا آغاز کیا تھا۔ مرزا جس وقت دہلی آئے۔ یہاں بھی وہی حالات رُونما تھے۔ جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کایا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولھویں صدی میں ہُوئی۔ اور اِس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہُوا۔ دہلی میں چھاپے کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعتِ علم کو وہی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہُوا۔ "رینائیسنس" کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جس کی ابتدا میں بے حد مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے وکلف اور اس کے ساتھیوں کو سخت ایذائیں پہنچائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرنے پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ننگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کی جرأت اور قابلیت سے ۱۷۳۷ء ہی میں ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہوگیا۔ جس کے لئے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی رینائیسنس کی ایک اہم خصُوصیت عام مُلکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی جگہ اُردو لے رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہچانتے تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے نئی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اُردو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں قرآن مجید کا اُردو ترجمہ تھا۔ جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی سے شائع کیا۔

علاوہ ازیں جس طرح مغربی رینائیسنس کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلّموں اور مدرّسوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذاتِ والاصفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی۔ صحیح قوتِ فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی رینائیسنس کی ایک قابلِ احترام ہستی

ایرازمس (Erasmus) سے بہت مشابہ ہیں۔ اور جن کے درس کے لئے کشمیر۔ افغانستان اور بلخ و بخارا سے طلبہ کھنچے آتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکار انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا۔ اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علیگڈھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتویٰ دیا۔

جنرل سلیمن جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا۔ اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں:-

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی۔ جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے۔ جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ عربی اور فارسی زبانوں میں سیکھتے ہیں۔ اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے۔ دستارِ فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ جالینوس اور بو علی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب علم[1]"

---

[1] اسباب غدر مصنفہ سرسید

جنرل سلیمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے :-

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے"۔

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم سے آکسفورڈ یونیورسٹی کے موجودہ کلاسیکل کورس سے کسی طرح پست نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جاسکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ جن معلموں کے حلقۂ درس سے سرسید۔ حالی۔ آزاد۔ داغ۔ شیفتہ اور غالب دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں۔ وہ اپنے درس و تدریس پر جتنا بھی فخر کریں۔ کم ہے۔

وہابی تحریکِ اصلاح اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کی تحریک اصلاح تھی جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک ریفارمیشن کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو پوپ کی غلامی سے نجات دلائی اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید اور ذہنی غلامی کی مخالفت میں تھی۔ اور حضرت سید احمد بریلوی نے ان فضول اور مضر رسموں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہوگئی تھیں۔ کوشش کر کے نہ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا۔ ہمیں اِس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ماحول سمجھنے کے لئے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی میں تمام

اہل الرائے یا اس تحریک کے طرف دار تھے۔ یا مخالف۔ شاہ نصیرؔ دہلوی نے جن کی مضحکہ خیز خوش اعتقادی کی کئی مثالیں آزاد نے آبِ حیات میں دی ہیں۔ اس تحریک کے راہنماؤں کے خلاف نظمیں لکھیں برخلاف اس کے مشہور شاعر مومنؔ مولینا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ اور کلیاتِ مومنؔ کے کئی اشعار مولینا کی تعریف میں ہیں۔ غیر مقلدین کے سب سے نامور حامی شاہ اسمٰعیل شہید اور سرسید احمد خاں تھے۔ مقلدین کے پُرجوش ترجمان مولوی فضل حق تھے جو قدیم علم پرور خیر آبادی خاندان کے رکن اور غالبؔ کے نہایت عزیز دوست تھے۔ مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی دلچسپی لی اور ایک زمانے میں مولوی فضل حق کے ایما پر عقائدِ وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی۔ لیکن جیسا کہ حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ میں بیان کیا ہے ان کا اپنا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل سے بہت ملتا تھا۔ اور شروع میں اُنہوں نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس مثنوی کے مطالب کافی اہم ہیں۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ہم آہنگی ہے۔ جو شاہ اسمٰعیل اور مرزا کے عام اسلوبِ خیال میں تھی۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد کیا ہی ہوں۔ لیکن آخر اُن کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے۔ لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے تھے۔ وہ یا تو رسُوم و عقائد کا وہ طومار تھا۔ جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا اُئمۂ اربعہ کی کورانہ تقلید۔ شاہ اسمٰعیل ان میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصانیف پڑھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے عامہ اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالبؔ پر نہ ہوا ہو[1]۔ اور

---

[1] مولینا شہیدؒ نے اس زمانے کی ایک اور عظیم المرتبہ شخصیت پر اثر ڈالا۔ حالیؔ سرسید کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں۔ "مولینا اسمٰعیل شہید نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی۔ اور انہیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا"۔

اس کی طرح آزاد خیالی اور راسخ نہ ہوگئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں لیکن جس طرح اُنہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فنِ لغت اور فنِ شعر گوئی میں اُستادوں پہ آزادانہ نکتہ چینی کی۔ اور جس طرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گنا کر کہتے تھے۔ کہ آخر وہ انسان تھے۔ اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے وہ سب سچ نہیں۔ اور ہر پُرانی لکیر صراطِ مستقیم نہیں ہوتی۔

سخن سنج احباب

ان دونوں تحریکوں کا جو اثر مرزا پر ہُوا ہوگا۔ وہ تو غیر محسوس اور کسی حد تک قیاسی ہے۔ لیکن دہلی آنے سے جو اثر ان کی شاعری پر ہُوا۔ وہ بہت واضح اور نمایاں ہے۔ آگرے میں شعرا اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب وغریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہوتے۔ تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے آگرے میں ایک رُباعی لکھی تھی[۱]

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دِل ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کے جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولٰینا فضل حق اور دوسرے مُسلّمہ اُستادوں نے انہیں ان اشعار کے حُسن وقبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور جس طرح انہوں نے مندرجہ بالا رباعی کا دُوسرا مصرع تبدیل کیا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنورانِ کامل" کہا۔ یا اس زمانہ کے ایک فارسی شعر میں لکھا

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت ہرزہ مشتاب پئے جادہ شناسان بگذار

---

[۱] تذکرۃ الشعرا مؤلفہ نواب اعظم الدولہ سُرور

اسی طرح اپنی شاعری کا رُخ بدلا۔ منتخب دیوان ریختہ کے متعلق آزاد کا بیان ہے۔ کہ یہ انتخاب مولٰینا فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا۔ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ انتخاب خود مرزا غالب نے کیا۔ غالباً یہ خیال درست ہے۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرزِ شاعری میں اتنا نمایاں فرق ہے۔ کہ یہ بیان بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہُوئی۔ اُس میں کسی خارجی رہنمائی کو بھی دخل تھا۔ اور بقول مرزا اُنہوں نے اپنا طرزِ خاص اس لئے ترک کیا کہ اسے "یاروں نے چلنے نہ دیا۔" (جلوۂ خضر)

مرزا کے اس زمانے کے احباب کے متعلق ہمیں پوری واقفیت نہیں۔ لیکن ان کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروفؔ کی صاحبزادی سے ہُوئی تھی۔ جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور جن کے اکثر شعراء سے مربیانہ تعلقات تھے۔ اس لئے یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب بڑے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہُوئے ہوں گے۔ معروفؔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ اور زبان میں صفائی اور روزمرّہ کے بڑے مدّاح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری بہت پسند نہ ہوگی۔ لیکن یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیرِ اثر زبان کی صفائی کی طرف مرزا زیادہ متوجہ ہُوئے ہوں گے۔ معروفؔ خود بھی شاعر تھے۔ نئی نئی زمینیں نکالتے۔ اور ان میں شعر کہتے اور کہلواتے چنانچہ مرزا کی وہ غزل جس کا حسب ذیل شعر مشہور ہے ؎

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

انہی کی نکالی ہُوئی زمین میں ہے۔ اور اس میں غالب کے علاوہ دہلی کے اور مشہور شعرا نے بھی طبع آزمائی کی +

ہرمزد ہرمزد کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزا دہلی آئے تو وہ ہمرکاب تھا۔ اس کی صحبت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہوگیا۔ جو عموماً اہلِ زبان کا حصّہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح

عام ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع ہی سے "ہندی زبانانِ فارسی نویس" کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہرمزد کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پر ایک آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ ہرمزد کے عقائد کے متعلق ہمیں پوری خبر نہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو۔ اور اپنے خاندان کے طریقے کو چھوڑ کر مرزا کا شیعہ ہونا اسی کے زیرِ اثر ہو۔

فارسی شعرا

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب بجائے میر اور سودا کے انہیں بیدل اور عرفی کا جانشین سمجھا جائے۔ بےشک انہوں نے اردو شعر لکھے۔ لیکن کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدل اور بعد میں عرفی اور نظیری کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ میر کے مداح تھے لیکن میر کی غزلوں پر بھی انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں۔ وہ میر نہیں بلکہ بیدل کے رنگ میں ہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اردو اور فارسی کلام میں وہ حدِ فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں فارسی سے عوام کی ناواقفیت کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ وہ گلِ رعنا کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اردو اشعار لکھنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی شاعری میں روا رکھا تھا۔ ان کی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلے میں باقی اردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان شعرا کی نظر دلی سے آگے نہ

جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے جن کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بیدل۔ ظہوری۔ عرفی اور نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز بیدل کے رنگ سے کیا۔ لیکن جب اُنہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور "شیخ علی حزیں نے مُسکرا کر ان کی بیراہ روی انہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا۔ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا" تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں۔ اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے۔ جس میں بیدل کی شعریت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں دکھائیں گے۔ مرزا کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اردو کے اور شعرا میں نہیں۔ لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعرا کی وہی معاملہ بندی ہے جو عرفی اور دوسرے شعرا میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دے کر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا۔ مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن فارسی اشعار پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقع انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعرا کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے +

ذہنی ارتقا

اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا۔ وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا۔ جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہو گئی۔ عنفوانِ شباب میں انسان اپنے تئیں دنیا کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے۔ کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا

پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رجحان جیسا کہ ان کے خاص طرزِ شاعری (یا ان کے بھائی کی علالت سے بھی) خیال کیا جاسکتا ہے۔ عوام سے بہت زیادہ تھا۔ اور نفسیات کے اصول کے مطابق ایسی انتہائی انفرادیت کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے۔ کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے۔ کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سڑی پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ مرزا کے طبعی رجحانات پر ان کی عقلِ سلیم غالب آئی۔ اور خوش قسمتی سے انہیں ایسے دوست میسر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیاں ہموار کر دیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حسِ تناسب سکھانے کے لئے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جسے کنجِ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ راس آتی ہے۔ اور جب مرزا کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زود حسی کم ہوئی۔ تو اُن کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آگئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی یبوست کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی۔

باب سوم

لکھنؤ۔ کلکتہ

دیوانِ غالب کا چھپا ہوا نسخہ ۱۸۲۱ء میں یعنی اُس وقت مرتب ہوا۔ جب غالب آلامِ دنیا سے بالکل آزاد تھے۔ غالب اس وقت نواب احمد بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب احمد بخش ریاست الور کے وکیل تھے۔ اور انہوں نے مرہٹوں کے خلاف لارڈ لیک کو ریاست کی طرف سے مدد دی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ موصوف نے ان خدمات کے عوض میں انہیں فیروزپور جھرکہ کا علاقہ جو اب ضلع گڑگاؤں کا حصہ ہے۔ تفویض کیا تھا۔ نواب نے مہاراجگان الور اور سرکار انگریزی کے درمیان تعلقات قائم کر کے ریاست کی بھی بڑی خدمت کی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ الور نے اس کے صلے میں انہیں پرگنہ لوہارو بخش دیا تھا۔ ان تعلقات اور دوسرے کاموں کے سلسلہ میں نواب کو بسا اوقات انگریزی حکام سے ملنا اور ان کا ساتھ دینا پڑتا تھا چنانچہ جب انگریزی فوج نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں مہاراجہ بھرتپور کے خلاف چڑھائی کی۔ تو نواب بھی انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ اور ان کا برادرزادہ مرزا علی بخش اور غالب بھی ان کے ہمرکاب[1]

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۷۔ لیکن مرزا غالبؔ بہت دیر تک نواب کے ساتھ نہیں رہے۔ بھرتپور کی فتح کے بعد
باقی صہ ۴۶ پر

تھے۔ غالب کی نثر کی سب سے پہلی تصنیف اسی زمانے کی یادگار ہے۔

فارسی رسالہ مرزا علی بخش نے جو غالب کی بیوی کے بھائی بھی تھے۔ غالب سے استدعا کی۔ کہ فارسی خط و کتابت کے قواعد اور القاب خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ مرزا نے ایک مختصر رسالے میں جو ان کی کلیاتِ نثر فارسی میں موجود ہے۔ فارسی مکتوب نویسی کے قواعد جمع کئے ہیں۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہُوا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اُردو زبان میں اختیار کیا (اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں) اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ وہ اس رسالے میں لکھتے ہیں:۔

"مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخورِ حال اوست آواز دہیم و زمزمہ سنجِ مدعا گردیم۔ القاب و آداب گوئی و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشوِ زائد است۔ و پختگان حشو را دفع نہند نامہ نگار را باید۔ کہ نگارش را از گذارش دور تر نبردہ بنشستن را رنگِ گفتن دہد۔"

فارسی زبان میں اُنہوں نے ایک حد تک رواجِ عام کی پیروی کی ہے۔ لیکن اُردو رقعات میں مندرجہ بالا اصُولوں پر پُوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول خود "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ دُور سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کیجئے"۔

اس رسالے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زبان دانی سے جو نفرت مرزا کو تمام عمر رہی۔ اور جس نے بعض اوقات تلخ بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس

بقیہ صہ ۴۵

٦ فروری ۱۸۲٦ء کو انگریزی فوج نے الور کے نئے راجہ اور نواب بخش کا قضیہ چکانے کے لئے الور کا کوچ کیا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا۔ جب مرزا (نواب سے مدد لینے کے لئے فیروز پور جھرکہ گئے ہوئے تھے (کلیات نثر غالب صفحہ ۱٦)

وقت بھی موجود تھی ۔ چنانچہ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں ۔ "اندازۂ خوبیٔ زبان نگاہدارد وایں پارسی آمیختہ بتازی را درکشاکش تصرفات ہندی زبانانِ پارسی نویس ضائع نگزارد"۔

یہ رسالہ جو مرزا نے فقط تین روز میں ختم کر دیا تھا۔ بیشتر خطوط کے القاب و آداب اور دعائیہ فقروں کا مجموعہ ہے ۔ لیکن ان کے شروع میں مرزا نے بعض بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں :۔

"نامہ نگار را باید ۔ کہ نگارش از گزارش دُور ترنبرد و نبشتن را رنگ گفتن دہد ۔ و مطلب را بداں روش گزارد ۔ کہ در یافتنِ آن دشوار نبود ۔ و اگر مطلبے چند داشتہ باشد ۔ در تقدیم و تاخیر ژرف نگہی بکار برد و ازاں بپرہیزد کہ در سخن گرہ درگرہ گردد و اجزائے مُدعا بہمدگر فرو خورد ۔ زنہار استعارہائے لغات مشکلہ نامانوس در عبارت درج نکند و در ہر نورد رعایت رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد ۔ تا تواند سخن را درازی ندہد ۔ و از تکرارِ الفاظ محترز نہ باشد ۔ و بیشتر بمذاقِ اہلِ روزگار حرف زند و از احاطۂ قواعد و قوانینے کہ قرار دادۂ ایں مردم است بدر نرود ۔ ...... و پیوستہ دراں کوشد کہ سادگی و نغزی شعارِ او گردد ۔ در اقسام مکاتیب خاصہ در خطوط و عرائضے کہ بحکام نویسد و مشتمل بر معاملات باشد از اغلاق و اغراق احتراز واجب داند و سخن باستعارہ و اشارہ نگزارد و نرم گوید و سنجیدہ گوید و آسان گوید"

آگے چل کر اس امر پر بڑا زور دیا ہے ۔ کہ دوستانہ خطوط میں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے ۔ لکھتے ہیں :۔

"پوشیدہ مباد ۔ کہ درمیانِ احباب مراسلات متعارف است ۔ مجملاً القاب بانگاشتہ می آید ۔ ہر کہ در طور حفظ ہر رتبہ باشد ۔ رعایت آں ملحوظ باید داشت ۔ و آں اینست کہ در میزانِ متصدیاں تشفیق بر مشفق و مشفق بر مہربان نے چربد ۔ و کرمفرمائے مخلصان

بر کرم فرمائے دوستاں تفوّق دارد"۔

اس سلسلے میں ہائے کوچک اور ہائے کلاں (مہربان اور محربان) کا قصہ لکھ کر اپنے زمانے کے امرا اور والیانِ ریاست کے مذاقِ ادب کو بے نقاب کیا ہے :۔

"گویند در سرکار راجہ بھرت پور در زمانِ قدیم منشی بود۔ از عالمِ ہوش و تمیز بعد مرحلہ دور مراسلاتِ راجہ صاحب باطراف می نگاشت و دعویہائے بلند در فنِ انشا داشت۔ قضارا راجہ با او دل بد کرد و خدمتِ انشا بدیگرے تفویض نمود۔ منشی معزول غم تنہا میخورد و باخود را بہا(؟) میزد تا مگر انگشتے بر حرفش نہد۔ و بازارِ او را شکستے دہد۔ ناگاہ روزے اتفاق چناں (ول) افتاد کہ منشیِ حال خطے از طرف راجہ بیکے از دوستانِ راجہ کہ راجہ را با او نیازے بود بنوشت چوں عنوان درست کرد و سرنامہ بزنگاشت منشیِ معزول خیرہ خیرہ در عنوانِ مکتوب نگریست و سرے جنبانید و تبسمے کرد۔ راجہ ازیں ادا بدگمان شد۔ اما توضیحے بمیاں نیاورد و بعد برہم زدنِ ہنگامۂ بزم منشیِ معزول را در خلوت خواند۔ و باعثِ آں ادا پرسید۔ منشی بعد ادائے مراسمِ مدح و ثنا گفت۔ کہ بندگانِ پروردۂ نعمت و ہوا خواہِ دولتیم۔ تازہ آیندگان را ایں قدر پاسِ نمک و حبِ رونقِ سرکار چہ خواہد بود۔ خاصۂ ایں مردم اہلِ قلم کہ از شاہجہاں آباد اند۔ حقِ نمک نگاہ ندارند۔ و خیرِ آقائے خود نجویند۔ ایں منشیِ تازہ بہ فلاں سرکار کہ حضور ہموار بدلجوئی و بتعظیمِ او بکوشند۔ و دوستیِ او را موجبِ سودِ کارہا و صلاحِ حالہا میدانند۔ مہربان بہائے کوچک نوشتہ حالانکہ من ہموارہ تعظیماً او را محربان بہائے کلاں می نگاشتم۔ اکنوں کہ تفاوت در تعظیم کہ عبارت از تبدیلِ ہائے کلاں بہائے کوچک است۔ پدید خواہد آمد۔ البتہ او در دلِ خود خواہد آزرد و رنجش او برائے سرکار نیکو خواہد بود۔ راجہ برآشفت۔ و منشیِ حال را طلب داشت و عتاب کرد۔ و گفت تو کہ باشی

کہ کسے راکہ ہموارہ از سکارِ ما مہربان بہائے کلاں نوشتہ باشند۔ بہائے کوچک بزرگاری۔ ہمانا میخواہی۔ کہ دوستانِ ما را عدو بگردانی۔ قصہ مختصر اورا برآند و منشی قدیم را بنواخت۔ فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

پنشن کا قضیہ پھر تپور کا معاصرہ اخیر ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اگرچہ اس زمانے کی تصنیفات سے غالب کی جائداد کے جھگڑوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن غالباً ان کی ابتدا اسی زمانے میں ہوگئی تھی۔ نواب احمد بخش کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشاں جو غالب کے شاگرد اور عزیز دوست تھے اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر داغ کے والد نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے سب بھائی خوش نہ تھے۔ اس لئے اس میں بعد ترمیم ہوئی۔ اور فروری ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے ایما پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں باقی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانے میں ہوا ہوگا۔ جب نواب احمد بخش نے جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ کیا۔ مرزا کو جاگیر اپنے چچا نصر اللہ خاں بہادر کے وارث ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اور جب

سلہ ملاحظہ ہو کمالِ داغ از مولٰنا حامد حسن قادری ص ۴۶
پتہ نہیں مولٰنا مہر کس بنا پر کہتے ہیں۔ "شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد کوئی نہ تھی" (ص ۵۵)

لارڈ لیک کی عملداری ہوئی۔ تو چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہُوئے۔ انہیں اس صلے میں علاوہ ذاتی زرِ معاوضہ کے معقول جائداد حین حیات ملی تھی۔ لیکن ایک سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر ان کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی۔ اور نواب نے اس کے عوض ان کے ورثا کی نگہداشت کا ذمہ لیا۔ مرزا نصر اللہ خاں کی اولاد کوئی نہ تھی۔ اور اُن کے وارث مرزا غالب، مرزا یوسف اور مرزا نصر اللہ کی ماں اور بہنیں تھیں۔ مرزا غالب کا دعوے تھا کہ ان کے اپنے شرکائے حقیقی کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصہ فقط ساڑھے سات سو روپیہ تھا۔ شروع شروع میں تو نواب سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ اور نواب ان کی مدد اور خبر گیری کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۲۶ء کے قریب اختلافات رونما ہُوئے۔ مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے۔ اسی سال فوت ہُوئے۔ اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کے تعلقات کمزور ہو گئے ہوں۔ مرزا کی عمر اس وقت تیس اُنتیس سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا سرچشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دئے تھے۔ وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا صدمہ اس موقعہ پر یہ ہُوا۔ کہ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا۔

فیروز پور جھرکہ کا سفر غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعۂ معاش کی تنگی۔ بھائی کی بیماری۔ قرضخواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا۔ کہ نواب کی خدمت میں جا کر سارا معاملہ[1] رکھیں۔ ...

[1] مرزا نے اس زمانے میں مولینا فضل حق کے نام صنعتِ تعطیل میں جو خط لکھا تھا۔ اُس سے اس سفر کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ (کلیات نثر غالب صفحہ ۶۳-۶۴)

تقاضوں اور اپنی مصیبتوں کا حال کہو۔ ممکن ہے وہ مدد کرے۔ چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ نواب ان دنوں الور تھا اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا۔ اس لئے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رکنا پڑا یہاں سے اُنہوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے چھجمل کھتری کے نام لکھے ہیں۔ ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"چہ نالہ ہا کہ از بیمِ رسوائی از دل تا بہ زباں نرسیدہ خون میگردد و چہ خونہا کہ از دودِ بیکسی کسوتِ اشک پوشیدہ از چشم بیروں میرود۔ چارۂ رنج بیدلی معدوم و پایانِ کار نامعلوم است۔ پیداست کہ از قفس بدام اُفتادہ را چہ حال خواہد بود"

اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بے قراریاں ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کرکے لکھا ہے:۔

"ہر چند در وطن نیم امّا قربِ وطن نیز قیامت است۔ ہنوز با اہلِ کاشانہ راہِ نامہ و پیام است۔ ہر چہ دیدہ مے شد آشوبِ چشم بود و ہر چہ شنیدہ میشود زحمتِ گوش است۔ نیم جانے کہ ازاں ورطہ بردن آوردہ ام ودیعتِ خاکِ فیروز پور است۔ کہ مرا ایں اقامتِ اضطراری اتفاق اُفتاد"۔

آخر جب خُدا خدا کرکے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہُوا۔ اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہُوا کہ دوستوں کے مشورے سے اُمیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے۔ ان کی بنیاد ریت پر ہے۔ اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے۔ چنانچہ بقولِ غالب "نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند و بکرشمۂ ستمے کہ بالتفات می مانست ازراہ بردند"۔ اور مرزا کو دہلی ناکام واپس آنا پڑا +

مرزا کو جب نواب صاحب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی۔ تو اُنہوں نے نواب کے خلاف کلکتہ میں اپیل کرنے کا ارادہ کیا۔ بقولِ حالی ریذیڈنٹ دہلی نے انہیں کامیابی کی

اُمید بھی دلائی۔ چنانچہ وہ تیس برس کے ہوں گے۔ جب وہ اس دُور دراز سفر کے لئے گھر سے روانہ ہُوئے ۔

لکھنؤ

مرزا دہلی سے کب روانہ ہُوئے۔ اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں۔ لیکن دہلی سے وہ لکھنؤ گئے۔ اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۷ جون ۱۸۲۷ء یا ۲۶ ذیقعد ۱۲۴۲ھ ہے۔ لکھنؤ میں غالب نے کافی عرصے تک قیام کیا۔ اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جو انہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی تھی۔ صحیح سمجھا جائے۔ تو یہ[1] ماننا پڑے گا۔ کہ کم از کم "دوم محرم الحرام سے "۲۶ ذیقعد" تک یعنی قریباً ۱۱ مہینے وہ لکھنؤ مقیم رہے ۔

مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے۔ لیکن جب ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا (اور حضُور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا) تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۱۹ء میں بڑی دُھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہُوئی۔ جس کی ناسخ نے تاریخ کہی۔ ع "بگو ناسخ کہ ظل اللہ گہ دید"۔ انہیں شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرُور تھی۔ چنانچہ مشہُور ہے کہ اُنہوں نے ناسخ کو ملک الشعرا کا خطاب دیکر اپنے دربار کے متعلق کرنا چاہا۔ لیکن ناسخ نے یہ کہہ کر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریزی کا بعد اقتدار۔ مَیں اس کا درباری شاعر ہوکر کیا کروں گا!

جب مرزا لکھنؤ پہنچے۔ تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لئے نائب السلطنت کی

۱؎ اس صورت میں مرزا دوم محرم ۱۲۴۲ھ یعنی اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے دہلی سے روانہ ہو چکے ہونگے۔

مدد کی ضرورت تھی۔ نائب السلطنت اس وقت معتمد الدولہ آغا میر تھے جنہوں نے ملازمت کا آغاز بطور ایک خدمت گار کے کیا تھا۔ لیکن نواب بیگم اور ریذیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتہ چلتا ہے۔ ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں بھی شعر گوئی سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی۔ (اور شاید اپنے مدِ مقابل حکیم مہدی کی ضد سے جو آتش کے قدردان تھے، وہ ناسخ کے مربی گنے جاتے تھے) مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ ملاقات کے لئے نائب نے جو شرطیں پیش کیں انہیں مرزا باعث شرم اور خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں

"آنچہ در باب ملازمت قرار یافت۔ خلاف آئینِ خویشتن داری و ننگِ شیوۂ خاکساری بود۔"

مرزا بقول اپنے اس وقت "نو آموز شیوۂ گدائی" تھے۔ اور شاہانِ اودھ کی تعریف میں سب سے پہلے جو قصیدہ[1] انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں بھی بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے ؎

---

[1] مرزا نے یہ قصیدہ دہلی سے پہلے شاہ اودھ کے وکیل راجہ صاحب رام اور پھر منشی محمد حسن کے پاس اس لئے بھیجا کہ وہ اسے وزیر اودھ تک پہنچائیں۔ اور وزیر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے۔ مرزا نے اسکے ساتھ منشی محمد حسن کو ایک خط لکھا۔ جسمیں وہ لکھتے ہیں "بود کہ رابہ جنبۂ باذخوانی صلۂ مدح گستری کیمیا یہ سامان فراز آید۔ کہ خود را گرد آوردہ بہ کلکتہ توانم برد و گرنہ سر توانم کرد"۔ اس خط میں تاریخ کتابت یا بادشاہ یا وزیر کا نام درج نہیں۔ اسلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ کہ یہ قصیدہ لکھنؤ کب بھیجا گیا۔ اور کیا شروع سے ہی اس میں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا نام تھا۔ یا پہلے غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ کا

(باقی اگلے صفحہ پر)

نافہ پروردۂ خلوت گہِ آزادگیم　　کافرم گر بسراپردۂ سلطاں رفتم

من ہم از خیلِ کریمانم و خجلت نبود

گر بدر یوزہ بدرگاہِ کریماں رفتم

اس قصیدے میں جس کی زبان بہت صاف ہے۔ مرزا نے اپنی مصیبتوں اور دہلی سے لکھنؤ جانے کی دردناک داستاں لکھی ہے ؎

چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں　　خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم

اضطرار آئینہ پروازِ جلائے وطن است　　نہ بدل رفتم ازاں بلکہ بدل از جاں رفتم

ہم جگر تفتہ ز کیں خواہی اغیار شدم　　ہم دِل آزردہ ز بے مہری خویشاں رفتم

ایمن از فتنۂ عیاری عیارانم　　با چنیں تجربہ کز یاری یاراں رفتم

منت از خویش بہ اندازۂ طاقت دارم

کہ بدیں بارِ الم ہائے فراواں رفتم

غالب لکھنؤ سے ۲۷ رجون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۱۹ ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ نصیر الدین حیدر جو اُن کے بیٹے کہلاتے تھے۔ تخت نشین ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے یہ قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۵۳)

نام تھا۔ اور چونکہ ۱۸۲۷ء میں پیش نہ ہو سکا۔ اس لئے بعد میں ناموں کی تبدیلی سے نصیر الدین کے دربار میں پیش کیا گیا۔ قصیدہ کے مضامین سے موخر الذکر نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس قصیدہ کے بعض اشعار گلِ رعنا کے دیباچہ میں منتخب ہوئے ہیں۔ اسلئے غالباً یہ نظریہ صحیح ہے +

اور وہاں سے پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم ہوا۔ لیکن بقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار متوسط یعنی منشی محمد محسن نے۔ غالب بیچارے کو پانچ روپے بھی نہ ملے

حالی نے مرزا کے قیام لکھنؤ کی نسبت ایک آدھ لطیفہ لکھا ہے اس سے زیادہ اس قیام کی نسبت کوئی ذریعۂ واقفیت نہیں۔ ناسخ سے مرزا کے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن چونکہ اس نے بادشاہ کا خطاب حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ان دنوں بادشاہ کے زیرِ عتاب تھا اور اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ ورنہ قرینِ قیاس ہے کہ (اگر غالب سے اسکے تعلقات بعد کے نہیں تو) وہ آغامیر کے پاس رسائی میں مفید ہوتا۔

مرزا نے قیام کلکتہ کے دوران میں فارسی اشعار اردو اشعار سے کہیں زیادہ لکھے ہیں۔ اس سے اور مرزا کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ اس زمانے میں اُردو شعر نسبتاً کم لکھتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں فارسی کا قدردان کوئی نہ تھا۔ اس لئے قرینِ قیاس ہے کہ اس جگہ انہوں نے اُردو اشعار زیادہ لکھے ہونگے۔ یہ غزل تو یقیناً قیامِ لکھنؤ کی یادگار ہے ؎

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

پہلے اس غزل کے آخر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار تھے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنا — ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ کی طرف سے مرزا کو مایوسی ہوئی۔ تو انہوں نے قطعہ مندرجہ بالا کو بدل کر ذیل کا قطعہ درج دیوان کیا ؎

لکھنؤ آنے باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مرزا ۲۷ر جون ۱۸۲۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اور تین روز میں کان پور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے۔ جہاں مولوی محمد علی صدر امین نے، باوجودیکہ مرزا سے پہلے تعارف نہ تھا۔ ان سے بڑا نیک سلوک کیا۔ قیام باندہ میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط بھی دئے۔ مرزا کا قیام باندہ اس لئے بھی دلچسپ ہے۔ کہ اُنہوں نے یہاں سے چند غزلیں اپنے کسی دوست کو بھیجیں۔ جو قلمی نسخہ دیوانِ غالب (مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) کے حاشیے پر درج ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ایک اور غزل میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قلمی نسخے کے حاشیے پر اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جن کے متعلق دیوان میں تو کوئی تصریح نہیں کہ وہ کب لکھی گئیں لیکن جو سفرِ کلکتہ کا کلام معلوم ہوتی ہیں۔ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

ذیل کی دردناک قطعہ بند غزل بھی اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

باندہ سے مرزا موڈا گئے۔ اور موڈا سے چلہ تارا۔ آخری حصۂ سفر کے لئے اُنہوں نے گھوڑا گاڑی لی۔ لیکن جب انہیں اس سفر میں معلوم ہُوا۔ کہ سواری آسانی سے نہیں ملتی۔ اور جو جانور ملتے ہیں۔ وہ غالبِ نیم جان سے بھی سست رفتار ہیں۔ تو اُنہوں نے چلہ تارا سے کشتی لی۔ اور دریا کے راستے سے الہ آباد پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں جاتے وقت یا واپسی پر کوئی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا۔ جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے ؎

نفس بلرزہ زبادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ زہنگامۂ الہ آباد

بنارس

یہاں ان کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا۔ لیکن غالباً اس کا موقع نہ ملا۔ اور وہ بنارس روانہ ہوئے۔ جس وقت بنارس پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ چنانچہ رائے چھجمل کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"چہ نویسم کہ از متاعِ نوشتنیہا پر تہیدست افتادہ ام۔ اگر از داخلیات گفتہ آید۔ ہماں رنجِ معدہ و امعاست۔ و ہماں برودتِ جگر و حرارتِ قلب و ضعفِ قویٰ و اگر از خارجیات سخن راندہ شود۔ بیش ازیں نیست قطعہ

مغلوبِ سطوتِ غمِ دلِ غالبِ حزیں ۔۔۔ کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است ۔۔۔ مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

بنارس پہنچتے وقت وہ علیل تھے۔ لیکن بنارس جس کے پُر فضا مناظر نے حزیں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ غالب کے لئے بھی جنت نگاہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے دنوں میں طبیعت بحال ہو گئی۔ اور اب سوائے اس کے کوئی افسوس نہ تھا۔ کہ ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھلا رکھا ہے۔ چنانچہ چراغِ دیر میں لکھتے ہیں ؎

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست

اور مولوی فضل حق۔ نواب امین الدین رئیس لوہارو اور نواب حسام الدین حیدر خاں کو یاد کر کے افسوس کیا ہے ؎

گرفتم کز جہاں آباد رفتم	مرا یاراں را چرا از یاد رفتم
مگو داغِ فراقِ بوستاں سوخت	غمِ بے مہریِ ایں دوستاں سوخت

اس کے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور شاہ جہاں آباد پہ اسے ترجیح دی ہے ؎

جہاں آباد گر نبود الم نیست	جہاں آباد بادا جائے کم نیست
نباشد قحط بہرِ آشیانے	سرِ شاخِ گلے ' در گلستانے
بخاطر دارم اینک گل زمینے	بہار آئیں ' سوادِ دل نشینے
کہ می آید بدعوے گاہ لافش	جہاں آباد از بہرِ طوافش

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دُور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور!

معلوم ہوتا ہے۔ بنارس مرزا کو بہت پسند آیا۔ (چنانچہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا) لیکن جب پسماندگان کا خیال

آتا ہے تو طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے ؎

فرو ماندن بکاشی نارسائی است — خدا را ایں چہ کافرماجرائی است

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر — دریں جنّت ازاں ویرانہ یاد آر

دریغا در، وطن وا ماندۂ چند — بخونِ دیدہ زورق راندۂ چند

ہوس را پائے در دامن شکستہ — بامیدِ تو چشم از خویش بستہ

بشہر از بیکسی صحرا نشیناں — بروئے آتش دل جاگزیناں

از آنانت تغافل خوشنما نیست

بداغ شاں ہوائے گُل روانیست

کلکتہ بنارس سے غالب کا ارادہ تھا۔ کہ باقی سفر کشتی سے طے کریں۔ لیکن چونکہ دریائی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ بنارس سے وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

”ناخدایانِ ناخداشناس بنارس درباب کشتی مضائقہ کردند۔ چہ ہر کہ برخوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید۔ و تا پٹنہ افزوں از بست روپیہ خواست۔ ناچار ہماں اسپ سوار تابداں تعجہ صحرا خواہم پیمود۔“

غرض اس طرح وہ پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ چار شعبان ۱۲۴۳ھ یعنی ۲۰ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ یہاں اُنہوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ مکان دس روپیہ کرائے پر لیا۔ اور حصولِ مدعا کے لئے کوشش شروع کی ؎

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و زمے

از سینہ داغِ دوریٔ احباب شستہ ایم

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہنچے تھے کہ انہیں اطلاع ملی۔ کہ نواب احمد بخش جن کی تقسیم کے خلاف وہ کوشش کرنے یہاں آئے تھے۔ وفات پا گئے۔ لیکن اُنہوں نے جائداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اب مرزا کا تنازعہ ان سے تھا۔ شروع شروع میں جب وہ کلکتہ میں حکام سے ملے۔ تو انہیں کامیابی کی بہت اُمید بندھ گئی تھی۔ اس وقت کلکتہ میں چیف سیکرٹری اینڈریو سٹرلنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر سائمن فریزر۔ موخرالذکر کی ملاقات ان سے دوستانہ طریقے سے ہوئی۔ اور "معانقہ و عطائے عطر و پان" تک کی نوبت آئی۔ مسٹر اینڈریو سٹرلنگ نے بھی جن کی تعریف میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غالب کی عرضداشت لے کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ عرضداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہوئی۔ تو وہاں سے حکم ہوا۔ کہ پہلے یہ درخواست ایجنٹ دہلی کے پاس ہونی چاہئے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ رُکے۔ اور اپنے وکیل ہیرا لال کو دہلی لکھا۔ کہ مناسب عرضداشت بہ سر ایڈورڈ کولبروک ایجنٹ دہلی کی سفارش کرا کے کلکتہ بھجوائے +

جب کہیں مہینوں کے بعد مرزا کا خط دہلی پہنچا۔ اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سر ایڈورڈ کولبروک دورہ پر چلے گئے تھے۔ اور عرضی پیش نہ ہو سکی۔ ادھر لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی کونسل کے مختلف ارکان جا بجا پریشان تھے۔ مرزا سے اپنے مقدمے کے متعلق تو کچھ نہ ہو سکا۔ ہاں فارسی شعر گوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہو گیا تھا۔ اسے پورا کرنے کے موقعے ملتے رہے +

مُشاعرہ کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہوئی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مُشاعرہ ہوتا۔

اور اُردو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔ ان میں ایک غزل تھی جس کا مقطع مشہور ہے ؎

گردہم شرحِ ستمہائے عزیزاں غالبؔ
رسمِ اُمید ہمانا زجہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا۔ تو لوگ مُعترض ہُوئے ؎

جُزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو مُوئے کہ بُتاں را ز میاں برخیزد

اعتراض یہ تھا۔ کہ عالم واحد ہے۔ اور ہمہ بقولِ قتیل واحد سے پہلے نہیں آسکتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہُوا۔ کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدہ

غالب کے معترضین[1] میں مولوی عبدالقادر رام پوری۔ مولوی کرم حسین بلگرامی۔ مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور فارسی کے دوسرے مُستند اُستاد تھے۔ لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی دنوں شاہزادہ کامران کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتے آیا ہُوا تھا۔ اس نے غالب کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات شعر ایسے پڑھے۔ جن میں ہمہ عالم، ہمہ روز، ہمہ جا، اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ نواب اکبر علی متولی امام باڑہ اور دوسرے بااثر آدمیوں نے مرزا کی حمایت کی۔ لیکن مرزا طبعاً صُلح پسند تھے۔ اور اب بالخصوص اس

---

[1] یہ مثنوی (بادِ مخالف) وہاں لکھی گئی۔ اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور انکے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگر پاتے تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے"
(عودِ ہندی ص ۱۰۱)

غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتے کے بااثر لوگوں سے بگاڑ مول لینا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے نواب اکبر علی اور مولوی محمد حسن کے ایما پر ایک فارسی مثنوی بادِ مخالف لکھی۔ جس میں معترضوں کے جواب اسناد و دلائل کے ساتھ دئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن اور قتیل کی تعریف کر کے صلح و آشتی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے۔ لیکن وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر بخوبی قادر تھے۔ اور خاص خاص موقعوں پر اُردو شعر کہہ لیتے تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں ان کا مشہور اُردو قطعہ کلکتے ہی کی ایک صحبت کی یادگار ہے۔

گُلِ رعنا

کلکتے میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ جن کا اخبار آئینۂ اسکندر سے کچھ تعلق تھا۔ اور جن کا حکام میں بھی بہت رسوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور غالب کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اُردو دیوان کا انتخاب اور فارسی کلام گُلِ رعنا کے نام سے جمع کیا۔ اس انتخاب کا ایک نامکمل نسخہ، جس میں اخیر کے اُردو اشعار اور فارسی غزلیں نہیں، مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے اس میں کئی ایسے اُردو اشعار درج ہیں جو بعد میں منتخب اُردو دیوان سے خارج کر دئے گئے گُلِ رعنا کا 'مقدمہ' اور 'خاتمہ' مرزا کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کے لئے بڑا دلچسپ ہے۔

کلکتے میں غالب کا قیام دو سال سے کچھ کم رہا ہوگا۔ شروع شروع میں تو نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت بھائے۔ گورنر جنرل کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی اور باقاعدہ دربار کا اعزاز ملا۔ لیکن جب دو سال گذر گئے۔ اور جس منزل کو پیشِ نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے۔

وہاں تک رسائی نہ ہوئی۔ تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط اس تلخی سے پُر ہیں۔ اور ایک فارسی قطعے میں بھی کلکتہ کے متعلق انہوں نے مکالمے کی صورت میں تلخ جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

حالِ کلکتہ باز جستم وگفت — باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم اینجا چہ شغل سود دہد؟ — گفت از ہر کہ ہست ترسیدن
گفتم اینجا چہ کار باید کرد؟ — گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم از بہرِ داد آمدہ ام
گفت بگریز و سر بسنگ مزن

مقدمہ کا فیصلہ

مرزا کے خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ دہلی سے سر ایڈورڈ کولبروک نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی۔ اور کلکتہ سے بھی حوصلہ افزا جواب دیا گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ جواب نہ پہنچا تھا۔ کہ کولبروک معزول ہو گیا۔ اور معاملے پر نئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتے میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں ہو رہا تھا۔ اور گورنر جنرل خود دہلی کی طرف جانے والا تھا۔ اس لئے مرزا بھی کلکتے سے دہلی واپس گئے۔ اور ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو وہاں پہنچکر نئے ایجنٹ فرانسس ہاکنس سے مدد چاہی۔ کرنیل ہری املاک نے مرزا کی سفارش نئے ایجنٹ سے کی تھی۔ اور انہیں کچھ اُمید بھی ہوئی۔ لیکن ایجنٹ نے رپورٹ نواب شمس الدین رئیس فیروزپور کے حق میں کی۔ مرزا کو ان کے دوستوں نے اس کی اطلاع دی۔ لیکن وہ مطمئن تھے۔ کہ اسٹرلنگ چیف سیکرٹری معاملے کو سنبھال لے گا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتے نہیں پہنچی تھی۔ کہ ۲۳ر مئی ۱۸۳۰ء کو سٹرلنگ مر گیا۔ اور ۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ء کو لارڈ ولیم بینٹنگ نے فیصلہ مرزا کے

خلاف کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جائداد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی حکم نامہ پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتاتے تھے۔ اس کے مطابق نصر اللہ خاں کے وارثوں کی غور و پرداخت کے لئے جو رقم مقرر ہوئی تھی۔ وہ لارڈ لیک کے احکام کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ رہ گئی تھی۔ جس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے۔ پندرہ سو مرزا نصر اللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اس کے دو بھتیجوں یعنی مرزا غالب اور مرزا یوسف کے تھے۔ مرزا اس "نامۂ فارسی بے نام و نشاں" کی صحت اور اہمیت کے قائل نہ تھے۔ لیکن سر جان عکم نے جن سے اس امر میں استصواب کیا گیا' اسے درست تسلیم کیا۔ اور ان کے مشورہ پر لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کا دعوے خارج کر دیا۔

سفرِ کلکتہ کے اثرات

یہ صحیح ہے کہ بظاہر مرزا کا سفرِ کلکتہ بے کار ثابت ہوا۔ اور حصولِ جائداد کی تمام تگ و دو رائگان گئی۔ لیکن مرزا کے مشاہدے کی وسعت اور ذہنی نشو و نما کے لئے کلکتے کا سفر بہت مفید رہا۔ ایک تو غربت میں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ہوا دوسرے کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدرِ حکومت تھا۔ مغرب کی تمام ترقیاں اور ایجادیں سب سے پہلے ہندوستان میں وہاں شروع ہوتی تھیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس معاملے میں ان کی واقفیت اپنے ہموطنوں سے زیادہ تھی[۱]۔

---

[۱] اس کا کچھ اندازہ مرزا کے اس قطعہ سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے سرسید کی کتاب آئینِ اکبری کے متعلق لکھا۔ اور جس میں مغربی ترقیوں کی ایک دلچسپ تصویر کھینچی ہے۔

اسی طرح لکھنؤ میں بھی مرزا کو دیر تک قیام کرنے اور وہاں کے طرزِ شاعری اور زبان کی صفائی میں ناسخ جو کوششیں کر رہے تھے انہیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یقین ہے۔ کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت نے ان تمام باتوں سے فائدہ اُٹھایا ہوگا۔ اُنہوں نے سفرِ کلکتہ کے بعد عرصے تک اُردو اشعار بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن اس کے پہلے اور بعد کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے۔ وہ طبیعت اور دماغ کی اُس پختگی کو نمایاں کرتا ہے۔ جو اس تین سال کے عرصے میں انہیں حاصل ہوئی ؎

باب چہارم

مقدّمے کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی اُس کا اظہار کئی خطوں میں ہے۔ چنانچہ مولوی سراج الدین کو جنہوں نے اس سلسلے میں ان کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ لکھا ہے:۔

"کارِ من بداں گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشد بتباہی گرائید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد بازبداں در رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را برخود بگریانم۔ بیہات اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ بدیں تفریق از روئے دفترِ سرکار کہ سود دلان آں را معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود۔ بائستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش راندندے وگفتندے کہ ہرزہ مخروش۔ آنچہ تو باز یافت وانمودہ یافتی ازاں فزوں ترنیست۔ وقرارداد نیز ہمانست۔ لاجرم دیوانہ بودمے۔ اگر بدیں کشور باز آمدمے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادراں اند۔ بہ ستیزہ برخاستمے و بباطل سپری نام برآوردمے"۔

ان سطور سے یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کو پھر کلکتے جانے و رصدر میں کوشش کرنے کا خیال تھا۔ لیکن غالباً یہ فقط انشا پردازی ہے۔ مرزا پھر کلکتے نہیں گئے۔ اور اس خط کے

آخر میں لکھتے ہیں:۔

"اکنوں مصلحت در آں بینیم کہ ازیں داوری قطع نظر فرمائند و وکالت نامۂ من کو نزد منشی نصر اللہ است۔ باز ستانند واز ہمہ بہ رنند و بگذرند اللہ بس ماسویٰ ہوس"

مرزا کو ایک تو اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ دوسرے ابنائے دہلی کے طعنے۔ جن سے بچنے کے لئے انہیں شروع شروع میں کنج عزلت میں پناہ لینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شعر کے ناقابل تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا۔ ان کے عزیز دوستوں میں سے ان کے تعلقات مولوی فضل حق سے ہمیشہ برقرار رہے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں سے رابطہ اسی زمانے میں بڑھا۔ اور نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے جو نواب شمس الدین سے بہت خوش نہ تھے۔ رشتۂ اخوت اور مضبوط ہو گیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو اپنے دونوں بھائیوں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ انتظام اس کا نواب امین الدین کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایک شرط یہ تھی۔ کہ اس کی آمدنی میں سے ۱۲۵۰۰ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے میں نواب ضیاء الدین کے اخراجات کے لئے جمع کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدین یہ رقم باقاعدہ خزانے میں جمع نہ کر سکے۔ اس پر نواب شمس الدین نے کوشش شروع کی کہ نواب امین الدین دستاویز کی تمام شرطیں پوری نہیں کر سکے۔ اس لئے ایک سالانہ رقم کے عوض یہ پرگنہ ان سے لے لیا جائے۔ مسٹر مارٹن ریذیڈنٹ دہلی نے اس کی تائید کی۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے احکام کے مطابق لوہارو۔ نواب شمس الدین کو واپس مل گیا۔ مسٹر ولیم فریزر جو نئے ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ اس تبادلے کے حق میں نہ تھے۔ شروع میں نواب شمس الدین سے ان کا گاڑھا یارانہ تھا۔ لیکن بعد میں کشیدگی ہو گئی۔ انہوں نے نواب امین الدین کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس فیصلے کے خلاف

کلکتے جاکر کوشش کریں۔ مرزا بھی ان کوششوں میں شریک تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۸۳۴ء میں نواب کلکتے گئے تو غالب نے انہیں اپنے کلکتے کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے تعارفی خطوط دیئے۔ مولوی سراج الدین کو ایک خط میں اُنہوں نے لکھا تھا:۔

"بالجملہ بدیں نامہ نگاری مُدعائے اصلی بدیں رنگ است۔ کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر را ہمان موجِ بلا کہ زورقم شکستہ بود۔ خانہ بہ سیلابِ فنا داد۔ کمر بہ غمخواری و راہرو نوازی استوار بندید و خود را دوست دیرینۂ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش گیری بجا آرید۔ کہ این دردمند دُور از خانماں اسد اللہ رو سیاہ را فراموش کند و شمار ا بجائے او داند"۔

قید خانہ نشینی

مرزا کے عزیز دوست کئی تھے۔ لیکن اُن کے باوجود مرزا کے مصائب کم نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی۔ کہ نواب شمس الدین کا دہلی میں بہت رسُوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتے جانے سے پہلے ہی انہیں پریشان کر رہا تھا۔ بہت بڑھ چکا تھا۔ اور چونکہ قرضخواہوں کو کوئی بڑی جائداد نظر نہ آتی تھی۔ وہ حصُولِ زر کیلئے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسی سال ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعوےٰ کر کے ڈگری حاصل کرلی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ ان میں زرِ ڈگری ادا کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اور قاعدے کے مُطابق انہیں جیل جانا تھا۔ لیکن چونکہ بقول ان کے مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چپڑاسی ان کے گھر نہ جاتا اور جب تک مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کر سکتے تھے۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے تمام حالات لکھے ہیں:۔

"چار ماہ است۔ کہ نامہ نگار بہ کنجے نشستہ در بر آمد و شد بر روئے خویش و بیگانہ بستہ۔ اگر

بزنداں اندنیم اما خورد و خفتِ من بزندانیاں ماند. آنچہ دریں چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام. کافر باشم اگر ہیچ کافر بصد سالہ عقوبت جہنم یک نیم اناں تواند دید"

فریزر کا قتل

مرزا اس "قیدِ خانہ نشینی" میں تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کو ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ فریزر سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انہیں اُمید تھی۔ کہ شاید اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے۔ فریزر کی تعریف میں ان کا ایک پُرزور قصیدہ بھی ہے ؎

زجیبِ افقِ مہر چوں سر برآرد — مے از سبز مینا بساغر برآرد
من و بزمِ ولیم فریزر بہادر — کہ از جیب ہر گوشہ گوہر برآرد
خہے داد گستر کہ گر در حضورش — خسے داد از دست آذر برآرد
کشد انتقام خس از شعلہ چنداں — کہ دُود از نہادِ ہر اخگر برآرد

مرزا کو اس کی موت کا بہت رنج ہُوا۔ چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں:۔

"یکے از ستمگرانِ خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر صاحب بہادر را کہ ریذیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مربی بُود۔ در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کُشت۔ مرا غمِ مرگِ پدر تازہ کرد:"

ان دنوں جو صاحب دہلی میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ غالب کو جانتے تھے۔ اُنہوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلے میں مدد لی۔ اور سرکاری تفتیشات کا نتیجہ یہ نکلا کر نواب شمس الدین اور اسکا ایک سپاہی مجرم قرار دئے گئے۔ نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے۔ دہلی کے لوگ لے اُڑے کہ نواب بے گناہ ہے۔ اور غالب اور فتح اللہ بیگ خاں[1] نے کینہ وری سے

---

[1] سوانح عمری لارڈ لارنس میں درج ہے کہ نواب کے متعلق شک ایک شخص فتح خاں (؟) کے ایک فقرے
(باقی اگلے صفحہ پر)

حکام کو اس کے خلاف بھڑکا رکھا ہے +

نواب شمس الدین سے جنہیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام میں پھانسی دی گئی۔ عوام کو بہت ہمدردی تھی۔ اور غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہو تاہم یہ خیال عام ہونے کے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اور مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لئے یہ وقت کس ابتلاء اور آزمائش کا تھا۔ اور وہ غصے اور عداوت سے کس طرح بے قابو ہو رہے تھے +

نواب کی وفات کے بعد فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط ہوگئی۔ اور مرزا کی پنشن جو انہیں اس ریاست سے ملتی تھی۔ دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہوئی۔ مرزا نے اس موقعے پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائداد سے پورا حق پانے کے لئے پیش کی۔ لیکن لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کے حقوق کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا۔ اس لئے وہ داخل دفتر ہوئی۔ اس پر مرزا نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے حکومت ہند کے فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن مرزا کو اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں ایک عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی ارسال کی لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی۔ اور مرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی +

ادبی سرگرمیاں | فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دربار شاہی میں اپنا اثر

(صہ ۶۹ سے آگے)
کی وجہ سے پیدا ہوا جسے مٹکاف صاحب نے ذاتی عداوت کا اظہار سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن لارنس صاحب نے دھیان میں رکھا اور مجرم کا سراغ کھود نکالا +

بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی سب نردیں اُلٹی پڑ رہی تھیں۔ یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ اس زمانے میں تختِ شاہی پر اکبر شاہ ثانی متمکن تھے اور ظفر ولی عہد تھا۔ لیکن ظفر کی دماغی حالت بہت اچھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے ۱۸۳۴ء میں کوشش کی۔ کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائے مرزا غالب سمجھتے تھے۔ کہ ظفر تو ذوق کا ہو رہا۔ اگر شہزادہ سلیم آگے چل کر بادشاہ ہُوا تو میرے لئے بہتر رہے گا۔ چنانچہ اسی سال عید البقر کے موقعے پر انہوں نے "شہ و شاہزادہ" کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں بادشاہ اکبر کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھ کر شہزادہ سلیم کی تعریف کی تھی ؎

زہے مناسبتِ طبعِ شاہزادہ سلیم
بہ فیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اقلیم

لیکن بادشاہ کی تجویز کو حکامِ انگریزی نے نہ مانا اور ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہو گیا۔ ممکن ہے کہ اس کے دل میں اس قصیدے کا کچھ ملال رہا ہو۔ اور اس کی تعریف کے ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو بار بار معذرت کرنے کی جو ضرورت پیش آئی۔ اس کا اس قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو +

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہُوا۔ اُسی سال نصیر الدین شاہ اودھ کا انتقال ہُوا اور امجد علی شاہ اس کا جانشین ہُوا۔ مرزا نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا لیکن وہ غالباً پڑھا نہیں گیا۔ اس قصیدے میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا رویا ہے

با من کہ تابِ نازِ نکویاں نداشتم
بد کرد بد کہ جور و جفا کرد روزگار

ایک قطعہ بند بھی ہے جس کا مضمون اقبالؔ کی مشہور نظم "اسیری" سے جو انہوں نے مولینا محمد علی کی رہائی پر لکھی تھی، ملتا جلتا ہے ؎

گفتم بہ عقلِ کُل کہ ندانم برائے من　　　حکمِ دوامِ حبس چرا کرد روزگار

گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نہٗ　　　کانرا گرفت و باز رہا کرد روزگار

تو بلبلی ہمیں کہ بدام آمدی ترا　　　اندر قفس ز بہرِ نوا کرد روزگار

بیشک غالبؔ کے لئے یہ حصۂ زندگی مصیبتوں اور ناکامیوں سے بھرا ہُوا تھا لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بنجر نہ تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ جب مرزا کے نوابی اور جاگیرداری کے خواب پریشان ہو گئے۔ تو انہیں شعر و سخن سے جو ازلی دلچسپی تھی۔ وہ اور بھی بڑھ گئی۔ اور جو چیز پہلے فقط دل لگی کا اظہار تھی۔ اب سرمایۂ حیات ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیفات میں بڑی دلچسپی لے کر منتخب اُردو دیوان اور فارسی نظم و نثر کو مرتب کیا۔ اور فارسی غزلیات کا معتدبہ حصّہ بھی اسی زمانے میں لکھا گیا۔ جب ۱۸۳۵ھ میں نواب شمس الدین کی پھانسی کے کچھ دیر بعد مرزا کے نسبتی بھائی مرزا علی بخش خاں[۱] ان کے ہاں آ کر مقیم ہُوئے۔ تو ان دنوں مرزا کی فارسی

---

[۱] مرزا علی بخش مرزا کے نسبتی بھائی تھے۔ اس کے علاوہ غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف کی صاحبزادی مرزا علی بخش کی بہو اور مرزا غلام فخرالدین کی بیوی تھی۔ مرزا غالب اور مرزا علی بخش کے تعلقات شروع میں اچھے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں اُنمیں فرق آ گیا۔ مرزا نے اپنے دو خطوں میں مرزا علی بخش کی "دروغ بافیوں" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردوئے معلےٰ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا ان کی تدفین میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے مرزا علی بخش نے غدر کے وقت مرزا کی مدد نہیں کی۔ وہ ایک اُردو خط میں اپنے سکہ کے متعلق لکھتے ہیں "سبحان اللہ گولہ انداز کا مارو بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین؟) کا بہنوئی (مرزا ضیاء الدین) مددگار ہے۔ اور شاعر (غالبؔ) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار نہیں"۔ (بین القوسین الفاظ ہمارے ہیں)

نظم ونثر کا مجموعہ میخانۂ آرزو مرتب ہو چکا تھا۔ اس کا خاتمہ ۱۸۳۸ء میں لکھا گیا۔ اور اس کا ایک قلمی نسخہ رائے چھجمل کے ہاتھ کا لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا مرزا کی فارسی شاعری کی تدوین میں وہی مرتبہ ہے۔ جو نسخۂ بھوپال کا اردو شاعری میں۔ اور جس سے ان کا ابتدائی چالیس سال کا فارسی کلام وثوق سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

پنج آہنگ

ابتدا میں جب غالب نے یہ مجموعہ مرتب کیا۔ تو اس میں اشعار کے ساتھ فارسی نثر شامل تھی۔ مرزا علی بخش کو نثر جداگانہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے میخانۂ آرزو[1] میں جو نثر موجود تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کر کے پنج آہنگ مرتب کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے۔ جس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ آہنگ اوّل میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں۔ جو غالب نے سفر بھرتپور کے دوران میں لکھی تھیں۔ آہنگِ دوم میں فارسی مصادر اور مصطلحات ہیں۔ آہنگِ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کئے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ آہنگِ چہارم میں تقاریظ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے فارسی خطوط ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی۔ اور ۱۸۴۰ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۵۳ء ہے۔ اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگِ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے۔ اس لئے بقول غالب پنج آہنگ نامکمل ہے

---

[1] مرزا کی تصنیفات کے نام بہت شاعرانہ ہیں۔ گلِ رعنا۔ میخانۂ آرزو۔ پنج آہنگ۔ مہرِ نیمروز اردوئے معلےٰ۔ عودِ ہندی۔ سبدِ چیں۔

اور اس کے مکمّل ہونے کا کوئی امکان نہیں +

فارسی خطوط

آہنگِ اوّل کا تذکرہ ہم ابتدائی حالات میں کر چکے ہیں۔ آہنگِ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگِ سوم کے اشعار اس لیے بھی کار آمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخِ تصنیف تعین کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محلِ استعمال پڑھنا بے حد دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۳ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے اس کتاب میں دوسرے تذکروں سے زیادہ مفصّل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تو یہ بیشتر اسی محنت کا صلہ ہے۔ جو ہم نے ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی ہے +

مرزا کے اُردو خطوط کی سوانحی اہمیّت کو سب مانتے ہیں۔ لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعاتِ زندگی مختصراً دُہرائے ہیں۔ ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفٰے خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی کو بھی جو نواب کے لڑکوں کے اتالیق تھا۔ مرزا سے ملنے کے موقع ملتے رہتے تھے اس لیے اس زمانے کے حالات اور قصّے یادگارِ غالب میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ لیکن مرزا کے ابتدائی حالات میں ابھی کرید اور تلاش کی گنجائش ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اس کے لئے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں۔ جو ان کی عمر کے بڑے حصّے کی کم و بیش ایک مکمّل

تاریخ ہیں۔ اور جو اس وقت لکھے گئے۔ جب مرزا کو یہ حالات درپیش تھے۔ اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لئے بھی دلچسپ ہیں۔ کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی کئی ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ انکی فہرست بہت پُرشکوہ ہے۔ اور اس میں اس زمانے کے اکثر برگزیدہ آدمیوں کے نام آجاتے ہیں۔ چنانچہ شعرا میں سے ناسخ۔ مومن۔ شیفتہ۔ نیر رخشاں اور علما میں سے مولینا فضل حق مولانا صدر الدین صدر الصدور و قاضی القضاۃ مولینا ولایت حسین اور اکابرین میں سے شہزادہ بشیر الدین ٹیپوری۔ شہزادہ سلیمان شکوہ۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خان۔ سر جیمز طامسن۔ مہاراجہ الور۔ نواب سعد الدین خان شفق مجتہد العصر مولوی سید محمد و حکیم احسن اللہ خاں۔ ان سب کے نام مرزا کے دوستانہ خطوط موجود ہیں۔ جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔ ان سے بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ ان خطوط میں بیشتر ذاتی حالات کا تذکرہ ہے۔ لیکن ان سے اس زمانے کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً مرزا نے اپنے سفرِ بنگالہ کی جو سرگزشتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے یا جو خط انہوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا ہے۔ اس میں لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے۔ جو انہیں معتمد الدولہ کی وزارت میں برداشت کرنی پڑیں۔ اس کے علاوہ کئی خطوط میں مولوی سراج الدین کو دہلی کی دلچسپ خبریں لکھی ہیں۔ مثلاً ۳۱/ جنوری ۱۸۳۱ء کے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے۔ کہ جونہی انہوں نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں نے فوراً پانسو روپیہ ماہوار ان کے اخراجات کے لئے مقرر کر دیا۔ اور جس روز وہ دہلی سے روانہ

ہوئے۔ اہالیانِ دہلی کی بُری حالت تھی۔ ولی عہدِ شاہ دہلی مرزا ابوظفر نے انہیں اپنے پاس بُلایا۔ اور ایک دوشالہ ملبوس خاص نذر کرکے آنکھوں میں آنسو لاکے نہایت رنج و درد سے الوداع کیا۔ ایک اور خط میں لارڈ النبرا کے اس فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی رو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگ مرمر اتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو بقول لارڈ کرزن آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جاسکا۔

حالی نے 'یادگارِ غالب' میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کرکے فارسی کے دُوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں اور خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مرزا خود چاہے کچھ کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر اُن فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا۔ جن کی تصنیفات ہندوستان میں لکھی گئیں۔ اور اس امر پر قریب قریب سب فارسی اہلِ زبان متفق ہیں۔ کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترک یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرزِ تحریر کسی طرح بھی قابلِ تقلید نہیں۔ ان کتابوں کے مصنف بالعموم موٹے موٹے عربی لفظوں۔ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنےٰ نہیں اور ظہوری۔ ابوالفضل اور بیدل کی طرح ان کی نثر میں بھی غیر مانوس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اُن کی آخر عمر کی تصانیف دستنبو اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے۔ اور اکثر فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں۔ جو تقریظوں اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف اور موثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اُردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں۔ جو اُردو خطوط میں ہے۔ اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے اُردو خطوط کا طرۂ امتیاز

ہے۔ فارسی خطوط میں سراسر مفقود ہے۔ بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اُردو خطوط میں عُریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے اس پر فارسی خطوط میں تکلفات اور رسمی انشا پردازی کے پردے پڑے ہُوئے ہیں۔ اور اس کے دلچسپ اور ہر دلعزیز پہلو مشکل سے ہی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن آخر فارسی اور اُردو خطوط دونوں ایک ہی ذہنِ رسا کے نتائج تھے۔ اور جس طرح ایک ہی مضمون کو مرزا نے فارسی اور اُردو اشعار میں ادنےٰ اختلاف کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اسی طرح فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں۔ جنھیں ترقی دیکر انہوں نے اُردو میں نہایت موثر طریقے سے ادا کیا۔ مثلاً انہوں نے عارف کی موت پر جو غزل لکھی ہے وہ اُردو کی موثر ترین نظموں میں سے ہے۔ لیکن اس کا چربہ اس سے پندرہ سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے۔ جو انہوں نے مولوی سراج الدین کو مرزا احمد بیگ کی وفات پر لکھا۔ "میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بمروت راہ گردانید و ناقہ سر منزل دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطر دوستانِ عزیز نداشت۔ چرا بحالِ خرد سالاں نہ پرداخت" یہی آخری خیال ہے۔ جس کو انہوں نے اُردو غزل میں نظم میں کیا ہے ؎

مُجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

باب پنجم

غالب کو مقدمے کا فیصلہ اگست ۱۸۳۱ء میں معلوم ہُوا۔ اس کے بعد زمانے نے اب تک کئی رنگ بدلے تھے۔ جائداد کا قضیہ غالب کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن اب جن سے تنازعہ تھا۔ وہ ہی نہ رہے تھے۔ اور اُن کی لاکھوں کی جائدادیں نذرِ فنا ہو گئی تھیں۔ مرزا بھی اپنی قسمت پر قانع ہو چلے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ان کے تعلقات کسی انگریز افسر سے بڑھتے۔ اور منزلِ گُم گشتہ کی ایک جھلک نظر آتی۔ تو وہ ایک نئی عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیج دیتے۔ اور پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز میں ایسی کئی عرضیاں محفوظ ہیں لیکن ان کوششوں اور جسم و جان کی اگلی بازیوں میں بہت فرق تھا۔ اور اب اگر یہ عرضیاں داخلِ دفتر ہوتیں تو مرزا بہت مایوس نہ ہوتے۔ مرزا اب اپنے ماہوار مشاہرے سے مطمئن ہو چلے تھے اور غالباً چند احباب و امرا کی اولاد کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف ملک میں عام ہو چلی تھیں۔ اور ان کی قبولیت سے ان زخموں کا اندمال ہوتا تھا۔ جو تلاشِ روزگار میں کھائے تھے +

ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی لیکن سرکاری طور پر جو رقم ملتی۔ اور جو کچھ احباب کی

عنایت سے حاصل ہو جاتا۔ مرزا اس سے مطمئن تھے۔ اور اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کے لئے بہت بے قرار نہ تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں طامسن کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے انہیں بلایا گیا۔ تو چونکہ وہ اپنے آپ کو جاگیردار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ملازمانہ طریقے سے حکام سے ملنا قبول نہ کیا۔ اور یہ ملازمت نہ لی۔ بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور معمولی متصدیوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوشامد و تملق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ چیف سکتر کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا مداحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے۔ اسے وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے۔ جس کے شروع سے سب شاعر پابند چلے آئے ہیں۔ اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصیدے فی الحقیقت منظوم عرضیاں ہیں۔ جنہیں زیادہ موثر بنانے کے لئے مرزا نے بجائے نثر کے نظم میں لکھا۔ وہ طبعاً خوددار اور حساس تھے۔ اور وضعداری کے تمام اصولوں کا دھیان رکھتے تھے۔

اردو اور فارسی کلام کی اشاعت

ان دنوں ان کے تعلقات سر سید احمد خاں اور ان کے بھائی سید محمد خاں سے بڑھے۔ اور اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ان کا منتخب دیوان ریختہ ان بھائیوں کے پریس سید المطابع سے چھپ کر شائع ہوا۔ فارسی دیوان بھی اس سے چار سال بعد شائع ہوا۔ چنانچہ مہاراجہ بنارس کے کتب خانے میں دیوان غالب کا جو ایڈیشن ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۴۵ء ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے مرزا کی شہرت جہاں پہلے نہ پہنچی تھی۔ پہنچ گئی ہوگی۔ اور ان کا بلند مرتبہ سب تسلیم کرنے لگے ہوں گے۔

مشاعروں کی غزلیں

علاوہ ازیں ان دنوں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہو رہے تھے جنمیں فارسی اور اردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا سب میں تو نہ جاتے

تھے۔ لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان میں نواب زین العابدین عارف آگر کھینچ لے جاتے۔ مرزا نے ان مشاعروں میں کئی غزلیں پڑھیں۔ جن میں سے چند کے اشعار ہم انتخاب کرتے ہیں ؎

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست　　ظرفِ فقیہ مے نجست بادۂ ما گزک نخواست

غرقہ بموجہ تاب خورد تشنہ ز دجلہ آب خورد　　زحمتِ ہیچ یک نداد راحتِ ہیچ یک نخواست

جاہ ز علم بے خبر علم ز جاہ بے نیاز!　　ہم محکِ تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

شحنۂ دہر بر ملا ہر چہ گرفت پس نداد　　کاتبِ بخت در خفا ہر چہ نوشت حک نخواست

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں　　کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

گشتہ در انتظارِ پور دیدۂ پیر رہ سفید　　در رہِ شوق ہمرہی دیدہ زمردمک نخواست

سہل شمرد و سرسری تا تو زعجز نشمری
غالب اگر بداوری دادِ خود از فلک نخواست

اس مشاعرے میں جو طرحی غزل انہوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت پُرلطف ہیں ؎

چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید　　بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمے آید

انہوں نے عرفی کی طرز پر جو قصیدہ "گرستیتن" کی ردیف میں لکھا ہے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے تجویز کئے ہوئے مصرع طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس مشاعرے میں یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اس میں میر نظام الدین ممنونؔ اور مولوی امام بخش صہبائیؔ علالت کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔ اور چونکہ فارسی کے قدردان تھوڑے تھے۔ مرزا ششش و پنج میں تھے۔

کہ پڑھوں یا نہ۔ کہ اتنے میں مولٰنا صدرالدین آزردہ جو ابھی نہیں آئے تھے۔ آپہنچے۔ چنانچہ مرزا ایک خط میں نواب مصطفےٰ خاں کو جنہیں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ بھیجا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں :۔

"بندہ را در زمینِ "گریستن" نگارشِ قصیدہ اتفاق افتادہ بود۔ آں می سنجیدم کہ ایں ورق را
چوں براتِ نامقبول باز برم و در ریختہ گویاں نہ درد سر دہم۔ کہ ناگاہ آمدن حضرتِ آزردہ دل بخود
بالیدہ و زمزمۂ دستوری یافت"

چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرے میں پڑھا گیا۔ اور جیسا کہ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے بہت پسند ہُوا۔

مرزا نے عرصے سے اُردو شاعری قریب قریب ترک کر رکھی تھی۔ اور ۱۸۴۳ء کے ان مشاعروں میں جن میں اور شعرا نے اُردو غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے فارسی اشعار ہی پڑھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں گاہے گاہے انہوں نے اُردو غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ جب نواب اصغر علی خاں نسیمؔ نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا۔ اور ذوقؔ۔ مومنؔ اور غالبؔ کو دعوت دی۔ تو مرزا نے اُردو غزل ہی پڑھی ؎

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے   رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

اس زمانے میں انہیں نواب تجمل حسین خاں رئیسِ فرخ آباد کی دعوت آئی ہُوئی تھی۔ مرزا نے لگے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

اسی طرح اس زمانے میں ایک اور عظیم الشان اُردو مشاعرہ ہُوا۔ جس میں ذوقؔ اور مومنؔ نے طرحی غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے بھی دو غزلہ کہا ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقعوں پر فارسی قصائد اور قطعات بھی بکثرت لکھے ہیں جب مسٹر جیمز ٹامسن جنہوں نے مرزا کی جاگیر کا سوال نئے سرے سے اُٹھانا چاہا تھا۔ آگرے کے گورنر ہوئے۔ تو مرزا نے اس موقعے پر دس شعر کا ایک نفیس قطعہ لکھا تھا۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہوا عبیر فشان است و ابر گوہر بار
جلوس گل بسر بر چمن مبارک باد

عموماً یہ قطعات مدحیہ ہوتے تھے۔ اور اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب فتح کیا۔ تو مرزا نے اکیس شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا۔ جو نہ کسی کی تعریف میں ہے اور نہ غالباً کسی کو بھیجا ہی گیا۔ اس میں سکھ فوج کے خلاف بُری طرح زہر اُگلا ہے۔ اس زمانے کی تاریخی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چند احکام کے خلاف مولینا سید احمدؒ بریلوی نے جہاد کا اعلان کیا۔ تو دہلی میں بہت سے لوگ ان کے ہم خیال تھے۔ مہاراجہ کے فرانسیسی جرنیلوں کے خلاف تو مولینا اپنے ساتھیوں کے نفاق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جب ۱۸۴۶ء میں خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی۔ تو دہلی کے مسلمان بہت خوش تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی یہ قطعہ لکھ کر دل کا غبار نکالا۔ انہوں نے اس موقعہ پر جو پُرکیف قصیدہ لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پُرلطف ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر میں جوان ہوتا تو "حصول ثواب" کی "نیت" سے حکومت پنجاب کے

خلاف لڑائی میں شریک ہونا ؎

گر از شیوهٔ من نیست راست میگویم | درین زمانه مرا بوده ارزمانِ شباب
پئے شکستنِ کفار بستمے به نبرد | کمر به سر خوشیٔ نیتِ حصولِ ثواب

لیکن پنجاب کا امن و امان انہیں جس چیز کے لئے عزیز ہے۔ وہ کشمیر کی شراب ہے!

کنوں که ملک مطیع است و راه بے خس و خار | ز من بگو بفروشندگانِ بادهٔ ناب
شرابِ قندیِ هندوستان دماغم سوخت | ز شیره خانهٔ کشمیر م آورند شراب

ابرِ گہر بار

ادبی نقطۂ نظر سے اس زمانے کی اہم ترین تصنیف ان کی فارسی مثنوی ابرِ گہر بار ہے۔ حالی کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سر سید احمد خان نے آثار الصنادید لکھی۔ تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵-۱۶ جزو کے قریب ہو چکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس مثنوی کے کئی اشعار مہرِ نیمروز میں درج ہیں۔ جو مارچ ۱۸۵۲ء سے پہلے کی تصنیف ہے +

حقیقت میں مرزا کا ارادہ حفیظ جالندھری کی طرح شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ انکی خواہش تھی کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے اسی طرح وہ ابتدائے اسلام کے جنگوں کو مثنوی کی صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں ؎

ز فردوسیِ نکته انگیز تر | ز مرغِ سحر خوان سحر خیز تر
فرو بردنِ شمعِ ساسانیان | بود صبحِ اقبالِ ایمانیان
رقم سنج منشورِ یزدانیم | ز ایمانیان گویم ایمانیم!
کسے را که نازد به بیگانگان | خرد در شمارد ز دیوانگان
باقبالِ ایمان نیروئے دین | سخن رانم از سید المرسلین

لیکن انہیں یہ ارادہ پورا کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور وہ حمد و نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامے سے زیادہ نہیں لکھ سکے۔ نعت کا حصہ صاف اور موثر زبان میں ہے۔ اور اس میں چند نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں مثلاً

زخونیکہ در کربلا شد سبیل
ادا کرد وامِ زمانِ خلیل

یا معراج کے متعلق لکھا ہے ؎

بدورِ تو نشد لن ترانی کہن — فصاحت مکرر نگنجد سخن
ترا خواستگار است یزدانِ پاک — ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ساقی نامہ میں انہوں نے بچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے۔ اور ساقی سے خطاب کیا ہے ؎

بیا ساقی آئینِ جم تازہ کن — طرازِ بساطِ کرم تازہ کن
مبادا نظامی ز راہت برد — بدستاں سوئے خانقاہت برد
فریبش مخور چوں مے آشام نیست — ستمدیدۂ گردشِ جام نیست
ورع پیشۂ مسکین چہ داند ترا — بہ آرائشِ نامہ خواند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے۔ اور مناجات اور معراج کے آخری حصے میں جو شاعری کا بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے۔ اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفسِ مضمون میں چند ایسی اصولی مشکلات تھیں۔ جن کی وجہ سے اس میں شاعرانہ شوخی اور مبالغے کی گنجائش نہ تھی۔ یہ تمام نظم مرزا نے رُک رُک کر لکھی ہے۔ اور خود اس مثنوی کے آخری حصے میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

دریں رہ بسیج سفر ہا بسیت — بود راست لیکن خطر ہا بسیت

بزمے کہ در وے بود اجتناب زرود و سرود و شراب و کباب
سخنور چہ گفتار بیشش آورد کزاں رنگ بر رُوئے خویش آورد
دریں بزم او باش را بار نیست مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

قید

بہت ممکن ہے کہ مثنوی کے نامکمل رہنے کی ایک وجہ مضمون کی مشکلات ہوں۔ ویسے اس زمانے میں چوسر کے ساتھ کچھ بد کر کھیلنے کی بدولت اُن پر ایک حادثہ بھی ایسا گذرا تھا جس کی وجہ سے ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں گے۔ ۱۸۴۷ء میں چوسر کی وجہ سے مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں ان پر جو فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی تفصیلات بمبئی کے احسن الاخبار مورخہ ۲۵ جون ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اور چونکہ اس سے زیادہ مکمل اس واقعہ کی تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں۔ ہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں:۔

"دہلی دار جمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جاوے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔

ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔"

بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی۔ اور مرزا کو جرمانے اور قید کی سزا ہو گئی۔ چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے:۔

"مرزا اسد اللہ خاں غالب بر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا۔ اس کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں۔ تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقررہ جرمانے

کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں۔ تو مشقت معاف ہو سکتی ہے جب اس
بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا
قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا
برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی
ہے کہ اگر سشن جج صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی
ہو۔ تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ
بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا
دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہُوا ہے۔ معمولی سے جُرم میں ایسی سخت سزا دی جائے
جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے" +

حال ہی میں سیّد ناصر نذیر فراقؔ نے لال قلعہ کی ایک ملازمہ کی زبانی "قلعہ اور شہر دہلی
کے بعض واقعات جمع کئے ہیں۔ ان میں غالبؔ کے مقدمہ کا بھی ذکر ہے۔ ان کے مطابق مرزا کا
مقدمہ کنور وزیر علی خان کی عدالت میں پیش ہُوا تھا۔ اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب (مسٹر
جیمس طامسن ؟؟) یا کسی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے
کہ مرزا کی گرفتاری اور قید سے اچھی خاصی سنسنی پیدا ہُوئی تھی۔ چنانچہ احسن الاخبار کے علاوہ معاصرانہ
تصانیف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نصیرؔ کے ایک شاگرد منشی گھنشام داس عاصیؔ دہلوی کا دیوان کلیاتِ
اُردو سبھا دہلی کی طرف سے شائع ہُوا ہے۔ اس میں تاریخ گرفتاری مرزا غالبؔ کے عنوان کے
ماتحت کچھ نثر اور ایک قطعۂ تاریخ درج ہے۔ شاید عاصیؔ غالبؔ کا دل سے قدردان اور بہی خواہ
نہ تھا۔ چنانچہ جو قطعہ تاریخ اس نے لکھا ہے۔ اس سے غالبؔ کی صریح توہین ہوتی ہے۔
لیکن نثر کے اندراج سے گرفتاری کے واقعہ پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہم اسے نقل

کہتے ہیں :-

"مرزا نوشہ، شاعرِ بے بدل، رندِ مشرب، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا۔ ۔ ۔ بہ وقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے۔ اور ظاہر کیا۔ کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے۔ اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں۔ کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینے کے اندر بہت جمعیت تھی۔ اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کر دیا۔ بہت سے رئیس و شرفا اس حرکت سے ناراض تھے۔ اور عدالت میں برأت کے مساعی ہوئے۔ مگر قید ہو گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے۔ اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غمزدۂ زنجیر بپا ہیں   کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔"   (کلام عاصی ص ۲۶۳)[1]

سید ناصر نذیر فراق اور عاصی نے مرزا غالب کی قبل از وقت رہائی کی جو وجوہات بتائی ہیں۔ ان میں تطابق نہیں۔ لیکن مرزا غالب نے جو وجہ بیان کی ہے۔ وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ حالی نے مرزا کے ایک فارسی خط کا ترجمہ کیا ہے:

"کوتوال دشمن تھا۔ اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ اور میری قید کا

---

[1] ہم مولوی امتیاز علی عرشی کے ممنون ہیں۔ کہ انہوں نے ہمیں عاصی کے اندراج سے مطلع کیا۔ اور پھر ہماری درخواست پر اسے نقل کر کے ہمیں ارسال کیا۔

حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا۔ اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اُس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہُوا۔ کہ جب آدھی میعاد گذر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا۔ اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی۔ اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی۔ اور میری خاکساری اور آزردہ روی سے اس کو مطلع کیا۔۔۔۔۔"

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معزز اور خاندانی آدمی کے لئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی۔ ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہُوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں "ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ پڑا ہے۔ جس کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے"

اس واقعہ نے مرزا کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ابھی تک انہوں نے جاگیرداری اور نوابی کے رکھ رکھاؤ کو قائم رکھا تھا۔ شاید یہ اُمید تھی۔ کہ انگریز اور ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کسی ریاست میں کوئی معزز جگہ مل جائے۔ لیکن قید کی ذلت و رسوائی نے یہ سارا طلسم درہم برہم کر دیا۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں، اُستاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کر دوں۔"

قید کے زمانے میں انہوں نے ایک ترکیب بند لکھا تھا۔ جسے ہم نے تمام کا تمام

حصّہ انتخاب میں نقل کیا ہے۔ اس ترکیب بند سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مصیبت کے وقت نواب مصطفےٰ خاں نے ان کی بڑی مدد کی۔ اور مرزا نے نواب صاحب کی تعریف میں جو بست و بند فارسی قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے ؎

بشنود بے آنکہ باد آں را برد   نالہ گر در کنجِ زنداں مے زنم

بنگرد بے آنکہ کلکش آں را کشد   نقش گر بر صفحۂ جاں مے زنم

دربار میں باریابی

مولینا حالی کا بیان ہے۔ کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی۔ اور قریباً تین مہینے کے بعد ہی رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد وہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ اور انہی کی سفارش سے دربار میں باریاب ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے۔ اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی جاتے تھے۔ لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک فارسی قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

خواہیم قربِ شاہ و لیکن دریں مُراد

عبرت زنا مرادئ سنجر گرفتہ ایم

بہادر شاہ کی تعریف میں مرزا کا سب سے پہلا قصیدہ یہی ہے۔ اور بادشاہ کی تخت نشینی کے سال میں لکھا گیا۔ یہ قصیدہ غالب کے دیوانِ فارسی منقولہ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں موجود ہے۔ اس قصیدے سے بادشاہ کی خفگی دُور نہ ہُوئی۔ اور مرزا کو کئی معذرت آمیز قصیدے لکھنے پڑے۔ مثلاً قصیدہ پانزدہم جس کا مطلع ہے ؎

نبے زخویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ

سراجِ دینِ نبیؐ بُوظفر بہادر شاہ

اس قصیدے میں دربار سے دُور رہنے کی نسبت اشارہ ہے ؎

شہنشہا زغمِ دُوریٔ درت کارم	بداں رسیدہ کہ بے مرگ جاں دہم ناگاہ
بہارگہ نرسم، خانہ، بسپہر خراب	ندیمِ شاہ نشوم رُوئے روزگار سیاہ
چہ سرکنم روشِ مدح گستری چو مرا	ببزمِ خسروِ گیتی ستاں نباشد راہ

یہ قصیدہ ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن اس سے عتابِ شاہی دُور نہ ہُوا۔ اور مرزا نے معذرت کے انداز میں ایک اور قصیدہ لکھا۔ جو ۱۸۴۱ء کے بعد اور ۱۸۴۵ء سے پہلے تصنیف ہُوا ؎

ردیفِ شعر ازاں کردم اختیار گرد
کہ از منست برابر دوئے شہر یار گرد

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوق اور اس کے معاونین مرزا کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے اور اس کے قلیل الحجم اُردو دیوان کا بادشاہ کے سامنے تمسخر اڑاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اسی زمانے میں (۱۸۴۵ء سے پہلے) ایک قطعہ میں ذوق سے خطاب کیا تھا ؎

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ	کے بہ پرگوئی فلاں در شعر ہمسنگِ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است ار سوادِ ریختہ	کاں ورقِ برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من است
فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال	مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگِ من است
کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقی است زنگ	صیقلی آئینہ ام ایں جوہرآں زنگ من است

شاید مرزا کے مخالفین بادشاہ کے دل میں مرزا کی وفاداری اور دلی عقیدت کی نسبت بھی شبہے ڈالتے تھے۔ چنانچہ مرزا اسی قطعہ میں کہتے ہیں ؎

شاہ میداند کہ من مدّاحِ شاہم باک نیست
گر تواند لیشی کہ ایں دستاں ز نیرنگِ من است

لیکن مرزا ان کوششوں کے باوجود باریاب نہ ہوئے۔ اور ۱۸۴۵ء کے بعد بھی انہیں ایک قصیدے میں عفوِ تقصیر کی درخواست کرنی پڑی۔ اس پُرزور قصیدے کا مطلع ہے ؎

گفتم حدیثِ دوست بہ قرآں برابر است
نازم بہ کفرِ خود کہ بہ ایماں برابر است

اس کے کئی شعر مرزا کی اپنی حالت کا بیان معلوم ہوتے ہیں ؎

گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشی — خود خواہشِ محال بہ حرماں برابر است
با چارہ گر بگوے کہ تیمار پیش کش — دردیست در دلم کہ بہ درماں برابر است
زیں موجِ خوں کہ می گذرد دمبدم ز سر — دستارِ من بہ لالہ و نعماں برابر است
کینہا ے آشکار کہ سرجوشِ نازِ اوست — در ذوق با نوازشِ پنہاں برابر است
نے وعدۂ نہ پرسشِ رازے نہ شکوۂ — داغم ز نامۂ کہ بہ عنواں برابر است
نے کف گرفتہ ساعد و نے لب بودہ بوس — در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابر است

پیوستہ پر فشاں و نہ جستہ ز آشیاں
پروازِ من بہ جنبشِ مژگاں برابر است

اس قصیدے میں غالباً ذوقؔ کی طرف اشارہ ہے ؎

بالد بخویش خواجہ چو گوئی سخنورش — غافل کہ ایں ترانہ بہ بہتاں برابر است
نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود — نے ہر سخن سرائے بہ سحباں برابر است
نے ہر شتہ سوار بہ صاحبقراں بود ہمال — نے ہر شباں بموسیٰ عمراں برابر است

نے ہر کہ گنج یافت زِ پرویز گوئے بُرد — نے ہر کہ باغ ساخت بہ رضواں برابر است

اخیر میں اپنی محرومیٔ قسمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور بادشاہ سے عفوِ تقصیر کی درخواست کی ہے ؎

با آنکہ بر سرِ بہرِ شہ افشاندہ ام زِ کلک — این نکتہ ہا کہ با دُر و مرجاں برابر است
اینک مرا زِ خجلتِ گفتارِ نارسا — جوشِ عرق بموجۂ طوفاں برابر است
پوزش پذیر و مکرمت انگار کز توام — خود یک نگہ بہ لُطفِ نمایاں برابر است
آرے قبولِ عذرِ گنہ از گناہ گار — با صد ہزار بخشش و احساں برابر است

کلامِ غالب کے مختلف معاصرانہ نسخوں سے اور ان سطور سے جو مرزا نے مہرِ نیمروز کے شروع میں لکھی ہیں خیال ہوتا کہ مرزا دربار میں پہلی دفعہ قید کے بعد باریاب ہوئے۔ لیکن یادگارِ غالب اور کلامِ غالب کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے اس امر کا بھی بدیہی ثبوت ملتا ہے۔ کہ باریابی سے پہلے ہی مرزا اور بادشاہ کے تعلقات سُدھر چکے تھے۔ مرزا غالب کا جو اردو دیوان مئی سنہ ۱۸۴۷ء میں یعنی قید کے واقعہ سے پہلے مطبع دار السلام سے شائع ہوا ہے اُس میں غالب کا وہ قطعہ موجود ہے۔ جس میں بادشاہ کی طرف سے بیسنی روٹی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسی طرح سنہ ۱۸۴۵ء میں مرزا کا جو فارسی دیوان شائع ہوا۔ اس میں غالب کی فارسی مثنوی "سرمۂ بینش" جس میں بہادر شاہ کی بیان کی ہوئی ایک تمثیل کی شرح کی ہے۔ اور وہ مرثیہ جو انہوں نے شہزادہ فرخندہ شاہ کی وفات پر لکھا۔ دونوں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بانکی پور لائبریری میں سنہ ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) کا نقل کیا ہوا جو دیوانِ غالب محفوظ ہے۔ اس میں مرزا کی پانچ فارسی رباعیاں ہیں جو بادشاہ کے خواب کے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ رباعیاں سنہ ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھی گئیں۔ کلیاتِ نثر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا نے ان میں سے چار رباعیاں نواب مبارز الدولہ مرزا حسام الدین حیدر خاں کو بھیجیں تاکہ وہ انہیں ظفر الدولہ کی وساطت سے حضورِ شاہ میں (اپنے نام سے ؟) پیش کریں۔ ان کے علاوہ

اُردو دیوان مطبوعہ ۱۸۴۱ء میں دو رباعیاں اور ایک غزل ہے۔ ان میں بھی غالباً بہادر شاہ کی طرف اشارہ ہے ؏

دربار میں مرزا کے باریاب ہونے کی صحیح تاریخ لکھنا تو مشکل ہے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ باریابی بہادر شاہ کے مُرشد شاہ نصیر الدین عرف کالے شاہ صاحب کی وساطت سے ہُوئی۔ چنانچہ مرزا مہرِ نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں :-

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیٔ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت۔ در خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد۔ بفروغ ازاں فرۂ ایزدی کہ فریدوں۔ بفرتاب دادگری دل افروخت و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت۔ بداں در فرودم آورد کہ تو نیز چوں حلقۂ چشمے بداں درداری و نتوانی کہ دیدہ برداری۔ دیوارِ کاخ والا پایہ ہمسایۂ بیدار دلِ دیدہ ور قدسی سرشت گہر جادہ شناس راہِ سیر و سلوک و راہ نمائے جادۂ فقر و فنا مشاہد شہود شاہد یقین مولینا محمد نصیر الدین را مانم کہ ہر کہ بسایۂ آں دیوار ہمایوں آثار گام زند۔ نشگفت کہ سایۂ خویش در فردوس افگند۔ ... نخست آیۂ رحمت کہ برمن از بالا فرود آمد رودادن خجستگی زمیں بوس گیہاں خدیو خداداں بود۔ دولت روئے آورد بخت از خواب جست۔"

شاہی ملازمت

حضرت کالے شاہ کی کوشش سے اتنا ہُوا۔ کہ مرزا دربار میں باریاب اور بہادر شاہ کے مُرید ہو گئے۔ وہ دربار میں حاضر ہوتے۔ قصاید اور نظمیں پڑھتے۔ اور انعام اور خلعت پاتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں بارِ شاہی سے کوئی مُستقل تعلق نہ تھا۔ اور پیٹ کا دھندا ابھی باقی تھا۔ یہ تعلق بادشاہ کے مدار المہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہربانی سے ہُوا۔ احترام الدولہ مرزا کی فارسی نثر کے بڑے مدّاح تھے۔ چنانچہ جب بہادر شاہ کو شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھوانے کا خیال ہُوا۔ تو انہوں نے

مرزا کو بُلا کر یہ کام اُن کے سُپرد کر دیا۔ مرزا مہرِ نیمروز میں لکھتے ہیں:۔

"اگر در شرح روا بود سے گفتمے۔ کہ شاہ سکندر است و حکیم ارسطو ہمانا بلند نامی سلطانِ دہر دریں آفاق چشم داشت۔ کہ چوں مے را کہ بہ جادو بیانی شہرۂ آفاقم بکردارِ گدائی گماشت من خود ازاں رو کہ دل و زبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ شاہ است دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ فرمانِ شاہ است"

چنانچہ بادشاہ نے حکیم صاحب کی تجویز پر صاد کیا۔ اور ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے +

آگرہ کا ایک اخبار (اسعد الاخبار) ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں یہ خبر اس طرح لکھتا ہے:

"ان دنوں شاہِ دین پناہ نے جناب معلّے القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو، مامور کیا۔ اور اسکے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آیندہ افزائشِ پرورش کا متوقع کیا۔ اور "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ" خطاب دیکر چھ پارچہ کی بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے۔ کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی۔ کہ ہر ایک اسکے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا" +

باب ششم

لال قلعہ

ولی عہد کی اُستادی

۱۸۵۰ء میں مرزا بادشاہ کے درباری مورخ مقرر ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ولی عہدِ شاہ شہزادہ فتح الملک نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ ولی عہد نے غالب کے قدیمی دشمن نواب شمس الدین کی بیوہ سے شادی کی تھی[1]۔ اور ظاہر ہے۔ کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہو گئی ہو گی۔ جو ولیعہد نے تمام پچھلے واقعات سے چشم پوشی کر کے مرزا کو اپنا اُستاد چنا۔ ولیعہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب میں روزِ ازل کی دلچسپ روئداد لکھی ہے۔ دوسرا قصیدہ رودکی کے قصیدے کی بحر میں ہے ؎

دادرِ سلطاں نشاں آید ہمی — سرورِ گیتی ستاں آید ہمی
شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند — شہر یارِ نکتہ داں آید ہمی

---

[1] ملاحظہ ہو کمال داغ صر ۴۶

شہریاری با جوانی خوشتر است　　شہریارِ نوجوان آید ہمی

تیسرے قصیدے کے کئی شعر تغزّل کے نقطۂ نظر سے بہت پُر لُطف ہیں ؎

فریب پرسش پنہاں نگر کہ من ہمہ عُمر　　بذوقِ وصل ابد ساختم بہجرانش

کسم بہ خود نہ پذیرفت و دہر بازم بُرد　　چو نامۂ کہ بود نانوشتہ عنوانش

ازاں بہ گلشن گیتی نشاط مے ورزی　　کہ بوئے زہر ہمی نشنوی ز ریحانش

جوان بخت کی شادی

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی۔ کیونکہ ولیعہد دو سال بعد چل بسے۔ اور اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے درباری تعلقات نیک پھل لائے۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اردو خطوط کا آغاز اسی زمانے سے ہوا[۱] دوسرے ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اُردو غزلیں لکھنی پڑیں۔ لیکن ذوق سے معاصرانہ کشمکش باقی تھی۔ اور دسمبر ۱۸۵۱ء ہی میں سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ آبِ حیات میں اس قضیے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ اور غالب نے انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفقؔ کے نام ایک خط میں بھی اس کے متعلق ذکر کیا ہے۔

"از دیر باز سرِ دستانسرائی اُردو ندارم۔ ہمانا از رضا جوئی شہریارِ سلیمان پیشگار است گاہ گاہ ناگاہ در رنگِ ریختہ ریختن دشیرہ بفرمانِ بانوی بلقیس پرستار است در ریختہ بدیں ردیف نارواد ل آویختن مگر در مقطع غزل سر مستانہ ہوئے زدہ باشم آں یکے کہ گمان کمالے کہ نداشت داشت پنداشت کہ روئے سخن سوئے اوست۔ در مقطع غزلیکہ سرود بہنجار ستیزہ گام زد و دانست

---

[۱] مولینا حالی نے 'یادگارِ غالب' میں لکھا ہے۔ کہ مرزا کو اُردو خط و کتابت ۱۸۵۰ء میں شروع کرنی پڑی۔ جب وہ ہمہ تن مہرِ نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ غالب کے اپنے خطوط سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

کہ گفتارِ مرا با سخ سازد من بسیہ مستی، ہیں تہ جرعہ کہ فرو ریختہ خامۂ من است ع

ہر چہ در گفتار فخرِ تُست آں ننگِ من است

سر سخن فرو نیاوردم و قطع نظر را دلیلِ قطعی امتیاز شمردم"۔

اس کے بعد نہایت متاسفانہ انداز سے اپنی ناکامیوں پر آنسو بہائے ہیں:۔

"آو از من کہ مرا زباں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند نہ بآئین نیاگانِ خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ و کمرے و نہ بفرہنگ فرزانگان مپش بوعلی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوقِ سخن کہ از ازل آوردہ بودم۔ رہزنی کرد و مرا بداں فریفت۔ کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است سرلشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگزار و بسخن گستری روئے آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم۔ سفینہ در بحرِ شعر کہ سراب است رواں کردم قلم علم شد و تیر ہائے شکستۂ آبا قلم۔ یا خود بروزگار دیدہ ورے نبود یا بود و بمن نپرداخت۔ ہمانا تیرگیئ روزگار من اندازہ شگرفیئ کار من کس نشناخت فرجام کار اکنوں کہ دندان فرو ریخت و گوش گراں گشت موی سپید است و روئے پُر از شرنگ دست بلرزہ اندر است و پائے در رکاب از آں ہمہ سودا کہ در سر بود جاں کندنی و نان خوردنی بمن ماند و بس۔ تا از آنچہ امروز کاشتہ ام فردا چہ دروم"۔

مرزا کا سہرا ذوقؔ کے سہرے سے بہتر تھا۔ لیکن ذوقؔ اُستادِ شاہ تھا۔ اُسے ناراض کرنے سے بادشاہ ناراض ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا کو معذرت لکھنی پڑی ؎

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

بہادر شاہ کے آخری سال بھی بہت اطمینان کے نہ تھے۔ نواب زینت محل شہزادہ

(لہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

جواں بخت کی ولیعہدی کے لئے کوشاں تھیں۔ لیکن اس میں کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اسکے علاوہ بادشاہ کی اپنی صحت بھی خراب تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے۔ اور حج کے لئے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ غالباً غالب نے اسی موقع پر کہا تھا ؎

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

مہرِ نیمروز مہرِ نیمروز یعنی شاہانِ تیموری کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۵۲ء سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا[۵] اور ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن دُوسرا حصہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ کیونکہ بادشاہی سلسلہ پہلے حصے کی تکمیل کے پانچ چھ سال بعد تک قائم رہا۔ ممکن ہے کہ بہادر شاہ جو سادہ اور مؤثر طرزِ تحریر پسند کرتا تھا۔ اُسے مرزا کی بڑھتی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو۔ اور اس نے اس کتاب کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے

(نوٹ ۵ متعلقہ صفحہ ۹۷)
بادشاہ نے (اوائل ۱۸۵۲ء) میں جو فارسی مثنوی غالب سے لکھوا کر اپنے نام سے لکھنؤ اور دُوسری جگہوں میں شائع کروائی۔ اسکے دو دردناک اشعار ہیں ؎

دیدہ باشد کہ شہر یار نہ ایم | کارفرمائے بندہ دار نہ ایم
شاہیٔ من بجز ریاست نیست | بہرِ من پایۂ سیاست نیست

---

[۵] پنج آہنگ ص ۲۳۷ خط بنام مولوی رجب علی خان۔

اس پر ان کی پیاز کی مثال صادق آتی ہے۔ کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں۔ مغز کا نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مورخ نے لکھی۔ بہت ہونی چاہئے۔ کچھ بھی نہیں +

مومن کی وفات ۱۸۵۲ء میں یعنی جس سال مہر نیمروز مکمل ہوئی۔ مومن کا انتقال ہو گیا۔ مومن ذو ایک بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔ مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک فارسی رباعی میں بھی کیا ہے ؎

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر خوں نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

عارف کی وفات لیکن اس سال کے جس سانحہ کا انہیں مرگِ مومن سے بھی زیادہ رنج ہوا۔ وہ نواب زین العابدین عارف کی وفات تھی۔ جو اپریل ۱۸۵۲ء میں واقع ہوئی۔ عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے۔ اور چھوٹی عمر ہی میں خوب شعر کہتے تھے۔ مرزا کو وہ بہت عزیز تھے۔ اور ان کی نسبت انہوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام کہ رخش شمع دودمانِ منست
از نشاطِ نگارشِ نامش خامہ رقاص در بنانِ منست
آنکہ در بزمِ قرب وخلوتِ اُنس غمگسارِ مزاج دانِ منست
زور بازوئے کامرانی من راحتِ روحِ ناتوانِ منست

ان کے مرنے کا مرزا کو بہت افسوس ہوا جس کا اظہار انہوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ میں کیا ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جوان تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرحوم کے دو بیٹے تھے۔ حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا پہلے حسین علی خاں اور پھر باقر علی خاں ہر دو کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں اپنے بچوں کی طرح بڑے لاڈ پیار سے پالا۔

واجد علی شاہ کی مدح معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مرزا نے اودھ کے تین یا چار بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ انہیں مدح کا صلہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کی طرف سے ملا۔ چنانچہ وہ مجتہد العصر مولینا سید محمد صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"سہ شنبہ یازدہم ماہ صفر توقیع خدائگانی و پنجشنبہ سیزدہم ماہ عطیہ سلطانی تشریف ورود ارزانی داشت ..... چنیں ناخوش ہنگام کہ دیدہ بماتم مردم دیدہ سیاہ پوش و شہر از آشوب ستیز کفر و اسلام پُر خروش باشد۔ بندہ پروردن و بدیں خُوبی کہ در حوصلہ امکان نگنجد۔ کار را سرہ کردن اگر معجزۂ امامت و نیروئے ولایت نیست دگر چیست"۔

اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن اس میں ہنومان گڑھی کے واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ۱۸۵۲ء میں روپذیر ہوا۔ مجتہد العصر حسن کے ایما پر غالب نے اردو مرثیہ کے تین بند بھی لکھے تھے۔ غالب کے بڑے قدردان اور مربی تھے۔ وہ غالب کے قصائد دربار میں پیش کرتے۔ اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ مرزا سے دمغ الباطل کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا۔ تو انہوں نے مرزا کی وکالت کی۔ اور عتاب شاہی سے بچایا۔ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اودھ سے پانسو سالیانہ بھی مقرر ہوا تھا۔ لیکن یہ بہت دیر تک ملنے نہیں پایا کہ اودھ کی سلطنت جاتی رہی۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کلکتے بطور اسیر سلطانی بھیج دیئے گئے۔

بادشاہ اور فرمانروائے رامپور کی اُستادی ویسے مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے

گزرتی تھی۔ مالی حالت قدرے بہتر تھی قلعہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ شاہزادوں میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ مرزا ان میں اردو غزلیں پڑھتے۔ اور چونکہ ان کا موجودہ رنگ مقبولِ عام تھا۔ تعریفیں ہوتیں۔ ذوق سے بھی اب ان کے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ محبس برہم ہونی شروع ہوئی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اور اس کے دو سال بعد ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق بھی چل بسے[1]۔ مشہور شعرا میں اس وقت غالب کے سوا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن اس اعزاز سے اور بھی اہم واقع دربار رامپور سے تعلق تھا۔ جس کا آغاز اس سے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کے شروع میں ہوا۔ یہ تعلق مولوی فضل حق صاحب کی وساطت سے پیدا ہوا۔ جنہیں نواب یوسف علی خان نے علم پرور رامپور کھینچ لے گئی تھی۔ اُن کے ایما پر مرزا نے ایک فارسی خط نواب صاحب کی خدمت میں لکھا۔ اور اس کے بعد اپنا دیوان اور ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

همانا اگر گوہر جاں فرستم   بہ نواب یوسف علیخاں فرستم

نواب کی خدمت میں بھیجے۔ نواب صاحب اس سے پہلے دہلی میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے۔ اب فنِ شعر میں بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ اور گاہے گاہے ان کی مالی امداد کرتے رہتے۔ اس ہنگامی مدد کے علاوہ اردوئے معلےٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانی لوگوں کی دریوزہ گری اور فاقہ کشی تک کی نوبت آئی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا اردو دیوان رام پور نہ

---

[1] مرزا نے تاریخ لکھی ؎

تاریخ وفاتِ ذوق غالب   با خاطرِ دردمند و مایوس
خوں شد دل زار تا نوشتم   خاقانیٔ ہند مُرد افسوس

۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۴ء

بھیج دیتے۔ تو (چونکہ ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاءالدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا تھا) ممکن تھا کہ جس طرح ذوقؔ اور آزادؔ اور نیرؔ درخشاں کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوان غالب بھی اُسی آگ کی نذر ہو جاتا۔

بہادر شاہ اور مرزا غالب بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین سال کی ہو گی اس سلسلہ میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کے طرز شاعری کا بہت مداح نہ ہو۔ حالیؔ نے بھی ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزادؔ کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بادشاہ کے اُستادوں کو ایک پھول اور ایک کلی سے پورا گلدستہ بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفرؔ کی نسبت یہ بات بہت مشہور ہے۔ لیکن ظفرؔ اور غالبؔ کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیاتِ ظفرؔ میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور جب ہم کلیاتِ ظفرؔ کا عام معیار دیکھتے ہیں۔ تو یہ خیال کہ اس میں غالب کے نتائجِ فکر بھی شامل ہیں۔ غالب کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا۔

مرزا ملک الشعرا تو نہ ہوئے لیکن دبیر الملک وہ ایک عرصے سے تھے۔ اور اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز سمجھے جاتے تھے۔ انہیں کئی موقعوں پر فرمانروائے دہلی کی ترجمانی کرنی پڑی۔ ۱۸۵۳ء میں جب بہادر شاہ کے تبدیلِ مذہب کی شہرت ہوئی۔ تو اس نے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی دمغ الباطل لکھوا کر عام افواہوں کی تردید کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک کتاب "حقیقت مذہب اہلِ سنت والجماعت" پر تصنیف کی جس پر مرزا نے زور شور سے تقریظ لکھی۔ اور "خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثباتِ قدم مسلکِ تسنن پر باور کرایا"۔

مرزا کو تصوف سے تھوڑی بہت دلچسپی تو فارسی شعر کے لگاؤ سے ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اب بہادر شاہ کی صحبت نے اسے اور ترقی دی۔ چنانچہ اب ان کے اشعار میں صوفیانہ خیالات زیادہ

ہو گئے۔ اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے۔ کہ جب ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ کے ایما پر مفتی میر لال نے صوفیانہ اشغال و اذکار کا مجموعہ تیار کیا۔ تو اس کے شروع میں مرزا نے ایک دیباچہ لکھا جس کی نسبت حالی کہتا ہے۔ "اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلےٰ خیالات، نہ اس سے پہلے اور نہ اسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔"

مرزا بادشاہ کے استاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر رہا تھا۔ جب بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر بادشاہ کے جو حقوق ہیں۔ ان سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن بہادر شاہ اپنی بے دست و پائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اڑا رہنے کا عادی تھا۔ وہ نہ مانا۔ لیکن اب اس کا انجام قریب نظر آرہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان کو قطب جانا ہوگا۔ اس فیصلہ پر ریذیڈنٹ سے نواب زینت محل کی بڑی جھڑپ ہوئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا۔ اور اس کے دو سال بعد جب مرزا قویش کا ولی عہدی پر تقرر ہوا۔ تو طے پایا۔ کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشین کو بہادر شاہ سے پنشن کم ملے گی۔ دوسرے اس کا خطاب بادشاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا۔ یعنی شاہی سلسلہ بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔[1]

فرمانروائے انگلستان کی مدح

مرزا احکام رس تھے اور ان باتوں سے بے خبر یا غافل نہ تھے۔ ۱۸۵۲ء ہی میں جب بادشاہ بیمار ہوا۔ تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت متردد تھے۔

۱؎ غالباً اسی موقع پر ظفر نے لکھا تھا ؎

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت   بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نامِ سلطنت

چنانچہ اس زمانے میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھا تھا:۔

"از شبِ عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رُو نماید و من کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام چہ رود"

اب جو بہادر شاہ کی جانشینی کے متعلق آخری فیصلہ ہُوا۔ تو اُنہوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائیگا۔ اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اُنہوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اس کے ساتھ ایک عرضداشت بھی۔ کہ رُوم و ایران کے بادشاہ شعرا پر بڑی بڑی عنائتیں کرتے ہیں اگر شہنشاہِ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سُنیے:۔

"در آں پوزش نامہ از آز و آرزو بدیں انداز نشاں دادہ آمد کہ خسروانِ روم و ایران و دیگر کشورگیراں را با سخن گستراں و ستائش گراں در بخشائش و بخشش رنگارنگ شمار رفتہ و دہن بہ گہر انباشتن و پیکر (بہ) زر سختن و دہ دادن و گنج فشاندن بکار رفتہ این سخن گستر ستائش گر مہرخوانی از زبانِ شہنشاہ و سراپائے بفرمانِ شہنشاہ و نانِ ریزہ از خوانِ شہنشاہ میخواہد ہمانا پایگاں مہرخواں و سراپا در تازی گفتار خطاب و خلعت و چم نان ریزہ در انگریزی زبان پنشن تواند بود"

غالبؔ کو لندن سے اس خط کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل برک کی طرف سے ملا۔ کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق حکم صادر ہوگا۔ مرزا کے لئے یہ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ اور وہ معلوم نہیں اُمیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے۔ کہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہوگیا +

باب ہفتم

غدر

دستنبو

غدر کے دوران میں غالب کے حالات زندگی تلاش کرنے کے لئے ہمیں ان کے خطوط اور قصائد میں بہت کرید کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے مفصل حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں۔ سوانحی دلچسپی کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو شروع سے اخیر تک اس ہنگامے میں شریک رہا۔ اور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن سب معترف ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھ دئے ہونگے صحیح نہیں۔ مرزا خود ایک اُردو خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے متعلق متامل تھے۔ لکھتے ہیں:۔

> "ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا۔ اور ایک بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہو گی۔ اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہو گا۔"

اس کتاب کی زبان مہر نیمروز سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی الفاظ ترک کرنے سے

جابجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ تاہم شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب خبط نہیں ہوتا۔

واقعاتِ غدر دستنبو میں بیشتر تو ان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پہ گذرے لیکن اس کے علاوہ عام حالات کا تذکرہ بھی ہے۔ شروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرہ کے بعد ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج دہلی آئی اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس میں موثر ترین حصہ انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے متعلق ہے۔ جس کا مرزا کو بے حد قلق تھا۔

"ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خونِ گُل اندامان ارغوان زار نشد و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی ما با بزخمۂ نو بہار نہ شد۔ ہائے آں جہانداران داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکونام وآہ ازاں خانونانِ پری چہرۂ نازک اندام با رُخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکانِ جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند و در خوشخرامی بہ کبک و تذرو آہو میگرفتند کہ ہمہ بیکبار بہ گردابِ خوں فرو رفتند۔"

مرزا کو انگریز بے گناہوں کے قتل کا ہمیشہ افسوس رہا۔ چنانچہ غدر سے کئی سال بعد ایک اُردو خط میں لکھا ہے:-

"انگریز قوم میں سے جو ان رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہُوئے۔ ان میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔"

اس قتلِ عام کے بعد جو لُوٹ مار روا ہُوئی۔ اس کی تفصیل دی ہے:-

"خسانیکہ بہ دوزاز بہر فروختن خاک زمین می کافتند در خاک خردۂ زر یافتند و کسانیکہ بشب در بزم مے از آتشِ گل چراغ می افروختند در کلبۂ تار بداغِ ناکامی سوختند۔ زیور

دبیرایۂ لولیانِ شہر جز آنمایہ کہ در گردن و گوش زن و دختر شبگرد ست ہمہ در کیسۂ شبروانِ
سیہ کار ناجوانمرد ست ::

اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے قلعہ کا رُخ کیا اور مرزا نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے بہادر شاہ کے اُس دعوٰی کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ غدر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سپاہ کا حاکم نہیں بلکہ محکوم تھا۔ مرزا لکھتے ہیں " چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند۔ سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند ست

شاہ را در میاں گرفت سپاہ — ویں گرفتن بود گرفتنِ ماہ
شاہ ماہِ گرفتہ را ماند — نہ کہ ماہِ دو ہفتہ را ماند

دہلی سے انگریزوں کا انتظام اُٹھنے اور دوبارہ دہلی فتح ہونے تک جو حالات رُو پذیر ہُوئے۔ ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے۔ اور فقط پانچ چھ صفحوں میں اس چار مہینے چار دن کی سرگذشت ختم کر دی ہے[1]۔ کتاب کا زیادہ حصہ ان تکالیف کا بیان ہے۔ جو فتح دہلی کے بعد مرزا اور ان کے عزیزوں کو پیش آئیں۔ اور جنہیں اُنھوں نے نہایت دردناک طریقے سے قلمبند کیا ہے۔

فتح دہلی ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مرزا اس دن کی سرگذشت لکھتے ہیں:-

"کشور گیراں شہر را از سر تا سر گرفتند۔ غوغائے زد و کشت و گیر و دار تا بدیں کوچہ نیز رسید۔ و ہمہ را از بیم دل دو نیم شد۔ باید دانست کہ ایں کوچہ جز یک راہ و بیش از دہ و دوازدہ خانہ ندارد۔ از دو چاہ دریں کوئے نیست (؟) بیشتر از زن و مرد بدیں بود کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد را پشتوارہ بر دوش بدر رفتند۔ تنے چند کہ بجا ماندہ بہمدستی نئے من کہ از سخن پذیری

---

[1] ممکن ہے۔ کہ مرزا نے ان ایام کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہوں۔ لیکن فتح دہلی کے بعد انکی اشاعت نامناسب خیال کی ہو۔

گریز نداشتیم در از درون بستند و پیرامن آں سنگ بسنگ ہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سربستہ بود در بستہ نیز شد۔"

اس قید خانے سے باہر شہر کی جو حالت تھی اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"در ہمہ شہر از پانزدہم ستمبر ہر خانہ و ہر کلبہ را در فرازست۔ و فروشندگان و خرندگان ناپید۔ گندم فروش کجا۔ کہ دانہ خرندگا ز کو کہ جامہ بہرِ شستن بوے سپرند۔ گرا را کجا جویند کہ موئے سر ستُرد۔ پاکار را کجا یابند کہ پلیدی ببرد۔"

غالب اور اُن کے ساتھیوں کا باہر سے تعلق منقطع ہوا تو پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بالکل بند ہوگیا۔

"خوش و ناخوش از خورش ہرچہ لختے بُود۔ خُوردہ شد۔ و آب بداں کوشش کہ پنداری چاہ بناخن کندہ اند آشامیدہ آمد۔ دیگر در کوزہ و سبو آب و در مرد و زن تاب نماند۔۔۔ دو شبانہ روز در تشنگی و گرسنگی گزشت۔"

جب دو دن اس طرح بے آب و نان گزر گئے۔ تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں اور ان کے عزیزوں کے مکانوں کی حفاظت کے لئے جو سپاہی بھیجے تھے۔ وہ آ پہنچے لوگوں کو جان کا ڈر تھا۔ وہ کچھ کم ہوا۔ تو انہوں نے سپاہیوں سے پانی کے لئے استمداد کیا۔ چنانچہ انہیں بازار کے سرے تک جانے کی اجازت ملی۔ اور ہر گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خُم و سبو اُٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کُوئیں دُور تھے۔ اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک نمکین کوئیں سے ہی پانی بھر لائے۔ اور اس سے پیاس کی آگ بُجھائی لیکن نمکین پانی سے کہاں تسکین ہوتی ہے۔ لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ اور مرزا تسکین دیتے تھے۔ کہ جو ہمارا روزی رساں ہے۔ وہ ہمیں بھلائے گا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دُعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خوب مینہ برسا۔ لوگوں نے چادر باندھی۔ اور اس کے نیچے۔

گھڑا رکھ کر پانی جمع کیا۔ اور اپنی پیاس بجھائی۔ مرزا لکھتے ہیں:۔

"گویند ابر آب از دریا بردارد۔ و بر روئے زمین فرو بارد۔ و این بار ابر گراں مایہ سماسؔ آب از چشمۂ زندگی آورد۔ ہر آنچہ سکندر در پادشاہی جست۔ این تلخ کام شوربہ آشام در تباہی یافت۔"

مرزا غالب سے باز پرس

معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر تو لوٹ سے محفوظ رہا۔ لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں مرزا کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوادی گئی تھیں۔ وہ فتح مند فوج نے کھود نکالیں۔ علاوہ ازیں دستنبو سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے ۵ اکتوبر کو دیوار پھاند کر ان کے محلے میں آداخل ہوئے۔ اور انہوں نے دوسرے چھوٹے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر مرزا کے گھر کا رخ کیا۔ مرزا کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے مال اسباب کو نہیں اٹھایا۔ البتہ مرزا، عارف کے دو بچوں اور چند ہمسایوں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں کرنیل براؤن کے سامنے لے گئے۔ جہاں چند سوال و جواب ہوئے۔ اور مرزا کو اسی روز گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کی نسبت مرزا نے تو بہت کچھ صراحتاً نہیں لکھا۔ لیکن نواب غلام حسین خاں[1] نے غدر کے متعلق جو حالات لکھے ہیں۔ اس میں مرزا کے متعلق ذیل کا اندراج ہے:۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ اور کرنل براؤن صاحب کے سامنے لے جا کر ان کو پیش کیا۔"

---

[1] نواب غلام حسین خاں عارف کے والد اور مرزا کے ہمزلف تھے۔

مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ اُن کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہُوئے تھے۔ اُنہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوائی"۔

مرزا یوسف کی وفات

مرزا تو سخت جاں تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں اور بچ نکلے۔ لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا تیس برس کی عمر سے دماغ خراب تھا۔ اور غالب کے مکان سے دُور ایک علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جس قدر موروثی پنشن مرزا کو سرکاری خزانے سے ملتی تھی۔ اسی قدر مرزا یوسف کو ملتی تھی۔ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن جب دہلی فتح ہُوئی۔ تو قیامت کی طرح نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پہ ان کے پاس ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی اطلاع ملی۔ لیکن بے بس تھے۔ ایسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے:۔

"فرستادن وآں سہ تن وکالاا بدینجا آوردن اگرچہ دانستمے نتوانستمے"۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بھائی کا فکر ان کے دل پر بھاری بوجھ تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"من ہمہ در بند آنم کہ برادر لشب چوں خفت و بروز چہ خورد۔ وتا آگہی بداں پایہ کہ نمے توانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مُرد"۔

۳۰ ستمبر کو جب انہیں اپنا دروازہ بند کئے ہُوئے پندرہ سولہ دن ہو رہے تھے۔ انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے۔ اور سب کچھ لے گئے۔ لیکن انہیں اور بوڑھے نوکروں کو زندہ چھوڑ گئے"۔

نواب معین الدین جو مرزا کے قریبی رشتہ دار تھے۔ غدر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ مرزا اسد اللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز

سن کر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ۱۹ اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا بوڑھا دربان آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گیا۔ مرزا کی حالت اس وقت قابلِ رحم تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ۔ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ نہ کفن کے لئے کپڑا۔ نہ مردہ نہلانے کے لئے مُردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کے لئے گورکن۔ اس کے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا بھی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لے جانے کی ہمت کسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بے کسی پر رحم کیا۔ اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا۔ مرزا کے دو نوکروں کو ساتھ لے کر میت کو نہلایا۔ اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے۔ ان میں لپیٹ کر قریب کی ایک مسجد میں مرزا یوسف کو دفن کیا۔ دستنبو سے یہ امر واضح نہیں ہوتا۔ کہ بھائی کی تدفین کے وقت مرزا موجود تھے۔ لیکن اگر وہ تھے بھی اور نمازِ جنازہ کا بھی کسی طرح انتظام ہو گیا۔ تب بھی مرزا یوسف کا انجام انکی زندگی سے کم حسرت ناک نہیں معلوم ہوتا ہے

دریغ آنکہ اندر درنگِ سہ بیست — سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہِ خاک بالیں ز خشتش نبود — بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا بریں مُردہ بخشائشے — کہ نادیدہ در زیست آسائشے

حکیم محمود خان

معلوم ہوتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد جو افراتفری مچی۔ وہ ایک دو مہینے میں ختم نہیں ہو گئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو گیا تھا۔ لیکن مرزا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں۔ کہ ابھی تک وہی حالت ہے۔ دن کو بے قرار

رہنا اور رات کو اطمینان سے نہ سونا باقی ہے۔ اور اطمینان بھی کیسے ہوتا جبکہ مخبریوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ چنانچہ دوم فروری کو حاکم شہر چند سپاہیوں کے ساتھ غالب کے محلہ میں آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے غالب اور دوسرے لوگوں کو بڑا سہارا تھا۔ ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ غالباً زیر حراست رہے۔ لیکن بقول غالب "بڑوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا۔ حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تو تین روز کے بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ اور چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے۔ لیکن نصف سے زیادہ لوگ وہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا۔ شہر کے اور کئی معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی۔ اور حاکم شہر کے پاس کسی نے ان لوگوں کے خلاف مخبری کی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان لوگوں کی بے گناہی کے قائل تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سے تعلقات کی وجہ سے جو کچھ ان کا اثر تھا۔ وہ انہوں نے بے گناہوں کو بچانے کے لئے صرف کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی رہا ہو گئے۔ حکیم محمود خاں کی یہی عالی ہمتی تھی۔ جس کے متعلق مولانا حالی نے مرثیۂ محمود خاں میں لکھا ہے ؎

وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں اک محشر بپا — نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا — باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موجزن تھا جبکہ دریائے عتاب ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار — ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار — شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اسکے شُعلے سے کہیں سب خشک و تر

مجرم و بے جُرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ — عدل تھا مُجرم کا دُشمن اور بری کا غدر خواہ
مجرموں کے جُرم پر دیوار و در تھے سب گواہ — پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی اُس نے جو کی
اہلِ انصاف اُس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اُس نے سمجھا بے خطا — مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اِک اک رہا — جو کہ تھے نادار، کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا۔ کپڑا دیا بستر دیا!
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا، بے گھروں کو گھر دیا!

مرزا کے احباب

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگذشت لکھی ہے:
نواب ضیاء الدین اور نواب امین الدین جس ہفتے شہر فتح ہوا تھا۔ اُسی ہفتے اہل و عیال اور چند آدمیوں کے ساتھ اپنی جاگیر لوہارو جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی مہرولی ہی تھے۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے آگھیرا۔ اور بدن پر جو کپڑے تھے اُن کے سوا سب کچھ لے گئے۔ دہلی میں جو اُن کے گھر پر گذری۔ وہ اس سے بڑھ کر تھی۔

"اینجا در خانہ و کاشانہ و کاخ و کلوخ ہر چہ بود بتاراج رفت۔ نہ از سیمینہ و زرینہ نام و نشان ماند و نہ از گستردنی و پوشیدنی باندازۂ تار موئے درمیاں ماند"۔

مظفر الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں۔ (حسین مرزا) پر جو گذری وہ اس سے بھی دردناک تھی۔ وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح اپنے شاندار اور پرشکوہ مکان چھوڑ کر جان

بچاکر بھاگ نکلے تھے۔ جس طرح شہر میں اور گھر لوٹے گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑو دی گئی۔ لیکن اَوروں کے ہاں مکان تو سلامت رہے۔ یہاں کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی۔ چنانچہ لکڑی اور پتھر اور در و دیوار سب جل کر راکھ ہو گئے۔ نواب ضیاء الدین اور حسین مرزا کو جو مصیبتیں پیش آئیں۔ بہت دردناک تھیں۔ لیکن ایک خاص طور پر قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ کہ ان کی تباہی سے مرزا کا وہ کلام ضائع ہو گیا۔ جو ان کے یاں جمع ہوتا تھا۔ مرزا غدر کے بعد ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں:۔

"بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا"۔

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ ۱۸۵۷ء میں مرزا نے اپنے اردو کلام کا ایک نسخہ رام پور بھیجا تھا۔ وہ تو سلامت رہا۔ اور اس کی نقلوں سے ۱۸۶۱ء میں موجودہ اُردو دیوان تیار ہُوا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اگر مرزا نے اس کی نقل بھیجنے کے بعد کوئی اُردو اشعار لکھے[1] تو وہ اس میں موجود نہ ہوں گے۔ اسی طرح کئی فارسی خطوط اور شاید اشعار بھی ضائع ہوئے ہوں گے۔ مرزا ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں۔ "پنج آہنگ" نامکمل ہے۔ اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں"۔

---

[1] دیوان کے آخر میں نواب ضیاء الدین کی جو تقریظ ہے۔ اس میں دیوان کا سالِ ترتیب ۱۸۵۵ء دیا ہے۔ اور اشعار کی تعداد ۱۰۷۵۔ لیکن فی الواقع قلمی نسخہ رام پور میں اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور غالباً اسکی سو جہ یہ ہے۔ کہ ترتیب دیوان کے بعد مرزا نے جو اشعار لکھے۔ وہ قلمی نسخہ میں شامل کر لئے گئے۔ لیکن تقریظ کی عبارت نہ بدلی گئی +

مندرجہ بالا واقعات تو دستنبو سے ماخوذ ہیں۔ لیکن مرزا نے اُردو رقعات میں اپنے باقی دوستوں پر اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ گزری اس کی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے اور چونکہ مرزا کے یہ دوست ایوانِ ادب کے شاندار ستون بھی تھے۔ ہم ان کے حالات مرزا کے خطوط سے انتخاب کر کے درج کرتے ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کو غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہوا تھا۔ وہ معزز جاگیر دار اور اُردو فارسی کے با کمال شاعر تھے۔ اور اردو شعرا کا جو تذکرہ فارسی زبان میں اُنھوں نے گلشنِ بے خار کے نام سے لکھا تھا اس کے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے۔ آبِ حیات کی شہرتِ عامہ اسے حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں۔ اور جب اس تذکرہ میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی جس کا گارسن دتاسی بہت مداح تھا۔ دیکھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حالی کیوں کہتا تھا۔ کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے۔ اور میری تحریر کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ۔ مرزا نواب کی نثر اور شاعری اور مذاقِ شعر کے مداح تھے۔ اس کے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کی تھیں۔ وہ کبھی بھولی نہ ہوئیں۔ چنانچہ ان کی مصیبت دل پر گہرا زخم تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مصطفیٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں"۔

جب نواب کی اپیل کامیاب ہوئی۔ اور وہ رہا ہو گئے تو مرزا اپنی بے دست و پائی کے باوجود

"بجز استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" میرٹھ گئے۔ اُن سے ملے۔ اور چار دن قیام کے بعد واپس آئے +

مُفتی صدر دین مولٰینا مفتی صدرالدین آزردہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ غدر سے پہلے دہلی میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اس کے بلا جود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ رُوبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لیفٹننٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں" +

مولوی فضل حق خیرآبادی سب سے زیادہ حسرت ناک انجام مولوی فضل حق خیرآبادی کا ہُوا جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت کے اس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں۔ کہ اُنہوں نے غالب کو بیدل کی تقلید سے روکا۔ اور اس کی شاعری کے لئے ایک "اُستادِ کامل" ثابت ہُوئے۔ جو بقول میر تقی میر مرزا کی شاعری کی نشو ونما کے لئے ضروری تھا۔ غالباً انہیں کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک اُردو خط میں لکھا ہے:۔

"مولٰینا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہُوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس رہا بلکہ تاکید ہُوئی۔ کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

مولٰینا دہلی سے جلاوطن ہوگئے۔ لیکن مرزا کے دل سے فراموش نہیں ہُوئے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

"ہاں خاں صاحب۔ آپ جو کلکتے پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو۔ تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو۔ کہ اُس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ کس طرح گذارا ہوتا ہے"

داستانِ تاریخ اُردو میں لکھا ہے۔ کہ مولینا کے فرزندِ ثانی اور منشی غلام غوث بیخبر کی کوششوں سے رہائی کا حکم صادر ہُوا تھا۔ لیکن جس وقت پروانۂ آزادی رنگون پہنچا۔ اُس وقت مولینا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ اور رنگون میں سپردِ خاک ہُوئے "

مولینا فضل حق خیر آبادی، جو ایک مشہور فاضل، مولوی فضل امام خیر آبادی کے صاحبزادے اور ایک نامور عالم، مولینا عبدالحق خیر آبادی کے والد تھے۔ قدیم طرز کے علما میں خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ مرزا غالب کے بالکل ہم عمر تھے۔ لیکن بلا کے ذہین اور قابل تھے۔ اس لئے چھوٹی عمر میں ہی بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ تذکرہ غوثیہ میں ان کی نسبت ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کے علمی تبحّر کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ مولوی فضل حق نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے قصیدہ پر کہا۔ اور مولینا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں لائے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے۔ جناب مولوی فضل امام صاحب نے فرمایا۔ کہ بس حدِ ادب۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علمِ تفسیر و حدیث تو ہے نہیں۔ فنِ شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ کہ برخوردار تو سچ کہتا ہے۔ مجھ کو سہو ہوا تھا"

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف نے بھی ان کی ذہنی قوتوں، اور بہ یک وقت ایک سے زیادہ چیزوں کو دھیان میں رکھنے کی قابلیت کی ایک دلچسپ مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ جب

انہوں نے ۱۲۶۴ھ میں مولینا کو دیکھا۔ تو وہ اس وقت شطرنج میں مشغول تھے۔ اور ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو اُفق المبین کا سبق دے رہے تھے۔ اور کتاب کے مطالب بڑے حسن بیان کے ساتھ اس کے ذہن نشین کر رہے تھے۔

مولینا کی قابلیت اور قوتِ تحریر و تقریر میں کلام نہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ اس کے زور پر ایسے خیالات و عقائد کو آب و تاب دینے کی کوشش کرتے۔ جو حقیقت میں ضعیف اور بے بنیاد ہوتے۔ اس کی ایک مثال ان کی وہ بحث تھی۔ جو انہوں نے امتناعِ خاتم النبیین کے متعلق مولینا اسمٰعیل شہید سے شروع کر دی تھی۔ مولینا نے تقویت الایمان کی تیسری فصل میں عقیدۂ توحید کی توضیح کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ خدائے تعالےٰ کی تو وہ شان ہے کہ "اگر وہ چاہے۔ تو ایک آن میں ایک حکم کن سے کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتے، جبرئیل اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے"۔ مولینا فضل حق کو یہ اظہار رائے بے ادبی پر مشتمل معلوم ہوا۔ اور انہوں نے اس کے جواب میں ایک رسالہ لکھا۔ جس میں مختلف عقلی اور نقلی دلائل دے کر ثابت کرنا چاہا کہ چونکہ رسول اکرمؐ خاتم النبیین تھے۔ خدا اُن جیسا پیدا نہیں کر سکتا۔ مولینا نے اپنے خیالات کی تائید میں مرزا غالب سے بھی مدد لی۔ اور ان سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی۔ جس میں مولینا اسمٰعیل کے خیالات کی تردید کی گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اس مثنوی میں مرزا نے امتناع النظیر خاتم النبیین کے مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ مولینا فضل حق سے زیادہ مولینا شہیدؒ کی ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن جب مولینا نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ تو مرزا نے چند اشعار کا اضافہ کر کے مولینا کے نقطۂ نظر کو نظم کر دیا۔

مولینا فضل حق اور مرزا کے درمیان جو قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط سے بھی ان کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

مولینا بھی مرزا کے سچے دوست بلکہ محسن تھے۔ آبِ حیات اور یادگارِ غالب سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا ابتدائی طرزِ شاعری ترک کروانے میں سب سے زیادہ دخل مولینا فضل حق کو ہے۔ اس صحیح راہنمائی کے علاوہ مولینا مرزا کی اقتصادی مشکلات حل کرنے میں بھی کوشاں رہتے۔ غدر کے بعد مرزا کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا رامپور کا دربار تھا۔ اور اس دربار کے ساتھ مرزا کے تعلقات وابستہ کرنے میں جو دخل مولینا فضل حق کی کوششوں کو تھا۔ اس پر مرزا کی اپنی تصانیف گواہ ہیں +

ظاہر ہے۔ کہ جب ایسے دلی دوست اور حقیقی بہی خواہ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے۔ تو مرزا کی کیا حالت ہو گی؟

مرزا کی اپنی مصیبتیں

مرزا خود تو ان مصائب سے محفوظ رہے۔ لیکن اُن کیلئے بھی یہ وقت قیامت کی گھڑی سے کم نہ تھا۔ ایک تو اپنا مستقبل تیرہ و تاریک پھر اتنے دوستوں کا غم۔ بھائی کی موت کا صدمہ۔ اس کے علاوہ اگرچہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ان کے گھر کی کوئی چیز چھوٹی نہ گئی۔ لیکن ان کی تمام قیمتی چیزیں جو ان کی بیوی نے حفاظت کے لئے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوا دی تھیں۔ وہاں سے نکال لی گئیں۔ مرزا لکھتے ہیں۔ کہ قسمیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ پہننے اور بچھونے کے علاوہ اور کوئی چیز گھر میں نہ رہی۔ چنانچہ وہ یہی اوڑھنے پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے "بفروختن آں گستردنی و پوشیدنی جان وتن ہمی پروردم۔ گوئی کہ دیگراں نان میخورند دمن جامہ ہمے خورم" لیکن یکم جنوری ۱۸۵۸ء سے شہر میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو چکا تھا۔ اور مرزا کے ہندو شاگردوں اور دوستوں نے ان کی اس مصیبت کے وقت میں بڑی مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ آگرے سے روپے اور کپڑے بھیجتے رہے۔

شراب جو ان کے لئے نانِ خوردنی سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ مہیش داس مہیا کرتے تھے اور ان کی تنہائی میں ہیراسنگھ، شوجی رام اور بالمکند غمگساری اور خدمت گاری کے لئے حاضر رہتے تھے۔ لیکن مرزا کا ہاتھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزاد رہا تھا۔ مالی حالت اُنکی تسلی بخش نہ تھی اور چونکہ مستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اس لئے دستنبو کا آخری حصہ جسے اُنہوں نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کیا نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بنے گا۔ اور نہ ملی تو قصہ ہی پاک ہے:-

"کہن پنشن اگر بدست آید۔ نیز زنگ از آئینہ غمے نزداید و اگر فراچنگ نیامد برآبگینہ جُز سنگ نیامد"

باب ہشتم

پنشن کی بازیابی

غدر کے بعد جب مرزا کو جان کی سلامتی کا یقین ہُوا تو اُنہیں پنشن کی فکر ہُوئی۔ چنانچہ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالیشان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے۔ لیکن ۷ار مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے ستائش و مدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ مہینے بعد اکتوبر میں دستنبو چھپی۔ تو مرزا نے چند جلدیں نہایت محنت سے مجلد کروا کے دو ولایت اور چار ہندوستان میں حکام اعلےٰ کی نذر کیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب حکام کی نظر میں مقبُول ہُوئی۔ چنانچہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یو۔پی نے بہت تعریف لکھی۔ اور مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر نے خود لکھ کر کمشنر دہلی کی معرفت یہ کتاب مرزا سے منگائی۔ لیکن اس قدردانی کے باوجود حکام کا دل اُن سے صاف نہ ہُوا۔ اور جب جنوری ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں بڑا دربار ہُوا۔ اور سب درباری وہاں بُلائے گئے تو مرزا کو وہاں مدعُو نہ کیا گیا۔ جب گورنر جنرل کا کیمپ میرٹھ سے دہلی آیا۔ اور مرزا نے چیف سیکرٹری کے خیمہ میں ملاقات کے لئے اپنا ٹکٹ بھجوایا۔ تو وہاں سے جواب ملا۔ کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[۱]۔ اب

---

[۱] معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کے متعلق خیال تھا کہ غدر میں انہوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی پر سکہ لکھ تھا

(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ لارڈ کیننگ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا ؎

زسالِ نو دگر آبلے بروئے کار آمد
ہزار و ہشتصد و شست در شمار آمد

وہ بھی مع اس حکم کے واپس آیا۔ کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔[1]

مرزا کی پنشن کے متعلق شروع ۱۸۵۹ء میں حوصلہ افزا تحقیقات ہوئی تھی۔ اور انہیں ایک سو روپیہ بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب جو انہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ پنشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"۵۳ برس کا پنشن۔ نفقہ اس کا بہ تجویز لارڈ لیک وبہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی اُمید ہے۔ نہ کوئی

(بقیہ نوٹ صہ ۱۲۱)
یہ خیال غالباً غلط تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران میں غالب کے تعلقات بہادر شاہ سے منقطع نہیں ہوئے تھے۔ اور آگرہ کے اخبار آفتاب عالمتاب میں بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔

[1] یہ تمام واقعات مرزا کے اپنے خطوں سے ماخوذ ہیں۔ لطف یہ ہے۔ کہ ان کے باوجود مولینا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔ "ان (مرزا) کی غیرت وحمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے عاجزی وخوشامد کریں۔" اور ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے۔ انعامات اور اسناد ملیں .... مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جا کر اس کا منتقم اور قاہر چہرہ نہ دیکھا۔" (الہلال ۱۷ر جون ۱۹۱۴ء)

جنس رہن و بیع کے قابل ہے؟

اس زمانے میں انہوں نے مہاراجگان الور و پٹیالہ کی تعریف میں قصائد لکھے۔ اور مدد چاہی۔ لیکن جب ادھر سے کچھ نہ حاصل ہوا۔ تو انہوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ نواب یُوسف علی خاں صاحب رئیس رام پور ۱۸۵۷ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیجا کرتے تھے غدر کے بعد مرزا کی حالت بہت خراب ہوئی۔ تو اُنہوں نے نواب سے مدد کی درخواست کی چنانچہ نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ ماہانہ اُن کی مدد کے لئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مُقرر ہوگیا تھا۔ اب جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکام انگریزی کی طرف سے مندرجہ بالا جواب ملا۔ تو وہ رام پور گئے۔ وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی۔ اور مدد معاش کے متعلق وعدہ کیا۔ کہ اگر مرزا رام پور رہیں۔ تو دو سو روپے ماہوار پائیں اور اگر دہلی رہیں تو سَو۔ لیکن مرزا، عارف کے دو بچوں کو ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں وہ گھبرا گئے۔ اس لئے مرزا ڈیڑھ دو مہینے رام پور رہنے کے بعد اخیر مارچ میں دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کو خیال تھا۔ کہ نواب کی وساطت سے حکام سے صفائی ہو جائے گی۔ اسمیں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن نواب کا مرزا سے جو نیم مربیانہ تعلق تھا۔ وہ سفرِ رام پور سے اور مستحکم ہوگیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ مرزا کا دربار و خلعت موقوف ہوگیا تھا۔ اور پنشن کے بارے میں بھی حاکم دہلی نے ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ حکام بالا کی طرف سے اُن کی پنشن کے اجرا کا حکم ہوگیا[۱]

---

[۱] معلوم نہیں مولینا ابوالکلام آزاد نے کس شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ سرسید نے پنشن کی بحالی کیلئے بہت کوشش کی۔ (الہلال مورخہ ۱۷ جون ۱۹۱۴ء) لیکن یہ بیان غیر اغلب نہیں۔ حیاتِ جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۱۸۶۰ء میں نواب رام پور سے ملنے کے بعد جب مرزا واپسی پر مُراد آباد ٹھہرے۔ تو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور مرزا جب دہلی واپس پہنچے۔ تو انہیں پنشن کی جو پائی پائی باقی تھی سب ملی۔ چنانچہ ۲۶ مئی ۱۸۶۰ء کو جو خط انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔ اس میں تین برس کا زرِ مجتمعہ دو ہزار دو سو پچاس روپیہ پانے اور اس کے ادائیگی قرضہ میں خرچ ہو جانے کی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پنشن موروثی تھی۔ اس لئے وہ اب باقاعدہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات تھے۔ اُن کا درباری اعزاز اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے۔ بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت خود بخود رفع کر دی۔ چنانچہ مرزا خان بہادر منشی غلام غوث بےخبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیمِ خیام گورنری ہُوا۔ آخر روز میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ کہ "تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار" رہے۔ متحیرانہ میں نے پُوچھا۔ کہ "حضرت کیونکر" حضرت نے کہا کہ "حاکمِ حال نے ولایت سے واپس آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے ہیں اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے"۔

(بقیہ نوٹ صہ ۱۲۳)
سرسید انہیں سرائے سے اپنے مکان پہلے گئے۔ قرینِ قیاس ہے۔ کہ مرزا نے اس قیام کے دوران میں اپنے مصائب کا بیان کیا ہو۔ اور سرسید نے انہیں دُور کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہو۔ چونکہ مرزا نے بالوضاحت لکھا ہے۔ کہ پنشن کی بازیابی میں نواب رام پور کو دخل نہ تھا۔ اور انکی کوشش کے دوسرے سب ذریعے ناکام ہو چکے تھے۔ اس لئے سرسید کی مدد اور بھی قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے +

چنانچہ رابرٹ منٹگمری لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے، جن کی تعریف میں مرزا نے فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ۲۲ر مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو بلا کر انہیں خلعت عطا کیا +

دربار رام پور سے مرزا کے تعلقات

ہم نواب یوسف علی خاں صاحب اور مرزا کے تعلقات کا ضمناً ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ مرزا کے آخری ایام میں ان تعلقات کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اور انہوں نے مرزا کو فاقہ کشی کی مصیبت سے بچایا۔ اس لئے مناسب ہے۔ کہ انہیں ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے +

۱۷۹۴ء میں نواب سید غلام محمد خاں رام پور میں مسند نشین ہوئے۔ لیکن حکومتِ اودھ نے، جو ریاستِ رام پور کے معاملات میں کئی بار دخل انداز ہوئی تھی، اس کی مخالفت کی۔ اور نواب صاحب اور ان کی اولاد کو رام پور چھوڑنا پڑا۔ رام پور چھوڑنے کے بعد یہ حضرات دہلی مقیم ہوئے۔ جہاں مرزا غالب کے اس خاندان کے کئی افراد سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مرزا جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک فارسی خط میں والئے رام پور کو ان تعلقات کی یاد دلاتے ہیں۔ اور نواب صاحب کے ایک قرابت دار کی جو دہلی آکر مرزا سے نہیں ملے دبے لفظوں میں شکایت کرتے ہیں +

"ہمدریں کنج کہ مسکنِ منست شنیدہ ام۔ کہ والاشان زین العابدین خان بہادر بشہر آمدہ اند۔ نیاز مندی من با مرحوم نواب عبداللہ خاں بہادر، و مہر ورزے من با اصغر علی خاں مرحوم و محبت و خلت من با نواب عبدالرحمان خان بہادر مغفور کجا دیدہ اند و آں مدارج کے در نظر دارند کہ ایشاں را ضمیمہ میگزشت کہ گدائے گوشہ نشین را باید دید +

مرزا نے اس خط میں جن حضرات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے نواب عبداللہ خاں اور نواب عبدالرحمان خان، نواب یوسف علی خاں کے چچا تھے۔ اور سید اصغر علی خاں نواب عبداللہ خاں کے

صاحبزادے ۔ مرزا کی خوش قسمتی تھی ۔ کہ نہ صرف ان برگزیدہ حضرات سے ان کی دوستی ہوگئی بلکہ اس بکھرے ہوئے قافلے کا وہ فردِ عزیز، جو آگے چل کر رام پور میں مسند نشین ہونے والا تھا۔ ان کے حلقۂ شاگردی میں آیا ۔ نواب یوسف علی خاں ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے ۔ اور چونکہ اس وقت ان کے والد نواب محمد سعید خاں ابن نواب غلام محمد خاں، دہلی میں اقامت گزیں تھے ۔ ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ عربی انہوں نے مفتی صدر الدین آزردہ اور مولینا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی ۔ اور فارسی، مرزا غالب اور خلیفہ غیاث الدین مصنف غیاث اللغات سے ۔

نواب غلام محمد خاں اور ان کی اولاد کو رام پور چھوڑے پچاس سال نہ ہوئے ہوں گے۔ کہ سن ۱۸۴۰ء میں نواب سید احمد علی خاں والئے رام پور، نے وفات پائی ۔ اور حکومت انگلشیہ نے ان کا جانشین نواب غلام محمد خاں کے صاحبزادے نواب محمد سعید خاں کو منتخب کیا۔ اس موقع پر نواب صاحب کے بھائی اور مرزا کے قدیمی دوست نواب عبداللہ خاں نے مرزا سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ لیکن یا تو مرزا ابھی تک شاہانِ دہلی و اودھ اور حکام انگریزی کے علاوہ کسی دوسرے کی تعریف میں مدحیہ قصیدہ لکھنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ یا ان دنوں کسی خاص پریشانی میں مبتلا تھے ۔ انہوں نے یہ لکھ کر کہ میں زندہ نہیں ہوں مُردہ ہوں ۔ اپنی پریشان خیالی کا عذر کیا ۔ اور مدح گوئی سے معذرت چاہی ۔

نواب یوسف علیخاں فردوس مکاں

نواب سید محمد سعید خان نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی اور ان کی جگہ نواب سید محمد یوسف علی خاں تخت نشیں ہوئے ۔ مرزا نے اس موقع پر ایک مختصر سا قطعہ "تاریخ جلوس" اپنے قدیمی شاگرد کی خدمت میں ارسال کیا ۔ لیکن اس کا رام پور سے کوئی جواب نہ گیا ۔ اور پرانے تعلقات کی تجدید نہ ہوئی ۔ اس کے دو سال بعد مولینا فضل حق نے جو ان دنوں رام پور میں مقیم تھے ۔ سلسلہ جنبانی کی ۔

اور جیسا کہ ہم باب ششم میں بیان کر چکے ہیں۔ نواب صاحب فنِ شعر گوئی میں مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے +

نواب صاحب کے مرزا پر جو جلیل القدر احسانات ہیں ' انہیں ہر شخص جسے مرزا کے حالات سے ذرا بھی دلچسپی ہے ' جانتا ہے۔ در بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ غالب کو تمام عمر نواب فردوس مکاں سے۔ زیادہ فیاض محسن اور عالی حوصلہ مربی میسر نہیں آیا۔ انہوں نے غالب کی اس زمانے میں دستگیری کی۔ جب اُس کے خلاف بزشاہِ دہلی کی مدح گوئی اور اعانت باغیان کے شبہے ابھی باقی تھے۔ اور جب اُس کی علانیہ طرفداری ایک والیٔ ریاست کے لئے خلافِ مصلحت تھی۔ اخیر ۱۸۵۹ء میں جب مرزا سخت مایوسی کی حالت میں تھے۔ نواب صاحب انہیں لکھتے ہیں:-

"مشفقا! ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذیشان سے تذکارِ محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فضل اور قدردانی سرکار دولتمد سے یقین واثق ہے۔ کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں' پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اوسی مُطابق ظہور میں آوے گا"+

نواب صاحب کی مدد محض اخلاقی نہ تھی۔ عملی تھی۔ اس زمانے میں مرزا کی پنشن بند تھی۔ اور آمدنی کے تمام ذرائع سراسر مفقود تھے۔ لیکن نواب صاحب نے کئی مرتبہ دو سو ڈھائی سو روپے نقد ارسال کئے۔ جب ان سے بھی مرزا کی ضروریات پُوری نہ ہوئیں۔ اور اُنہوں نے مُستقل تنخواہ کے لئے لکھا۔ تو نواب صاحب نے فوراً ایک معقول رقم بطور ماہوار مشاہرہ کے مقرر کردی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی خاص ضرورت ہوتی۔ تو مرزا بے تکلفی سے مانگ لیا کرتے تھے۔ اور شاذ و نادر ہی ان فرمائشوں کی تعمیل میں کوتاہی ہوتی۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"آداب نیازبجا کر عرض کرتا ہوں۔ کہ سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہوگیا۔ اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں۔ تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجئیگا تو جلا بجھئیگا۔ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیہ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حد ادب۔"

نواب صاحب نے فوراً جواب لکھا:۔

"مشفقا! بپاس ارقام سامی کے، کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دو سو روپیہ کی سوائے مشاہرۂ معینہ معطوف رقیمۃ الوداد ہذا کے مرسل ہے۔ اور چشمداشت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے۔ کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔"

نواب فردوس مکاں نے جس خسروانہ پیمانے پر غالب پروری کی۔ اس کی تعریف نہ کرنا گناہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل ستائش امر یہ ہے۔ کہ اس فراوانئ عنایات کے باوجود اُنہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی۔ جس سے شاعر کے عزِّ نفس کو صدمہ پہنچے۔ اور اسے اپنی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہو۔ آج اقلیمِ شعر و سخن میں جو بلند مرتبہ غالب کا ہے یقیناً ناظم کا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ دیسی ریاستوں میں رؤسا کے حاشیہ نشین آئین درد ابات اور حفظِ مراتب کی آڑ میں ایک ایسا نظامِ عمل قائم کر لیتے ہیں۔ جس کی پابندی خوددار ہستیوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ اور جس کے تحت رؤسا کی فیاضیوں سے وہی لوگ حصۂ وافر پاتے ہیں۔ جو اہلِ کمال ہوں یا نہ، لیکن "فنِ گداگری" میں دسترس رکھتے ہوں۔ آئین و اسلوب کی یہی اُلجھنیں تھیں۔ جنہوں نے ۱۸۲۷ء میں مرزا غالب اور نائب والیٔ اودھ کی ملاقات

نہ ہونے دی ۔ اور اس کے نصف صدی بعد حضور نظام سابق کو سر سید احمد خاںؒ کی ملاقات سے محروم رکھا ۔ لیکن ہزار آفرین ہے ۔ نواب یوسف علی خاں کی عالی حوصلگی اور ادب نوازی پر کہ باوجودیکہ غالب ان کا تنخواہ دار ملازم تھا ۔ اُنہوں نے ہمیشہ اس سے برابری کا سلوک کیا ۔ اور اسے کسی ایسی بات پر مجبُور نہ کیا ۔ جس سے اس کی غیرت اور خودداری مجرُوح ہو ۔ مرزا جس بے تکلفی سے نواب صاحب کو مخاطب کیا کرتے تھے ۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا خط سے ہو سکتا ہے ۔ اس کے بعد جب 'مرزا' نواب کی بار بار کی دعوتوں کے بعد رام پُور گئے ہیں ۔ تو وہاں بھی انہیں نذر یا اس طرح کی دوسری الجھنوں سے پریشان نہیں کیا گیا ۔ نواب صاحب ان سے بالکل دوستوں کی طرح ملے ہیں ۔ مرزا اپنی تنخواہ کا ذکر کر کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"نواب صاحب دوستانہ وشاگردانہ دیتے ہیں ۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے ۔ وہ صورت ملاقات کی ہے ۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی ۔ اور بس"

نواب صاحب مرزا سے جو دوستانہ برتاؤ کرتے تھے ۔ اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہو سکتا ہے جو نواب فردوس مکاں نے مرزا کو تعین تنخواہ کے وقت لکھا :۔

"سامی صحیفۂ تلطف آگیں مورخہ دسویں اس مہینے جولائی سنہ حال کا بیچ عین انتظار کے غازہ آرائے چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہُوا ۔ اور اوپر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا ۔ اور ان غزلوں کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہُوئی ۔ اور بہ نظر آپ کی زیر باری کے اس مہینہ جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا ۔ اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا ۔ ہر مہینے مقررہ تنخواہ پہنچے گی ۔ یقین ہے ۔ کہ آپ بھی مشمول کمالِ محبت میں فرمائیں گے ۔"

نواب صاحب کی کرمفرمائی اور فیاضی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اگرچہ ایک لحاظ سے ماہوار تنخواہ حقِ شاگردی ادا کرنے کے لئے تھی۔ لیکن باوجودیکہ مرزا نے ضعفِ پیری کی بنا پر اصلاحِ اشعار سے معذرت چاہی، اور بقول مولوی امتیاز علی عرشی اکتوبر ۱۸۶۳ء کے بعد انہوں نے بہت کم اشعار کو اصلاح دی، لیکن ان کا وظیفہ انہیں باقاعدہ ملتا رہا مرزا خود ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے۔ اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدماتِ سابقہ میں تصور کیجئے۔ تو میں سِکھ نمبر[1] سہی۔ ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہو تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔"

مرزا نے اپنے کئی خطوں میں نواب صاحب سے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ نواب خلد آشیاں مرزا کو اپنا مخلص اور خیرخواہ دوست سمجھتے تھے۔ مکاتیبِ غالب کے ایک خط سے خیال ہوتا ہے۔ کہ غدر کے آغاز میں مرزا اور نواب کے درمیان خفیہ خط و کتابت ہوتی تھی۔ اور غالباً اس موقع پر مرزا نے انہیں دربارِ دہلی کے متعلق صحیح اور

---

[1] یعنی سِک نمبر (Sick Number) مرزا کے خطوط میں انگریزی الفاظ کی تعداد خاصی ہے۔ بعض تو فقط شوخی سے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ مرزا کو اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے اس طرح گریز نہ تھا۔ جس طرح حال کے بعض انشا پردازوں کو ہے۔

قابلِ اعتماد واقفیت بہم پہنچائی ہوگی۔ منشی امتیاز علی عرشی مکاتیب غالب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"مرزا صاحب کے جدید رشتۂ اُستادی کے قیام پر چند ماہ گزرے تھے۔ کہ غدر ۱۸۵۷ء کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے جو ان کی حسب ہدایت چاک کر دیئے گئے۔ اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ ان تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ جب آتشِ غدر بھڑک اُٹھی۔ اور نواب فردوس مکان کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ اپنا رویہ متعین کریں۔ تو انہوں نے انتہائی ہوشمندانہ طریقِ کار اختیار کیا ....

یہ رویہ جسے مرزا صاحب نے "پیامِ خشک" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک حالات کا صحیح علم اور ان کے پیدا ہونے کے واقعی اسباب قبل از وقت نہ معلوم ہو چکے ہوں۔"

جب نواب یوسف علی خاں مرزا کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت تک انہیں شعر گوئی سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ مرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کہ مجھے ابھی تک ایک مصرعہ موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ناظم تخلص بھی غالب کا تجویز کردہ تھا۔ نواب صاحب نے پہلی غزل میں یوسف تخلص استعمال کیا تھا۔ لیکن مرزا نے انہیں لکھا "میں نہیں چاہتا۔ کہ آپ کا اسم سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم۔ عالی۔ انور۔ شوکت۔ نیساں۔ ان میں سے جو پسند آئے رہنے دیجئے۔" نواب صاحب کا ایک مختصر سا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور لوگوں کا خیال ہے۔ کہ جس طرح کلیاتِ ظفر میں ذوق کا بہت سا کلام شامل ہے۔ دیوانِ ناظم میں بھی غالب کے نتائجِ فکر موجود ہیں۔ النّاظر کی ایک اشاعت میں لکھا تھا:-

"البتہ اگر نواب یوسف خاں ناظم کے دیوان سے وہ اشعار کسی صورت علیحدہ کئے جا سکیں

جو مرزا نے لکھکر اپنے شاگرد کو ہبہ کر دئے تھے۔ تو ادب اُردو میں ایک بیش قدر اضافہ ممکن ہے"۔

ہم نے یہ روایت کئی لوگوں سے سُنی ہے۔ کسی کے پاس کوئی قابلِ وقعت ثبوت نہیں لیکن غالب کے ایک خط سے جو مکاتیبِ غالب میں شائع ہُوا ہے۔ خیال ہوتا ہے۔ کہ نواب صاحب کے اشعار کی اصلاح لفظوں کی تبدیلی اور معمولی حک و اضافہ تک محدُود نہ تھی۔ نواب صاحب کے ایک خط کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:۔

"حضور نے یہ تحریر فرمایا ہے۔ کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے۔ اگلی غزلوں کی طرح نہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی اور اون اشعار میں کلام خوش نہ تھا۔ حضرت کا تو اون غزلوں میں بھی وہ کلام ہے۔ کہ شاید اوروں کے دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہیں نکلے گا۔ میں بقدر اپنے فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کروں گا"۔

ہم نے دیوانِ ناظم دیکھا ہے۔ اور اس میں سے چند اشعار بھی پیش کریں گے لیکن اس میں غالب کے طرز کے اشعار تھوڑے ہیں۔ اور ایسی غزل شاید ہی کوئی ہو۔ جو دیوانِ غالب کے عام معیار کے مطابق ہو۔ ویسے اگر نواب فردوس مکان کا اپنا مرتبہ بحیثیت ایک شاعر کے نہ بھی مانا جائے۔ تب بھی ان کی ذات ستودہ صفات میں ایسی خُوبیاں موجود تھیں۔ جو انہیں اپنے تمام ہمعصر والیانِ ریاست سے ممتاز کرتی ہیں۔ اور ہمارے نزدیک تو ان کی شاعری فقط شاعر پروری کا ایک بہانہ تھی![1]

دیوانِ ناظم میں معمولی اشعار زیادہ ہیں۔ لیکن آخر اس کلام کو غالب نے اصلاح دی ہے اور بڑی محنت سے اصلاح دی ہوگی۔ بعض اشعار میں غالب کا رنگ جھلکتا ہے ؎

---

[1] مرزا خود لکھتے ہیں۔ "مخمس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔ یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کیا ہے" خطوطِ غالب صہ ۲۰۰

اے گُل بہ تو خُرسندم، تو بُوئے کسے داری!

اس لئے ہم چند ایسے منتخب اشعار جن میں غالب کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتے ہیں ؎

میں نے کہا کہ دعوائے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیرِ آہ و زاری شبہائے تار جھوٹ
آوازہ قبولِ دعائے سحر غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ بنجالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ہاں سینہ سے نمائشِ داغ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے ترادشِ خونِ جگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازئ ذوقِ نظر غلط

چند اشعار میں غالب کی "شوخئ اندیشہ" صاف نمایاں ہے۔ اور انہیں پڑھ کر دیوانِ غالب کے بعض اشعار یاد آتے ہیں ؎

رخصتِ عرضِ حال کیا مانگوں
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ رخصت ہو!

دیکھنا شوخی کہ میرا پُوچھتے پھرتے ہیں گھر
سُن لیا ہے یہ کہ اس کو کچھ نہیں گھر سے غرض

سچے ہیں اپنے وعدہ کے آتے وہ خواب میں
ناظم مجھی کو نیند نہ آئی تمام رات

وہ گھر کو دیکھنے آتے ہیں ناظم
نہ کیوں بیٹھا رہا میں گھر لٹا کر

واں قافلہ منزل پہ بھی پہنچا مگر اب تک
ہم کہتے ہیں صحرا میں بآوازِ درا رقص

ایک شعر خاص غالب کے رنگ میں ہے ؎

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

ایک پُر لطف شعر رشک کے مضمون میں ہے ؎

کس کس کا کروں رشک کہ اس راہ گذر میں ہر ذرہ مجھے دیدۂ بینا نظر آیا

بعض اور پاکیزہ اور پُر لطف اشعار ہیں ؎

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو مجھ کو کیوں پوچھو کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں، دن کیونکر گزرتے ہیں

جس کو منظور ہو عالم کا پریشاں رکھنا اس کو کیا کام پڑا ہے، کہ سنوارے گیسو

مرزا اور نواب یوسف علی خاں کے مخلصانہ تعلقات کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جائے تعجب نہیں کہ جب نواب صاحب اخیر ۱۸۶۴ء میں بعارضۂ سرطان بیمار ہوئے۔ تو مرزا کو بے حد فکر لاحق ہُوا۔ وہ خود نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"جب سے حضرت کی ناسازیِ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہُوا ہے۔ عالم الغیب گواہ ہے۔ کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر پر روٹی نہیں پکی۔ ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی۔ حواس ٹھکانے لگے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا۔ کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا۔ اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھکر بھیجوں گا"

مرزا کو نواب صاحب کے غسلِ صحت کی اتنی جلدی تھی اور اتنا انتظار تھا۔ کہ ابھی اس کی تاریخ کے تعین کے متعلق انہیں کوئی پختہ اطلاع دربارِ رام پور سے ملی بھی نہیں لیکن انہوں نے ایک سُنی سُنائی افواہ کی بنا پر قطعہ تاریخِ غسلِ صحت اور قصیدۂ تہنیت[1] تاریخ غسلِ صحت سے بہت پہلے

---

[1] مطلع ہے۔ مرحبا سالِ فرخی آئین عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

رام پور بھیج دیئے۔ اِن کے بعد اُنہوں نے ایک فارسی نثر بھی نواب کی خدمت میں بھیجی۔ جس میں ستاروں اور سیاروں کی روش بنا کر لکھا تھا۔ کہ مَیں نے علمِ نجوم کے حساب سے پتہ لگایا ہے۔ کہ غسلِ صحت ایسی ساعتِ مُبارک میں ہو رہا ہے۔ کہ اس کے اثر سے آپ عرصۂ دراز تک بیماریوں سے محفوظ رہیں گے لیکن علمِ نجوم کی بے اعتباری یا مرزا کی ناواقفیت ملاحظہ ہو کہ عرصۂ دراز تک بیماریوں سے محفوظ رہنا تو درکنار نواب صاحب جشنِ صحت کے چند ہی ہفتوں بعد اور مرزا کی نثر پہنچنے سے ایک مہینے کے اندر راہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔

غدر کے بعد دہلی کی حالت

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکۂ معظمہ کا اعلانِ معافی ہو چکا تھا اور ہندوستان کی عنانِ حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا قصیدہ ؎

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلانِ معافی کی تقریب پر لکھا گیا۔ اس سے پہلے کا ہے۔ اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کیساتھ چھپ بھی چکا تھا۔ جب مرزا اس اعلان سے قطعاً بے خبر تھے۔ اس قصیدہ کے کئی اشعار پیچیدہ اور ذومعنی ہیں۔ لیکن غالباً یہ فتح کی مُبارکباد ہے۔ نہ کہ اعلانِ معافی کا شکریہ۔

اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہُوا۔ اور اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہُوا لیکن اگرچہ سوائے ان لوگوں کے جن کے خلاف خاص ثبوت تھے۔ عوام کی جاں بخشی کا حکم ہو گیا۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھرا ہُوا تھا اُسے بندھتے بہت دیر لگی۔ ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء ہی میں ہو گیا تھا۔ بعد میں کچھ مُسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کیلئے

ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔
تحریری ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہُوا۔ چنانچہ مرزا ۹ر نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ٹون ڈوٹی (Town Duty) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ر نومبر سے جاری ہوگئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بالطفانی سپرد ہُوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں ہے۔ کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا ازدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکانِ مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں پرسوں سے حکم ہوگیا ہے۔ کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا ہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آ رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔"

اسی سال دسمبر میں جب گورنر جنرل نے میرٹھ میں دربار کیا۔ تو "مسلمانوں کی املاک کے واگزاشت کا حکم عام ہوگیا۔ جن کو کرایہ پر ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہوگیا"۔ علاوہ ازیں مرزا ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اتنا مسموع ہُوا ہے۔ کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہُوا ہے۔ اور حکم یہ ہے۔ کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لُوٹا ہے۔ البتہ اُس کا معاوضہ دہ یک سرکار سے ہوگا۔"

دہلی کو چونکہ پنجاب کے حکام نے فتح کیا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے ہاتھ میں تھا۔ اور نئے انتظامات کے ماتحت دہلی صوبہ پنجاب کا حصہ تھی۔ لیکن اکثر اہالیانِ دہلی اس انتظام سے خوش نہ تھے۔ سرسید نے بڑے زور سے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اور مرزا بھی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا۔ کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ ویسا ہی کرے"

اسی زمانے کی عدالتی کارروائی کے متعلق یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے:۔

"سنو حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں" پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون"۔ عرض کیا کہ "میں" "اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّو ممّو مشہور ہوں"۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممّو بھی تم۔ سارا جہان بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے!"

میر مہدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے۔ انہیں غدر کے بعد دہلی کا جو نقشہ بدلا تھا۔ اس کی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اُٹھ جائیں۔ تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اُس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کٹڑہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔

راجی داس گودام والے کے مکانات ۔ صاحب رام کا باغ و حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا ۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اور اب جو کوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں ۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ بندۂ خدا "اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلی کہاں ؟ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے ۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔"

ایک اور خط میں لکھا ہے :۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے ۔ قلعہ۔ چاندنی چوک ۔ ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں ؟"

یہ خط اخیر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ۔جامع مسجد جیسے گرا دینے کے منصوبے دئے جا رہے تھے۔ابھی تک واگزاشت نہیں ہوئی۔ چنانچہ فتح دہلی کے پانچ سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کو مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"جویائے حال دہلی و الور سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہو گئی ۔ چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں ۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا ۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الہی بخش ۔ مولوی صدرالدین ۔ تفضل حسین خاں ۔ تین یہ سات اور ۔ ۷ رنومبر ۱۴ رجمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

باب نہم

سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۸۶۵ء تک

قاطع بُرہان غدر کا ہنگامہ فرو ہوئے اب کئی سال ہو چکے تھے۔ دہلی جہاں تک تبدیل حالات کے ساتھ ممکن تھا۔ اپنی پُرانی حالت پر آ رہی تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت ہر طرح مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ رام پور سے باقاعدہ سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ پنشن جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے۔ لیکن قاطع برہان کی اشاعت سے انہوں نے جو مخالفت عامہ مول لی۔ اُس نے یہ زمانہ اُن کے لئے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اوائل ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔ اور اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد شائع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا ثمر ثانوی سمجھنا چاہیئے۔ دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کے اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی۔ جس کے لئے انہوں نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب دساتیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا۔ کہ "برہانِ قاطع" میں جو معنی دئے ہیں وہ دساتیر کی عبارت پر

نہیں پھبتے۔ چنانچہ جب دستنبو ختم ہو گئی۔ اور انہیں برہان کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی۔ تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر آئیں۔ انہیں اکٹھا کر کے اُنہوں نے دس جزو کا ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ تو اب کمیاب ہے لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن درفش کاویانی کے نام سے شائع کرایا تھا۔ جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے مرزا کی آزاد قوتِ فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرح مولٰنا اسمٰعیل شہیدؒ نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو اُبھارا تھا۔ مرزا بھی رائے عامہ کے پابند نہ تھے۔ اور ہر ایک مسئلہ پر آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ درفش کاویانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"مرا نیز خردے و روانے دادہ اند۔ فراز آوردہ (یعنی نتائج) اندیشہ بیگانگاں را چوں بہ پذیرم و از نیروئے خرد خداداد کار چرا نگیرم۔"

وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بہ نظرِ تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولٰنا اسمٰعیل کی طرح اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ سب حق ہے۔ کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے۔"

ظاہر ہے۔ کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے۔ سب درست ہے یہ صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اس کے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فنِ لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے برہان قاطع پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً

مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دیئے جائیں۔ تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ درست ہے۔ اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنفِ برہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعرا نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لئے تھے۔ انہیں بھی مصنف نے علیحدہ لغت کے طور پر درج کیا تھا۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں:۔

"افزودن شمارۂ لغات بہر صورت ہیش نہاد۔۔۔۔ چنانکہ کمال اسمٰعیل را خلاق المعانی لقب است۔ اگر ایں بزرگوار را خلاق الالفاظ خوانند چہ عجب است"

ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا۔ وہ وجہ اس کی یہ دیتے تھے:۔

"جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں مشہور، وغیر مشہور۔ کچھ کم سو رسالے ہونگے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذہ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بمناسبتِ مقام ان لغات کے معنی لکھدئے استنباط معنی کا مدار قیاس پر" مرزا کہتے تھے۔ کہ ایسی فرہنگیں بے وقعت ہیں۔ جو اہلِ زبان کہیں۔ صحیح ہے۔ حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ آخر اساتذہ شعرا بھی تو بیشتر اہل زبان ہیں۔ اور اہلِ زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائینگے۔ انہیں اساتذہ کے کلام پر ٹھیک بیٹھنا بھی ضروری ہوگا۔ اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دئیے ہوئے معانی میں فرق نہ ہوگا۔

قاطع برہان کی مخالفت | قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اور جلد ہی اس کی

مخالفت میں کتابیں شائع ہونی شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے جو کتاب شائع ہوئی۔ غالباً سید سعادت علی سابق میر منشی راجپوتانہ ریذیڈنسی کی محرق قاطع تھی۔ مرزا اس کی نسبت تیغ تیز میں لکھتے ہیں:-

"ایک مردِ بے مغز معوج الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش (قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی۔ اور چھپوائی۔ اور محرق قاطع اس کا نام رکھا"

ایک اردو خط میں منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا ہے:-

"اہاہا محرق قاطع کا نسخہ تمہارے پاس پہنچا ع

کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم

مَیں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے۔ دو طالب علموں نے اردو میں دو رسالے جُدا جُدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے۔ کہ مؤلف اس کا احمق ہے۔ اور جب وہ احمق دافع ہذیان سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھکر متنبہ نہ ہوا۔ اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے"۔

محرق کی مخالفت اور قاطع برہان کی حمائت میں جن تین کتابوں کا ذکر مرزا نے مندرجہ بالا خط میں کیا ہے۔ ان میں سے دافع ہذیان فارسی میں ہے۔ یہ مولوی نجف علی کی تصنیف ہے۔ مولوی صاحب کی مرزا سے ملاقات نہ تھی۔ فقط اتفاق رائے کی وجہ سے انہوں نے مرزا کی حمائت کی۔ مرزا ایک خط میں مولوی نجف علی کی نسبت میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:-

"واللہ اگر کبھی مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں۔ یا مَیں نے اون کو دیکھا ہے، چہ جائے اختلاط دارتبط! صرف بہ رعائت جانب حق چند کلمات انہوں نے لکھا"

جب مرزا نے یہ خط لکھا۔ اس وقت تک محرق کی تردید میں دافع ہذیان اور سوالات عبد الکریم لکھے جا چکے تھے۔ لیکن مرزا چاہتے تھے۔ کہ اردو میں کوئی رسالہ شائع ہو جائے۔ جس میں محرق کی غلطیاں اور جامع محرق کی کوتاہیاں پورے طور پر ظاہر ہوں۔ چنانچہ انہوں نے میر غلام حسنین قدر بلگرامی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ عام طور پر ان کے خط قدر کے نام رسمی ہوتے تھے۔ اور "بندہ پرور" "سید صاحب"۔ "مشفق میرے" اور اسی طرح کے دوسرے رسمی القاب سے شروع ہوتے تھے۔ اب انہوں نے میر صاحب کو ایک بڑا دوستانہ خط لکھا۔ اور اپنی ادبی جنگ میں مدد چاہی۔ خط کا آغاز تھا۔ "قرۃ العین میر غلام حسنین، سلکم اللہ تعالےٰ" اس میں یہ لکھ کر کہ مولوی نجف علی نے بغیر کسی ملاقات اور بغیر کسی حق کے میری حمایت کی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:۔

"تم میرے یار ہو۔ اور میری خدمت گذاری کے حقوق ہیں تم پر، مجھ کو مدد دو اور اپنی قوتِ علمی صرف کرو۔ محرق قاطع برہان میرے پاس موجود ہے۔ مجھ سے منگاؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور زلت مولف کا اشارہ کردوں گا۔۔۔۔۔۔ تمہارے پاس دو نسخے ایک دافع ہذیان۔ ایک سوالات عبد الکریم مع استفتاد افتائے دستخطی علمائے دہلی موجود ہیں۔ اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سود مند پہنچیں گے۔ تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا۔۔۔۔ محرق اور صاحب محرق کا خاکہ اُوڑ جائے گا۔"[1]

لیکن مرزا کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور قدر نے محرق کا جواب نہ لکھا۔ چنانچہ مرزا نے دوسری سمت نظر دوڑائی۔ اور بالآخر لطائف غیبی میاں الہ داد خاں کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ۴۴ صفحے کا رسالہ ہے کتاب کے باہر میاں الہ داد خاں سیاح کا نام بطور مصنف کے لکھا ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع یہ غالب کی تصنیف ہے۔ اور شروع سے ہی سب کو معلوم تھا۔

---

[1] خطوطِ غالب صر ۱۹۶ - ۱۹۷

کہ یہ کتاب مرزا نے خود لکھی ہے۔ مولینا حالی غالب کی اُردو نثر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں۔ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے طرف داروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائفِ غیبی تیغ تیز اور نامۂ غالب۔"

مرزا کے خطوط پڑھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف اُنہوں لطائفِ غیبی خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات اخباروں میں چھپوائے تھے۔ اور سیاح کو اس کی اطلاع اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی! مرزا ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

"ایک نئی بات سُنو محمد مرزا خاں میرے سبھی بھائی کا نواسی ہے۔ اُس نے ایک اخبار نکلا ہے۔ اشرف الاخبار۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لوگے۔ کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔"

دافع ہذیان کے بعد جو کتاب قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی۔ مرزا رحیم بیگ کی ساطع برہان تھی۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک طویل اُردو خط مصنف کے نام لکھا۔ جو اس زمانے میں نامۂ غالب کے نام سے چھپا تھا۔ اور اب عودِ ہندی (مطبوعہ لاہور) میں شائع ہو گیا ہے۔ اس میں بدلائل و براہین مکتوب الیہ کے اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

تیسری کتاب میاں امین الدین کی قاطع القاطع (۱۸۶۶ء) تھی۔ یہ کتاب اِس طرح فحش و دشنام اور غلیظ کنایوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہ مرزا نے اس کے مؤلف کے خلاف

ہتکِ عزت کی بنا پر نالش کی۔ مقدمہ آغاز ۱۸۶۸ء میں اسسٹنٹ کمشنر دہلی کی عدالت میں پیش ہُوا۔ غالب کی طرف سے لالہ پیارے لال آشوب۔ حکیم لطیف حسین۔ مولوی نصیر الدین اور لالہ حکم چند بطور گواہ پیش ہُوئے۔ اور فریقِ مخالف کی طرف سے مولوی ضیاء الدین اور مولوی سدید الدین اور دُوسرے علما گواہ تھے۔ بحث ساری یہ تھی۔ کہ میاں امین الدین نے مرزا کے متعلق جو فقرے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ اور اشارے کنائے استعمال کئے ہیں۔ ان سے فحش و دُشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ مولوی ضیاء الدین اور کئی دوسرے رحم دلوں نے مُلزم کو سزا سے بچانے کے لیے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے۔ جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ جب مرزا نے یہ دیکھا۔ کہ ان ترجمانیوں کی وجہ سے مقدمے میں کامیابی مشکل ہے۔ تو اُنہوں نے راضی نامہ داخل کر کے مقدمہ[۱] واپس لے لیا۔

قاطع برہان کے خلاف اور برہان کے حق میں سب سے مفصل کتاب مرزا احمد علی نے لکھی۔ جو مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح کیا کرتے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ تیغِ تیز کے نام سے شائع کیا۔ جس میں قاطع برہان کے مخالفوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور مؤید برہان کے اعتراضوں کے جواب دئے ہیں۔ اس میں وہ مرزا احمد علی کی نسبت لکھتے ہیں:

"عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کم، جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحبِ عزّ و شان ہے عالی خاندان ہے۔ امرائے ہند، رؤسائے ہند، مہاراجگانِ ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگانِ

[۱] اس مقدمہ کی مکمل روئداد رسالہ اُردو کی اشاعت اپریل ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے ۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ کا خطاب ہے ۔ گورنمنٹ کے دفتر میں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب ہے ۔ جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سٹری اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں ۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے ضرب الغلام اہانت المولےٰ گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے ۔ میرا کیا بگڑا؟ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا میں نے معلم "امین بے دین" کو شیطان کے حوالے کیا ۔ اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا ۔ اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا"

تیغِ تیز کے علاوہ مرزا نے اکتیس شعر کا ایک فارسی قطعہ مولوی احمد علی کے نام لکھ کر بھیجا جس میں ان کی کتاب پر بڑے پُر اثر طریقے میں نکتہ چینی کی ہے ۔ مولوی صاحب ڈھاکہ کے باشندے تھے ۔ لیکن ایرانی النسل ہونے کے دعویدار تھے ۔ مرزا اس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ہر کہ بینی با زبانِ مولدِ خود آشنا است　　سازِ نطقِ موطنِ اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود　　خانقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

آگے چل کر جو شوخ فقرے انہوں نے خود صاحبِ برہان کی نسبت لکھے تھے ۔ ان کی بڑے لطف سے توضیح کی ہے ۔ اور مولوی صاحب کی بدکلامی کی شکایت کی ہے ؎

صاحبِ علم و ادب دانگہ ز افراطِ غضب　　چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد ولے　　ننگ دارد علم زاں کارے کہ خواجہ کردہ است
انتقامِ جامعِ "برہانِ قاطع" مے کشد　　آنچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت　　وائے بر وے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام　　شوخیٔ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است!

قاطع برُہان کی اشاعت پر جو تلخ بحث شروع ہو گئی تھی ۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا

اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔ فی الحقیقت مبحث ہی ایسا تھا۔ کہ اس میں اختلاف رائے کی گنجائش تھی۔ اور پھر مرزا کا اختلاف فقط صاحبِ بُرہانِ قاطع سے نہ تھا۔ وہ کسی بھی ہندوستانی فرہنگ نویس کے قائل نہ تھے اور جو لوگ ان فرہنگ نویسوں کو اپنا قبلہ اور امام بنائے ہوئے تھے۔ ان کی طرف سے مرزا کی مخالفت ایک امر لابُد تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ ایک علمی بحث اس قدر پست سطح پر جاری رکھی گئی۔ اس کی وجہ ایک حد تک مرزا کا طرزِ تحریر تھا۔ ان کی کتاب قاطع برہان صاف اور موثر زبان میں لکھی گئی ہے۔ لیکن طرزِ تحریر ضرورت سے زیادہ شوخ ہے۔ اور صاحبِ بُرہان کا جابجا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ اس سے بُرہان قاطع کے طرف دار ضرور آگ بگولا ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر برہانِ قاطع میں غلطیاں تھیں۔ تو قاطع بُرہان بھی غلطیوں سے پاک نہ تھی۔ اور مرزا کا یہ دعویٰ تو کسی طرح قابلِ قبول نہ تھا۔ کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود آغا احمد علی کو اہلِ زبان نہ سمجھا جائے۔ لیکن مرزا باوجودیکہ نہ ان کے آبا ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے۔ اہلِ زبان گنے جائیں! وہ نامۂ غالب میں لکھتے ہیں:۔

"اگر کوئی مجھ سے کہے۔ کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے۔ کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے ؎

ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند　　تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند"

اسے بھلا سوائے غالب کے معتقدین کے کوئی کیسے مانتا۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ مرزا نے ہندی نژاد فارسی نویسوں پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ اگر کوئی اہلِ زبان کرتا۔ تو لوگ اتنے برافروختہ نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ مرزا خود ہندی نژاد اور ترکی النسل تھے۔ ان کا دعوئے برتری کوئی نہیں مانتا تھا۔

مرزا نے جو فارسی قطعہ مولوی احمد علی کو لکھ کر بھیجا۔ اس میں صاحب برہان کے متعلق اپنی "درشت" گفتار اور "زشت" گوئی کا اقرار کیا ہے۔ لیکن مولینا حالی اس مسئلے کے متعلق لکھتے ہیں:
"اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسا نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی کے پرانے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں۔ ان کے لئے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا۔ کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر ظاہر کریں۔ کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔"
حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں۔ آخر اگر سرسید رسول کریمؐ کے متعلق الفنسٹن کے ناشائستہ الفاظ اپنی کتاب میں درج نہ کرتے یا اپنے عجیب و غریب مذہبی عقائد کا، جن کا آج بھی کوئی قائل نہیں، پرچار نہ کرتے۔ تو ان کی کیوں اتنی مخالفت ہوتی۔ اسی طرح اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے اور بلاوجہ تمسخر و استہزا سے کام نہ لیتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ پرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کیلئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے۔ وہ کم نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے جب ان کے کلام پر قتیل کے مرتب کردہ اصولوں کی بنا پر اعتراض ہوئے تھے۔ تو وہ اُس کا سارا شجرۂ نسب ڈھونڈ لائے تھے۔ اور اب جو انہوں نے برہان قاطع کے مصنف سے اختلاف کیا۔ تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام لیا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا کی شوخ نگاری اور میاں امین الدین کی فحش نگاری میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ اور برہان کے

بعض مداحوں نے تہذیب و شائستگی کے تمام اصول نظر انداز کر دئے۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ شوخی و تمسخر کی ابتدا اُمرا زمانے کی تھی۔

طویل علالت

غدر کے بعد ایک عرصے تک تو غالب کو پنشن، خلعت اور دربار کے غم نے پریشاں رکھا۔ اور جب ان الجھنوں سے نجات ملی۔ تو قاطع برہان کی اشاعت سے جو ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اس کی تلخی اور اذیت برسوں تک سوہانِ رُوح بنی رہی۔ لیکن غالب کی اس زمانے کی پریشانیاں انہی قضیوں تک محدود نہ تھیں۔ وہ اس زمانے میں فسادِ خون کے مرض میں مبتلا تھے۔ جس نے ان کی حالت اور بھی قابلِ رحم بنا دی تھی۔

فسادِ خون اور جلد کی بیماریاں، جب ایک دفعہ جڑ پکڑ لیں، تو وہ مہینوں نہیں برسوں تک رُو بہ اصلاح نہیں ہوتیں۔ مرزا بھی دو تین سال تک ان میں گرفتار رہے۔ وہ تین مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"چھٹا مہینہ ہے۔ کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی۔ پھوڑا پک کر پھوٹا اور پھوٹ کر ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ اُسترہ سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے افاقہ کی صورت نظر آتی ہے"۔

لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ افاقہ عارضی تھا۔ اور جب ایک پھوڑا درست ہوتا۔ تو دوسرا پھوڑا نمودار ہو جاتا۔ ۱۶ر اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے:۔

"ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروِ چراغاں ہو گیا۔ طاقت نے جواب دیدیا۔ دِن رات لیٹے رہتا ہوں"۔

ان پھوڑوں نے جو تکلیف دہ حالت پیدا کر دی تھی۔ اس کا ذکر کئی خطوں میں ہے۔ ایک خط میں

نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں :۔

"نہ تپ نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑے پر ایک زخم، ہر زخم پر ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ نبرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خورد و خواب رہا۔ اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں۔ کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی۔ دو گھڑی غافل رہا ہوں گا۔ کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اُٹھی۔ جاگ اُٹھا تڑپا کیا۔ پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا۔"

مرزا کی یہ حالت تھی۔ تو جائے تعجب نہیں۔ کہ وہ زندگی سے بیزار اور موت کے آرزومند تھے۔ وہ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"سنہ ۱۲۷۷ ہجری میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں ...... رُوح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے۔ جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، رُوح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے۔ بے مُبالغہ اور بیانِ واقع ہے ع

خرمّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم"

مرزا کی اس بیماری نے اس قدر طُول پکڑا۔ کہ بعض حلقوں میں تو ان کی وفات کی خبر مشہور ہو گئی۔ وہ فروری ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں نواب انورالدولہ کو لکھتے ہیں :۔

"آپ کی پرسش کے قربان جاؤں۔ کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا۔ میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلاً میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھا جھُوٹ! درصورتِ مرگ نیم مُردہ

اور در حالتِ حیات نیم زندہ سے

درکشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن   ایں کہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

دو تین سال مصیبتیں جھیلنے کے بعد مرزا ان بیماریوں پر غالب تو آ گئے۔ لیکن ان سے وہ کمزور بہت ہو گئے تھے۔ وہ نومبر ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں قاضی عبد الجمیل کو لکھتے ہیں :-

"اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ! اور ضعف کیونکر نہ ہو۔ برس دن سے صاحب فراش ہوں۔ ستر برس کی عمر ہے جتنا خون بدن میں تھا۔ بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کہاں جو اب پھر تولیدِ دمِ صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنونِ احسان ہوں"

عُودِ ہندی کی ترتیب

ہم اس شہرت کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو مرزا کو اطراف و اکنافِ مُلک میں بطور ایک شاعر کے حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن انکی شہرت فقط شعر کے قدر دانوں تک محدود نہ تھی۔ اُن کی اُردو نثر کے مداح بھی بہت تھے۔ خطوطِ غالب سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۱۸۵۸ء میں (رائے بہادر) منشی شیو نرائن اکبر آبادی اور منشی ہرگوپال تفتہ ان کے اُردو رقعات چھپوانا چاہتے تھے۔ لیکن مرزا نے مخالفت کی۔ اور یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس کے دو تین سال بعد ۱۸۶۱ء میں چوہدری عبد الغفور مارہروی کو خیال آیا۔ کہ مرزا کے جو خطوط ان کے نام آئے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں۔ کہ انہیں شائع کر کے خاص و عام کو ان کے پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :-

"جب کلامِ بلاغت نظام، رشکِ صائب، فخرِ طالب، جناب اسد اللہ خاں صاحب غالب کا دیکھا۔ دل کو بھایا۔ یکتا پایا۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔۔۔۔

جو نامہ کہ بنام میرے بعبارت اُردو تحریر کیا۔ مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر اور ہر سطر اوسکے سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے ...... پس تنہا ملذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اوٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مائل تمام بشہرت ہُوا۔"

چوہدری صاحب ابھی اپنا ارادہ پُورا نہ کر چکے تھے۔ کہ انہیں ان خطوط کو ایک ایسی مجلس میں پڑھنے کا اتفاق ہُوا۔ جہاں منشی ممتاز علی خاں مالک مطبع مجتبائی و رئیس میرٹھ موجود تھے۔ انہوں نے چوہدری صاحب سے کہا۔ کہ "اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں جمع کرو۔ تو میں اوسکے انطباع کا بیڑہ اوٹھاتا ہوں"۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے ان خطوط کو جمع کیا۔ اور مہر غالب اس مجموعہ کا تاریخی نام رکھا۔ لیکن ابھی طباعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ کہ منشی ممتاز علی نے سوچا۔ کہ اگر مرزا صاحب کے رقعات جو دوسروں کے نام ہیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کرلئے جائیں تو احسن ہو۔ چنانچہ انہوں نے ان رقعات کی تلاش شروع کی۔ حُسنِ اتفاق سے انہیں پتہ چلا۔ کہ خواجہ غلام غوث بیخبر مرزا کی مدد سے ان کے رقعات جمع کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے ان رقعات کو بھی حاصل کیا۔

غلام غوث بیخبر نے ۱۸۶۱ء سے خطوط جمع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اور چوہدری عبدالغفور سرور والے خط تو ان کے پاس پہلے ہی موجود تھے۔ لیکن اس مجموعہ کی طباعت و اشاعت کوئی آٹھ سال کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ مرزا جو ۱۸۶۳ء سے ہی طباعت کے منتظر تھے۔ بے قرار ہو گئے اور بیخبر کو لکھا۔

"اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چَھپے گا بالفتح یا چُھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہے۔ نوحق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجے"۔

بیخبر کا ارادہ تھا۔ کہ مجموعہ رقعات کے شروع میں مرزا کا اپنا دیباچہ ہو لیکن اُنہوں نے نہ مانا۔

اور بالآخر یہ مجموعہ مصنف کے دیباچہ کے بغیر منشی ممتاز علی خاں کو طباعت کے لئے بھیجا گیا۔ منشی صاحب نے سنبلستان اور سرور کے مجموعوں کو یکجا کیا۔ اور خود دیباچہ لکھ کر انہیں عودِ ہندی کے نام سے شائع کیا ۔

عودِ ہندی کی ترتیب ایک لحاظ سے ۱۸۶۱ء (۱۲۸۵ھ) میں شروع ہوگئی تھی کیونکہ چودھری عبدالغفور نے اپنے خطوط کا مجموعہ "مہرِ غالب" جس پہ عودِ ہندی کی بنیاد رکھی گئی اس سال جمع کر لیا تھا۔ لیکن دوسرے خطوط کے جمع ہوتے دیر لگی ۔ اور اشاعت کو تو اور بھی تاخیر ہوئی۔ بالآخر یہ مجموعہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی مرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع ہوا۔ لیکن چونکہ اس میں ۱۸۶۵ء کے بعد کا کوئی خط نہیں اس لئے خیال ہوتا ہے۔ کہ اس سال تک یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۶ء تک عودِ ہندی کی ترتیب مکمل ہوگئی ہوگی ۔

عام مقبولیت

قاطع برہان غالباً ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۸۶۶ء میں رئیس سورت نواب میر غلام بابا خاں کی مالی امداد سے شائع ہوا۔ اس امر سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے ۔ کہ مرزا کے مداح اس وقت سارے ہندوستان میں موجود تھے۔ بنگال میں میسور کے شاہی خاندان کے رکن شاہزادہ بشیر الدین ۔ اور خان بہادر عبدالغفور نساخ ۔ سورت میں نواب میر غلام بابا خاں ۔ لوہارو میں نواب لوہارو کے صاحبزادے مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالب کے شاگرد تھے ۔ بڑودہ کے رئیس نواب میر ابراہیم علی خاں غزلیں اصلاح کے لئے بھیجتے تھے ۔ اور الور کے مہاراجہ غالب کے مداح تھے ۔ الہ آباد میں خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر اگرچہ قاطع برہان کی بحث میں مرزا سے متفق نہ تھے ۔ لیکن ان کے کمالِ شاعری کے معترف تھے ۔ اسی طرح پنجاب میں ان کی دستنبو بہت مقبول ہوئی ۔ اور وہاں ان کے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی ۔ یہ صحیح ہے ۔ کہ حیدرآباد

کے آسودہ دلوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی۔ اور انہوں نے نواب مختار الملک کی تعریف میں جو نفیس قصیدہ[1] ۱۸۶۱ء میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کا انہیں کوئی صلہ نہ ملا۔ لیکن حیدر آباد کے علاوہ تمام ہندوستان میں ان کے قدردان اور مداح موجود تھے۔ اب ان کی شہرت اس قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ کہ اہلِ نظر ان کی زیارت کے لئے آتے۔ اور اس بادشاہِ اقلیمِ سخن کو خراجِ عقیدت ادا کرتے۔

ہندوستانی صوفیہ کے تذکروں میں شاید ہی کوئی کتاب تذکرہ غوثیہ سے زیادہ دلچسپ ہوگی۔ جس میں اس زمانے کے ایک اور آزاد خیال بزرگ شاہ غوث علی قلندر کے ارشادات جمع ہیں۔ شاہ صاحب بھی مرزا سے ملنے گئے تھے۔ اور چونکہ دونوں کی طبیعتیں ایک رنگ کی تھیں اس لئے جلد ہی ان میں دوستی ہو گئی۔ اور مرزا اور شاہ صاحب کی ملاقاتوں کا ذکر تذکرہ غوثیہ میں محفوظ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے تھے:۔

"ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آ کر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب! ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علے الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب! یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔ اس دن سے

---

[1] مرزا غالب، ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:۔ "میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا۔ کچھ قدردانی نہ فرمائی۔ ردِ فرقہ وہابیہ پر ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی۔ وہ محی الدولہ کو بھیجی۔ رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں۔ کہ مولوی غلام امام شہید شاگردِ قتیل وہاں کوسِ انا ولا غیری بجا رہے ہیں۔ اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔"

مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ خوار رُوسیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ اُن کے مزاج میں کمال کسرِ نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ مرزا رجب علی بیگ سُرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنو سے آئے مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب! اُردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کی کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطفِ زبان کہاں۔ ایک تُک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہُوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا۔ اور کہا کہ حضرت! یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آئیے آج اُس کے مکان پر چلیں۔ اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم اُن کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پُرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانۂ عجائب کو بغور دیکھا تو اُس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔ اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہمکو بھی بُلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت

تعریف کی ۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ اَلْمُؤمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ ؎

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کُن کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پُوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰؑ سے پھر ہم سے پُوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰؑ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے"۔

جب مرزا غالب کی وفات ہوئی، شاہ صاحب زندہ تھے۔ کسی نے آکر یہ خبر سُنائی۔ شاہ صاحب نے بڑا افسوس کیا۔ کئی حسرت بھرے شعر پڑھے اور مرزا کی نسبت کہا:۔

"نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غائت اور خلیق از حد تھے ایک روز جو ہم اُن کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے ۔

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ساقی و مغنی و شرابی و سرودے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم کنند باز کہ آں روز باز خواہِ من است

بکن مقابلہ آں را ز سرنوشتِ ازل اگر زیادہ و کم باشد آن گناہِ من است

رند مشرب بے شر رحم دل تھے اور فنِ شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے"۔

باب دہم

۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۹ء تک

نواب کلب علی خاں

ہم نواب یُوسف علی خاں سے مرزا کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں: ان کی وفات اپریل ۱۸۶۵ء میں ہُوئی۔ اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہُوئے۔ مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں سے بالکل ذاتی تھے۔ اور جو تھوڑی بہت خدمت وہ والیٔ ریاست کی کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ان کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا تھا۔ اس لئے ڈر تھا۔ کہ کہیں نئے دَور میں یہ تعلقات ختم نہ ہو جائیں۔ مرزا کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے نئے رئیس کی تخت نشینی پر تہنیت نامہ لکھا۔ اور اُس کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی درخواست کی۔ نواب خُلد آشیاں نے فوراً جواب دیا۔

"مشفقا! آنچہ مشاہرۂ آں کرمفرما از عہد نواب صاحب وقبلہ فردوس مکاں مقرر است انشا اللہ تعالٰے بدستور جاری ماندہ حسب ضابطہ بسامیٔ خدمت رسیدہ خواہد بود۔"

تہنیت نامہ کے ساتھ مرزا نے جو قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی کمزوری کا ذکر کر کے حاضر نہ ہونے کی معذرت کی تھی ؎

بہ انجمن نرسیدم زناتوانائی   ولے بعرض تمنّا و دُعانیم معذور

بخاک پائے تو گر دستگاہ داشتمے — نبودمے بغم دُورئ درِ تو صبُور
من آں کسم کہ ز افراطِ ورزشِ اخلاص — بغیبت است مرادعوئے دوامِ حضُور
تونی رحیم دل ومن سقیم، دُوری بہ — مباد رنجہ شوی از نظارۂ رنجُور
نظر بخستگی و پیری و تہیدستی — قبول کردنِ تسلیم من خوش است از دُور!

نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے وقت تو مرزا نے قصیدہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا لیکن جب انہوں نے چند ماہ بعد مسند نشینی کا باقاعدہ جشن کیا۔ تو مرزا کو رام پُور جانا پڑا۔ وہ خود کہتے ہیں:

”رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار، رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعاگوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔“

چنانچہ وہ غازی آباد۔ ہاپوڑ۔ مراد آباد ہوتے ہُوئے ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پُور پہنچے۔ اور جشن میں شریک ہُوئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جشن بہت شاندار تھا۔ مرزا ۶ر دسمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں۔ کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اترے کچھ کم سَو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ر دسمبر حضور پُر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہُوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہُوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹِپن[1] اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کریگی۔

---

[1] یعنی ٹفن (Tiffin) دوپہر کا کھانا۔

طوائف کا وہ ہجوم۔ حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو "طوائف الملوک" کہنا چاہیئے "۔

مالی نقطۂ نظر سے مرزا کا دوسرا سفر رام پور بالکل ناکام نہ تھا۔ مولوی امتیاز علی عرشی مرزا کی آرزوؤں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

"نواب خلد آشیاں ...... ۷ نومبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے۔ تاہم ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ۲۰۰ روپیہ بوجہ زادِ راہ مرحمت فرما کر مرزا صاحب کی اس آرزو کی بھی تکمیل کردی گئی "۔

اس کے علاوہ رام پور کے سفر سے پہلے مرزا نے اپنے تعلقاتِ ریاست کے متعلق جو تشویش ناک خبر سُنی تھی۔ اُسے بھی نواب صاحب کے کرم و التفات نے غلط ثابت کر دیا۔ لیکن رام پور سے واپسی کے وقت ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ جس نے مرزا کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے ادھ مُوا کر دیا ‌۔

مرزا ۲۸ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہُوئے۔ راستے میں دریائے گنگا کو پار کرنا تھا۔ جو اِن دنوں سرمائی بارش کی وجہ سے طوفانی تھا۔ مرزا کی پالکی کشتیوں کے عارضی پُل کو پار کر چکی۔ تو یہ پل ٹوٹ گیا۔ اور ان کے اسباب کی گاڑیاں اور نوکر چاکر سب پیچھے رہ گئے۔ ناچار مرزا کو یکہ و تنہا بغیر پُورے بستر کے، اور بغیر کسی کھانے کے مراد آباد کی سرائے میں رات گذارنی پڑی۔ اُن کی عمر اس وقت ستّر سال کی تھی۔ وہ اس سردی کی تاب نہ لا سکے۔ اور بیمار ہو گئے۔ مولوی محمد حسن مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ انہیں خبر ملی۔ تو وہ مرزا کو گھر لے گئے۔ اور پُوری طرح تیمارداری اور غمخواری کی۔ پانچ سات دن کے بعد صحت ہُوئی۔ تو مرزا دہلی پہنچے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ انہیں عارضی طور پر افاقہ ہو گیا۔ طبیعت اس کے بعد خراب رہی۔ وہ اس واقعہ کے قریباً چھ ماہ بعد ایک خط میں لکھتے ہیں "آگے ناتواں تھا۔ اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب

اندھا ہُوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ اور ضعفِ بصر، جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حرف سُوجھنے سے رہ گیا ۔“ ایک اور خط میں لکھا ہے ۔”رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لُطفِ طبیعت، یہ سب اسباب لُٹ گیا ۔“

جب مرزا رام پور سے لوٹے ۔ تو نواب کلب علی خاں کے تعلقات ان سے خوشگوار تھے ۔ لیکن اس سے قریباً ایک سال بعد بدقسمتی سے ایک ایسی علمی بحث پیدا ہو گئی ۔ جس نے ان تعلقات کو ضعف پہنچایا ۔ اس بحث کی تہ میں بھی مرزا کا عام ہندوستانی لغت نویسوں سے اختلاف تھا ۔ جس سے متاثر ہو کر اُنہوں نے قاطع برہان لکھی تھی ۔ اور ایک بااثر علمی حلقے کی مخالفت گوارا کی تھی ۔ آغاز اس کا اس طرح ہُوا ۔ کہ مولوی محمد عثمان خان بہادر مدار المہام ریاست رام پور نے قصاید بدر چاچ کی ایک شرح مرتب کی ۔ جس کے شروع میں نواب صاحب نے دیباچہ لکھا ۔ اور یہ دیباچہ بغرض اصلاح مرزا کے پاس بھیجا ۔ اس دیباچہ میں نواب صاحب نے ”ارژنگ“ کو ”ارژنگ“ اور ”آشیاں چیدن“ کو ”آشیاں بستن“ کے معنوں میں استعمال کیا تھا معلوم ہوتا ہے ۔ مرزا نے ان جملوں میں ترمیم کر دی ۔ لیکن نواب صاحب اس ترمیم سے متفق نہ ہُوئے ۔ اُنہوں نے فرہنگ رشیدی اور فرہنگ جہانگیری اور لغت کی دوسری کتابوں سے اپنی عبارت کے جواز میں نظیریں دیں ۔ اور مرزا کو لکھا ۔

”اکثر مالک رقابان علم لغت ارژنگ و ارژنگ را بمعنے واحد پنداشتہ اند ۔ و عامۂ مفسراں کلام شیرازی مشارٌ الیہ ”آشیاں چیدن“ را مرادف ”آشیاں بستن“ نگاشتہ ۔ چنانچہ نظیر ہر یکے ملفوف عنبریں نامۂ ہذا است ۔ بمطالعہ خواہد رسید ۔ معہٰذا اگر طبع آں اوستادِ زماں بہ ترقیم الفاظ فی الجملہ نفورے داشتہ باشد ۔ ہمچناں حوالۂ قلم نمایند ۔ کہ مبعوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چوں نفسانیت

خود محو سازم۔ زیرا کہ مرا از اں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است نہ از عرفی و دیگراں"

نواب صاحب نے خط بڑی متانت اور خوش اخلاقی سے لکھا تھا۔ لیکن مرزا کو ہندوستانی لغت نویسوں کے نام سے چڑ تھی۔ ان کے جواب میں قاطع برہان کی تھوڑی بہت تلخی آگئی:۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔

بعد تسلیم معروض ہے۔ اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا "مرا از اں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است" یہ ذلیل کہ عزت دینی اور دکان بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویِ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریق یاد نہیں۔

میاں انجو جامع فرہنگِ جہانگیری۔ شیخ رشید راقم فرہنگِ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد۔ ماخذ ان کا اشعارِ قدما۔ ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!!

فقیر اشعارِ قدما کا معتقد۔ ان لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں اس کے معنے تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں۔ اب پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارژنگ و ارژنگ منی المعنی اور آشیاں ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے" تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ لیکن ان صاحبوں کے

قیاس کے بموجب ۔ بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق ۔

تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزوں

انصاف کا طالب غالب"

نواب صاحب کو یہ خط ناگوار گزرا ۔ ایک تو اس میں مرزا نے ان لغت نویسوں کی ہنسی اُڑائی تھی ۔ جن کی نواب صاحب کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی ۔ دوسرے نواب صاحب نے چند ایک جملوں کے ایسے معنی مراد لئے ۔ جو مرزا کے خیال میں نہ تھے ۔ چنانچہ انہوں نے مرزا کو ایک طویل اور دُرشت خط فارسی میں لکھا ۔ جس کا ماحصل یہ ہے :۔

آپ کا عجیب و غریب خط' جس میں قدیم ہندی شاعروں کی نسبت غلط معنی بتانے کا الزام اور دوسرے اعتراض' اور یہ اظہار تھا ۔ کہ راقم کو بحث کا طریقہ نہیں آتا ۔ موصول ہوا ۔ اور بڑی حیرانی کا باعث ہُوا ۔ اس لئے کہ ابھی تک سوائے علمی امور کی تحقیق و تفتیش کے کوئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تھی ۔ لیکن میں اس یگانۂ روزگار کی موشگافیوں پر حیران ہوں ۔ کہ میری تحریر کو بحث و اجتہاد پر محمول کیا گیا ۔ اور اس طرح کے کنائے' مثلاً راقم کو اُستاد کہنا' یا لفظ بحث' جو دلخوق خلافِ واقع اور شکر رنجی کا باعث ہیں' لکھے گئے ۔ پس اگر آپ کو یہی منظور ہے ۔ تو اس امر کا اشارہ کر دیں ۔ کہ فریقین کے درمیان "ترسیل رسائل" بند ہو جائے ۔ ورنہ قلم کو غیر ضروری خارج البحث باتوں کی تفصیل سے باز رکھیں ۔ جس کا نتیجہ دردِ سر کے سوائے کچھ نہیں ہو سکتا ۔ راقم نے ان محققین کا پایہ' جن کی تصنیفات مقبول عام ہیں' اپنے سے زیادہ سمجھ کر ان کے کلام کے حوالے دئے تھے ۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک وہ قابلِ قبول نہ تھے ۔ تو چاہیئے تھا ۔ کہ آپ مہربانی سے ایسا لکھ بھیجتے میری سمجھ سے باہر ہے ۔ کہ بات کو اس قدر طول کیوں دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے زیادہ لکھنا لقمان کو نصیحت کرنا ہے "

اب مرزا ڈرے۔ کہ کہیں نواب صاحب ناراض ہو جائیں۔ اور اس بے کسی کی حالت میں زندگی کا جو سہارا ہے۔ جاتا نہ رہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک معذرت آمیز خط اس کے جواب میں لکھا:۔

"آج ..... کہ توقیعِ وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اُٹھا۔ اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو۔ تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہ کی قسم! اگرچہ فاسق و فاجر ہوں۔ مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا اور رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرائے ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں۔ یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو ان کے عقول میں اختلاف ہیں۔ اس میں مَیں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہُوئے ہوں۔ اوروں سے مجھے بحث نہیں۔ باہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا۔ کہ "ان دونوں باتوں کو مَیں نے مانا۔ لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب۔ بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق" یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کو گناہ سمجھا جائے۔ "آخر گنہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں" گناہ معاف کیجئے اور نویدِ عفو سے مجھ کو تقویت دیجئے۔

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عفو کا طالب غالب"

نواب صاحب نے یہ معذرت قبول کر لی۔ اور جواب میں لکھا "..... حالا کہ آں مہربان تبادلیش پرداختند از آں دفع شکوک لاحقہ گردیدہ خاطر لطف مظاہر مقرون جمعیت باشد"۔ لیکن جیسا کہ مولوی امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے "۔ اس کے بعد نواب صاحب نے پھر کوئی نثر اصلاح کے لئے نہیں بھیجی۔ جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ ان کی طبیعت کا تکدر کلیتہً دُور نہیں ہُوا"۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا اور نواب کلب علی خاں، کے تعلقات شروع سے ہی کسی قدر کشیدہ ہوگئے تھے۔ اور کئی ایسے واقعات ہوتے رہے۔ جن کے لئے مرزا کو عذر خواہی کرنی پڑی۔ ایک واقعہ تو جلوس کے پہلے سال میں ہی ہُوا۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ جب نواب مسند نشین ہوئے۔ تو مرزا نے ایک خط میں انہیں مشورہ دیا۔ کہ وہ سرکار انگلشیہ سے مزید اعزاز اور خطاب حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"پیر و مرشد! از راہِ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابنِ وزیر محمد خاں رئیسِ ٹونک نے بعد مسند نشینی گورنمنٹ کو "یمین الدولہ" اور "دو جز و ملک اور جنگ" لکھکر دئے۔ اور وہاں سے وہ ان کو عطا ہُوئے۔ حضور کے اجدادِ امجاد نے سلاطین بابریہ کا خطاب قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِ امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک و بہرام جنگ" جناب ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ اپنے واسطے لیں"

مرزا کے مشورے میں ایک طرح کا تملّق تھا۔ نواب صاحب کو برافروختہ کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن فرمانرواؤں کی طبیعت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے بخشند" نواب صاحب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا۔ خط میں تو فقط انہوں نے یہی لکھا۔ "استحصال الفاظ خطاب دستور ایں ریاست نبودہ است"۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ رام پور میں اس مشورے پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی۔ جس کی اطلاع مرزا کے خیر خواہوں (نواب مرزا خاں داغ یا امیر؟) نے انہیں دہلی میں دی ہوگی۔ چنانچہ مرزا نے ایک فارسی قطعہ لکھ کر بڑی لجاجت سے اپنے "جرم" جسارت کے لئے عذر خواہی کی۔ اس قطعہ کے چند اشعار ہیں ؎

ہمے نویسم و وقتِ نوشتنم باشد دلے ز بیم لبالب چو لب ز عذرِ گناہ
خدا کند کہ مشرف شود چو ایں قرطاس بہ پیشِ مسندِ عالی ز بندہ درگاہ
امیر کلب علی خاں بہادر از رہِ لطف بسوئے غالبِ خونیں جگر کنند نگاہ
کہ ایں فلک زدہ گر عرض کرد مصلحتے بزعمِ بندہ ز اخلاص بود در ناگاہ
خلافِ طبعِ مبارک فتادہ آں تقریر بسے خطا رود از بندگانِ دولت خواہ
تو بادشاہ و شہنشاہِ تاجدارِ فرنگ خطاب می طلبد بادشہ ز شاہنشاہ
جدائے من تو بپذیری ز جرمِ من بگریز بحقِ اشہد ان لا الہ الا اللہ!

اس سے ایک سال بعد کے ایک خط میں بھی اسی طرح کی معذرت طلبی ہے:-

"غم نے بشمول بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ ذائقہ صحیح۔ برسوں سے مکروہات میں مبتلا رہتے رہتے، اب طاقت تحمل کی نہ رہی۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ کیا سمجھتا ہوں۔ کیا کرنا چاہیے۔ کیا کرتا ہوں۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ اگر عرضی سابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بد حواسی کی ہو تو فقیر کی خطا معاف ہو
میر منشی صاحب کے مخالف طبع اگر کوئی لفظ ہو۔ تو وہ بھی درگزر کریں۔"

واقعہ یہ ہے۔ کہ نواب کلب علی خاں اور مرزا کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہیں کئی تھیں۔ نواب صاحب پکے سُنّی، مرزا شیعہ، نواب صاحب تمام شرعی امور کے پابند اور

---

[1] مرزا رام پور سے ایک خط میں نواب سجاد مرزا کو لکھتے ہیں "تمہارے یار باقر مرزا تحصیلداری تحصیلداری کی پکارتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوا۔ کہ تمام قلمرو میں چھ تحصیلداریاں اور چھ تھانہ داریاں ہیں۔ ساتواں علاقہ کہاں سے پیدا کیا جائے۔ رہی مصاحبت اُس کو پہلے تسنن۔ اور پھر علوم رسمیہ سے آگہی پھر زبان آوری پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔"

مرزا کا اس معاملے میں جو حال تھا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ نواب صاحب نے مسند نشین ہوتے ہی قمار بازی یک قلم موقوف کر دی تھی۔ اور مرزا نے اس کی خاطر قیدِ فرنگ بھی گوارا کر لی تھی۔ اس کے علاوہ علمی امور میں بھی وہ ہم خیال نہ تھے۔ نواب صاحب مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات کے شاگرد۔ اور مرزا نہ صرف مولوی غیاث الدین[1] بلکہ ان کے تمام ہم پیشہ اور ہم خیال لغت نویسوں سے متنفر۔ اندریں حالات اگر مرزا اور نواب کلب علی خاں کے درمیان کوئی گہرا ربط وضبط نہ تھا۔ تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی نواب صاحب کی اس لئے شکایت ہو سکتی ہے۔ کہ اُنہوں نے مرزا کے ساتھ وہ دوستانہ سلوک نہیں کیا۔ جس کا نمونہ نواب یوسف علی خاں نے پیش کیا تھا۔ اہلِ ذوق کو تو نواب کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے باوجود ان اختلافات کے اور باوجود اس امر کے کہ وہ غالب کے شاگرد بھی نہ تھے، مرزا کا ماہوار مشاہرہ جاری رکھا۔ اور ضرورت کے وقت ان کی دستگیری کی۔

نواب کلب علی خاں کی مرزا سے سرد مہری ایک لحاظ سے اُردو ادب کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ مرزا کی نواب یوسف علی خاں سے بے تکلفی تھی۔ اور ان کی خوشنودی کے لئے وہ تازہ کلام، یا مدحیہ قصائد بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ لیکن نواب کلب علی خاں سے وہ اس طرح کی وارستہ مزاجی کیسے روا رکھتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ باوجودیکہ نواب کلب علی خاں سے مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں کی نسبت تھوڑی دیر برقرار رہے۔ اور اس زمانے میں ضعف اور پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ شعر گوئی سے معذور بھی تھے۔ لیکن جس قدر تازہ اشعار

---

[1] مرزا نے مولوی غیاث الدین کے خلاف جو بُری طرح زہر اُگلا ہے۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو عودِ ہندی ص ۱۳ - ۱۵ و اردوئے معلیٰ ص ۳۷۱

قصائد اور قطعات انہوں نے نواب کلب علی خاں کو لکھ کر بھیجے۔ نواب یوسف علی خاں کے لئے نہیں لکھے۔!

صفیر بلگرامی کا بیان

اسی زمانے میں جلوۂ خضر کے مؤلف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرزا سے ملنے دہلی آئے تھے۔ اور ان سے ملاقات کا حال اپنی کتاب میں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"حضرت کا لباس اُس وقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار روسی کا۔ ٹوپی دار۔ نیفہ سرخ ٹول کا۔ بدن میں مرزائی۔ سر کھلا ہوا۔ رنگ سُرخ و سفید۔ منہ پر داڑھی دو انگل کی۔ آنکھیں بڑی۔ کان بڑے۔ قد لمبا۔ ولایتی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرتِ شراب کے موٹی ہو کر اینڈ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا۔ کہ اُٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کے سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔"

سید فرزند احمد کئی روز دہلی میں مقیم رہے۔ اس دوران میں مرزا اور ان کے درمیان جو ادبی گفتگو ہوئی۔ اُسے بھی انہوں نے درجِ کتاب کیا ہے۔ اور مرزا کے کھانے کی تفصیل لکھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ اچھی غذا کھاتے تھے۔

اُردو رقعات کی اشاعت

مرزا سے مؤلف جلوۂ خضر کی ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ شعر و شاعری اس وقت بہت حد تک ترک ہو چکی تھی۔ انہوں نے آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ء میں نواب امین الدین کے ایما پر اور آخری اُردو غزل نواب کے صاحبزادے مرزا علاء الدین کے اصرار پر ۱۸۶۶ء میں لکھی۔ لیکن نواب رامپور کی تعریف میں شعر گوئی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ مرزا کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کے قلم میں ابھی بہت جان تھی۔ لیکن بدقسمتی سے غدر کے بعد ان کا بہت سا وقت برہانِ قاطع کے متعلق

مباحثہ میں تلف ہُوا۔ ہاں اُردو خطوط کا بیشتر حصّہ اس زمانے کی یادگار ہے۔ اور وہ مرزا کے تاجِ شہرت کے آبدار موتی ہیں:

عودِ ہندی کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ اس کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہُوئی۔ اور ۱۸۶۵ء یا ۱۸۶۶ء میں مکمل ہُوئی۔ اسے منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے چوہدری عبدالغفور سرور اور خواجہ غلام غوث بیخبر کی مدد سے جمع کیا۔ اور بالآخر اپنے مطبع سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع کیا۔ عودِ ہندی مرزا کے اُردو مکتوبات کا پہلا مجموعہ ہے۔ اور اس کے جمع کرنے والوں کے ادبی ذوق کی داد دینی چاہئے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے۔ کہ یہ مجموعہ اس قدر غلط اور بے ترتیب چھپا ہے۔ کہ اس سے کتاب کی خوبیاں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور خطوط کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"کاتب اس نسخے کا غلط نویس اور بد املا ہی نہیں۔ رسم الخط ہی نہیں جانتا۔ اور غلطیوں سے قطع نظر لفظوں کو بُری طرح توڑتا ہے۔ . . . بعض جگہ تو عبارت کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے خاص کر جہاں کہیں لفظ کو غلط توڑ کر ایک ٹکڑا اس کا سطر کے آخر میں، دُوسرا اگلی سطر کے شروع میں لکھا ہے . . . . کتاب کی چھپائی کا اہتمام کرنے والوں نے نہ چھپتے وقت غلطیوں کی تصحیح کی۔ نہ بعد کو غلط نامہ بنایا۔ جن خطوں کے اصل نسخے "غالب" ہی کے قلم کے لکھے ہوئے خوش قسمتی سے ہاتھ آ گئے۔ ان سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہُوا۔ کہ چھاپے کے نسخے میں بعضے فقرے سراسر مسخ کر دیئے گئے ہیں۔ . . . ایسی صورت میں ہر جگہ کاتب ہی دست اندازی کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

عودِ ہندی کی کتابت اور املا میں جو بے پروائی برتی گئی۔ اس سے زیادہ بے قاعدگی کتاب کی ترتیب میں ہے۔ کتاب کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصے میں چوہدری عبدالغفور سرور کے

جمع کئے ہوئے خطوط ہیں اور حصۂ ثانی میں منشی ممتاز علی خاں اور خواجہ غلام غوث بیخبر کے جمع کردہ۔ دونوں حصے بالکل بے ترتیب ہیں۔ ان بزرگوں سے اتنا نہ ہوا کہ ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط کو یکجا کر دیتے۔ خود جامع یعنی بیخبر کے نام جو خطوط آئے ہیں۔ وہ مختلف جگہوں میں پریشان ہیں۔ اور اس بے ترتیبی کی واضح مثال ہیں۔ نمبر شمار ۱۰۴ سے نمبر شمار ۱۱۱ تک کے رقعات بیخبر کے نام ہیں۔ اگلا رقعہ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے نام ہے۔ اس سے اگلا "ظہیر الدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام"۔ اس کے بعد پانچ رقعے پھر بیخبر کے نام کے ہیں۔ اُن کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام کا ایک رُقعہ ہے۔ پھر دو رُقعے بیخبر کے نام۔ اس کے بعد ایک رقعہ مرزا حاتم علی مہر کے نام۔ اس کے بعد بیخبر کے نام کے رُقعے پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ اور بے ترتیبی کا یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی جدتیں ہیں۔ مرزا کے ایک خط (۱۶۲) کا جواب بیخبر نے لکھا۔ وہ بھی رقعات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ خط بیخبر کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ لیکن کتاب کے حاشیے پر اس خط کے سامنے لکھا ہے "خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام[لہ]" گویا یہ خط غالب کا ہے اور بیخبر کے نام لکھا گیا! ایک خط کے ساتھ بیخبر کی ایک غزل اس طرح درج کی گئی ہے۔ کہ خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ غزل خط میں درج ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ خط میں غزل کا ذکر تھا۔ چاہیئے تھا۔ کہ بیخبر اسے خط سے جدا نقل کرتے۔ اور ایک دو سطریں تشریح حال کے لئے لکھ دیتے۔ لیکن انہیں غالباً اس کی فرصت نہ تھی۔ خطوط جمع کرتے وقت بیخبر کا خیال تھا۔ کہ فقط وہ خطوط جمع کئے جائیں۔ جو علمی یا ادبی نقطۂ نظر سے خاص طور پر قابلِ وقعت ہوں۔ دوسروں کے متعلق ضرور اس اصول کا خیال رکھا گیا۔ لیکن بیخبر نے اپنے نام کے تمام خطوط شامل کر دئیے ہیں۔ خواہ وہ بالکل بے وقعت بلکہ بے معنی ہی کیوں نہ ہوں۔

لہ ۔ ملاحظہ ہو عودِ ہندی (مطبوعہ کریمی پریس لاہور) ص ۴۷۔

ایک خط (۱۶۴) فقط دو لفظوں پر مشتمل ہے۔ "خریدار ہے"!!

عودِ ہندی کی ترتیب اور طباعت اس بے قاعدگی سے ہوئی۔ تو چنداں جائے حیرت نہیں کہ مرزا اس مجموعے سے مطمئن نہ ہوئے۔ ویسے اس مجموعے کی اشاعت میں ہی اسقدر تعویق ہوئی تھی۔ کہ مرزا نے اس کی اشاعت سے پہلے ہی دوسرے مجموعے کی ترتیب شروع کر دی۔ یہ مجموعہ ۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء کو مرزا کے دوست حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع سے اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی تیاری میں مرزا نے بھی مدد دی۔ اور اپنے دوستوں سے خطوط اور ان کی نقلیں منگائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیماری کی وجہ سے مرزا اس پر نگاہِ تنقید نہیں ڈال سکے۔ اور ایک دو ایسے خطوط، جن کا نظر انداز ہونا ہی بہتر تھا۔ شائع ہو گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ کی تحریک سے شروع ہوا۔ میر فخر الدین مہتمم مطبع اور منشی بہاری لال مشتاق نے خطوط جمع کئے۔ اور دیباچہ میر مہدی۔ اور خاتمہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ اس میں عودِ ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطوط ہیں۔ عودِ ہندی مرتب کرتے وقت خطوط زیادہ تر ان حضرات سے ملے تھے۔ جو صوبجات متحدہ میں مقیم تھے۔ اور جن تک تفتہ اور منشی ممتاز علی خاں کی رسائی بآسانی ہو سکتی تھی۔ اردوئے معلیٰ میں ان خطوط کا معتدبہ حصہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے علاوہ، گرد، لوہارو، سورت، بڑودہ کے اصحاب کے نام کے بہت سے خطوط ہیں۔ عودِ ہندی میں مرزا تفتہ اور میرزا علاء الدین کے نام ایک ایک خط ہے۔ اور اردوئے معلیٰ (اشاعتِ اول) میں علی الترتیب ان کے نام ۸۹ اور ۵۶!! قصہ مختصر اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی کی نسبت کہیں زیادہ مکمل تھا۔ لیکن عودِ ہندی میں کئی خط ایسے بھی ہیں۔ جو بعد کے مجموعوں میں نہیں۔

میر مہدی مجروح نے اردوئے معلیٰ کے شروع میں لکھا تھا۔ "ان خطوں کو دو حصوں

منقسم کیا۔ پہلے حصے میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کئے۔ تاکہ طلبائے مدرسہ فائدہ اٹھائیں۔ دوسرے حصہ میں مطالبِ مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی۔ تاکہ سخنورانِ معنی یاب اس کے دیکھنے سے مزہ پائیں۔ لیکن پہلی اشاعت (۱۸۷۳ء) اور دوسری (۱۸۵۱ء) کے وقت فقط پہلا حصہ ہی شائع ہوا۔ دوسرا حصہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء میں چھپا۔ تب مولانا حالی کی فرمائش پر مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی نے دونوں حصے شائع کئے۔ دوسرے حصے پر مولانا حالی نے کچھ حاشیے اضافہ کئے تھے۔ بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی "اس حصے کو مولانا حالی نے ترتیب دیا۔" ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ چونکہ یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء) کی ترتیب کے وقت میر مہدی حسین مجروح، اور لالہ بہاری لال مشتاق نے حالی کو ان کی "تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے" بھیج دئے تھے۔ اردوئے معلیٰ کا دوسرا حصہ بھی اس سلسلے میں انہیں ملا ہوگا۔ اسے انہوں نے خود جمع نہیں کیا۔ مجروح کے دیباچہ سے ظاہر ہے کہ جب یہ دیباچہ لکھا گیا۔ اس وقت دوسرا حصہ جمع ہو چکا تھا۔ بعض مصلحتوں (کتاب کی ضخامت یا تاجرانہ تخمینوں؟) کی بنا پر اسے شائع نہ کیا گیا۔ لیکن یقین نہیں آتا۔ کہ جب یادگارِ غالب کی تصنیف کے وقت مجروح اور مشتاق نے حالی کو غالب کے متعلق باقی سارا مواد بھیجا۔ تو انکی تصنیفات کا یہ اہم حصہ اپنے پاس رہنے دیا ہو۔ اس کے علاوہ اگر حالی نے مرزا کی وفات کے پچیس[۲۵] سال بعد غالب کے خطوط جمع کئے۔ تو یہ عجب معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اتنی شدت سے ان اصولوں کی پیروی کی۔ جو اردوئے معلیٰ کے مرتب کرنے والوں نے وضع کئے تھے۔ اور ایک بھی خط اس طرز کا دوسرے حصے میں درج نہ کیا۔ جو مجروح اور مشتاق کے مرتب کردہ اصولوں کے خلاف ہو۔ آخر آج بھی غالب کے غیر مطبوعہ خطوط تلاش سے مل سکتے ہیں۔ اگر حالی خطوطِ غالب کو نئے سرے سے ترتیب دے رہے تھے۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ

ادبی خطوط کے علاوہ بھی وہ کوئی ایسا خط تیسری اشاعت میں درج کرتے۔ جو پہلی اشاعت میں نہ تھا۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ حالی نے دوسرے حصّے کی اشاعت کا سامان کیا۔ (اور یہ بھی ایک قابل ذکر ادبی خدمت ہے) اسے ترتیب نہیں دیا۔

تیسری اشاعت سے غالب کے شائع شدہ خطوط میں ۴۴ کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کی اہم اشاعت ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ جب لاہور میں شیخ مبارک علی نے اُردوئے معلےٰ طبع کرائی اور اس میں پچیس ۲۵ ایسے خطوط جو کسی پہلے ایڈیشن میں نہ تھے۔ شامل اشاعت کئے۔

غالب کے رام پور والے خطوط جو انہوں نے اپنی عمر کے آخری بارہ سالوں میں لکھے، ابھی تک کہیں شائع نہ ہوئے تھے۔ انہیں مولوی امتیاز علی عرشی مہتمم کتب خانہ رام پور نے ترتیب دیا۔ اور ایک فاضلانہ مقدمے اور بیش قیمت حاشیوں کے ساتھ بڑی صحت اور خوبصورتی سے ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب کے نام سے شائع کیا۔

ان کے علاوہ نادر خطوط غالب کے عنوان سے سید اسمٰعیل رسا گیاوی نے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، جسے وہ غالب کا نتیجۂ قلم بتاتے ہیں۔ اس میں غالب کے رقعات سے ترکیبیں اور فقرے لے کر خطوط تیار کئے گئے ہیں۔ لیکن کوئی شخص جو غالب کا اندازِ تحریر پہچانتا ہے۔ سید صاحب کا دعوےٰ تسلیم نہیں کرے گا۔

اخیر عُمر کی حالت

جب صفیر بلگرامی سے مرزا کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت مرزا کی عمر قریباً ستّر سال کی تھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد صحت تیزی سے بگڑنی شروع ہو گئی۔ کیونکہ مرزا کی وفات تہتّر برس کی عمر میں ہوئی۔ اور حالی لکھتے ہیں "مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔" ان کی اس حالت کا ذکر کئی خطوں میں ہے۔ لیکن اس کی موثر ترین تصویر

خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی نے کھینچی ہے۔ جو لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت راستے میں غالب سے ملے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا اچھا ٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا۔ ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ جو بگمان غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ ہم نے سلام کیا۔ لیکن بہرے اس قدر تھے۔ کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا۔ کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا۔ بمشکل چارپائی سے اُتر کر فرش پر بیٹھے۔ ہم کو اپنے پاس بٹھایا۔ قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا۔ اور کہا آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو۔ نام و نشان پوچھ۔ ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے۔ ہر چند انہوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی۔ جب ہم نے نام و پتہ لکھا تو کہا 'مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہو۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ۔' ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سُننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سُنایا کئے۔ پھر اصرار کیا۔ کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سُنایا ؎

مہ مہر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا۔ اور حد سے زیادہ تعریف کی پھر آدمی سے کہا

"کھانا لاؤ" ہم سمجھے بہ خیالِ مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھ دیا۔ کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے۔ اور گھی سرائے میں گاڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ پا بر رکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "آپ کی غایت اس تکلیف سے یہ تھی۔ کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔" اتنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے۔ کہ اس مقدارِ خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں۔"

مرزا ان دنوں ایک تو ضعف و ناتوانی سے نیم جاں ہو رہے تھے۔ اور دوسرے مالی مشکلات بھی کچھ کم نہ تھیں۔ سب جانتے تھے۔ کہ اب مرزا چراغِ لبِ بام ہیں، اور یہ بھی نظر آ رہا تھا۔ کہ ان کی وفات کے بعد آمدنی کے سب ذریعے مسدود ہو جائیں گے۔ چنانچہ کوشش شروع ہوئی۔ کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے منہ بولے بیٹوں، مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں کا رام پور سے وظیفہ مقرر ہو جائے۔ تاکہ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کو کچھ تو سہارا رہو۔ اس کے علاوہ مرزا حسین علی خاں کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ لیکن منگنی ہو چکی تھی۔ اس کے سسرال والوں نے تقاضا شروع کیا۔ کہ اس فریضہ کو جلد سر انجام دو۔ مرزا کے پاس اخراجاتِ شادی کے لئے کچھ نہ تھا۔ اور قرض بھی اب کہیں سے نہ ملتا تھا۔

لے دے کے ان کے پاس دربار رام پور کا سہارا تھا۔ انہوں نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ آپ کچھ رقم عنایت فرمائیں تاکہ یہ کام سرانجام پائے اور بوڑھے فقیر کی بزرگی میں شرم رہ جائے۔ رام پور سے اس کا حوصلہ افزا جواب گیا۔ اور مرزا سے پوچھا گیا۔ کہ آپ کو کتنا روپیہ مطلوب ہے۔ مرزا نے لکھا۔ کہ باقر علی خاں کی شادی پر ڈھائی ہزار روپے خرچ آئے تھے۔ "دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں۔ کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے۔ اوس میں شادی کر دوں گا" مرزا کو امید تھی کہ یہاں سے کچھ مل جائے گا۔ نواب مرزا خاں داغ اور جناب مظفر حسین خاں بہادر کی تحریروں نے اور بھی دل بڑھایا۔ چنانچہ رام پور کے عطیہ کے انتظار میں شادی کی تاریخ بھی ملتوی ہوئی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ مرزا ابھی اس امید میں تھے۔ اور طریقے طریقے سے نواب صاحب کو یاد دہانی کرا رہے تھے۔ کہ انہیں قرضخواہوں نے دق کرنا شروع کیا۔ اور شاید نالش کی بھی دھمکی دی۔ چنانچہ مرزا نے حسین علی خاں کے لئے جو کچھ مانگا تھا۔ اُس سے قطع نظر کی اور نواب سے درخواست کی۔ کہ قرضخواہوں سے گلو خلاصی کرانے میں مدد دیں۔ وہ ۲۶ ؍ نومبر ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی۔ کہ اب کی تنخواہ سے ۵۴ روپے بچے۔ ۶۲ روپے کا چھٹا ماہوار کا سو سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپے ہوں۔ تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اوسکے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال۔ کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجئے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔"

اس عرضداشت کے جواب میں نواب مرزا خاں داغ نے مرزا کو لکھا۔ کہ حضور نے

تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے۔ اور مقدارِ قرض پوچھی ہے" چنانچہ مرزا نے دو بارہ قرض کی مقدار لکھ بھیجی۔ اور نواب صاحب کو بھی یاد دہی کرائی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی حکم صادر نہ ہُوا۔ اور مرزا کی یہ خواہش بھی تشنۂ تکمیل رہی ؂

اخیر عمر میں مالی الجھنوں اور ضعفِ قویٰ نے مرزا کو اس طرح پریشان کر رکھا تھا۔ تو جائے حیرت نہیں۔ کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی شعر و ادب سے دلچسپی باقی تھی۔ اور خطوط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ حالی لکھتے ہیں:۔

"مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہُوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے مَیں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہُوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنہوں نے لوہارو سے حال پُوچھا تھا۔ اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا۔ لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا۔ "کہ میرا حال مجھ سے کیا پُوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پُوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دُوسرا مصرع یہ تھا۔ "نکرہ ہجر مدارا ممن سر تو سلامت"۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

وفات آخر مرزا کی مصیبتوں کے خاتمہ کا وقت آگیا اور وہ ذیقعد ۱۲۸۵ھ کی دوسری یعنی فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں) کو تہتّر برس اور چار مہینے کی عمر میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہُوئے۔ تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین احمد خان کی طرف سے ہُوئی۔ اور حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ

کی درگاہ کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے مزار کے پاس دفن ہوئے ؂

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

بیگم مرزا غالب کی وفات

غالب کی وفات سے اُردو ادب کو جو نقصان پہنچا وہ ظاہر ہے ۔ بلا مبالغہ اُردو نظم و نثر کا آفتاب غروب ہو گیا لیکن ان کی وفات سے جو صدمہ ان کے متوسلین، بالخصوص ان کی باہمت بیوہ کو، جس کا ان کی شہرت اور ناموری میں کوئی حصہ نہیں۔ لیکن جو ان کی تمام مصیبتوں، بیماریوں اور تکلیفوں میں برابر کی شریک تھی ۔ اس کا جو صدمہ ہوا ہوگا ۔ اس کا تصور اور بھی جگر گداز ہے ؂

مرزا غالب نے اپنی وفات کے وقت اپنے ورثا کے لئے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا بلکہ مرتے وقت وہ آٹھ سو کے قرضدار تھے ۔ اس کے علاوہ ان کی وفات پر آمدنی کے تمام ذریعے مسدود ہو گئے ۔ مرزا کا بسر اوقات رام پور کے ماہوار مشاہرے اور سرکاری پنشن پر تھا ۔ اور یہ دونوں سلسلے ان کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ کی جو حالت ہوئی ۔ اس کا کچھ اندازہ اس عرضداشت سے ہو سکتا ہے ۔ جو بیگم صاحبہ نے اگست ۱۸۶۹ء میں نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کی :-

"جناب عالی! جس روز سے مرزا اسد اللہ خان نے وفات پائی ہے ۔ تو یہ عاجزہ بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے ۔ کہ تحریر سے باہر ہے ۔ اوّل تو یہ مصیبت ہے ۔ کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپیہ کے قرضدار مرے ۔ دوسری مصیبت یہ کہ پنشن انگریزی مسدود ہوئی تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپیہ ماہوار، جو آپ از رو قدر دانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے تھے وہ بھی یک لخت موقوف ہوئی ۔ اب تک قرض لے کر اوقات بسر کی ۔ اب قرض بھی نہیں ملتا ۔ نوبت فاقہ کشی کی پہنچی ۔ ۔ ۔ ۔"

بیگم صاحبہ اپنے شوہر کی روش کے خلاف مذہبی خیالات کی تھیں انہیں اس ہجوم مصائب میں بھی اپنی تکلیفوں سے زیادہ اس امر کا خیال تھا۔ کہ کسی طرح مرزا صاحب کا قرضہ ادا ہو جائے۔ تاکہ وہ عذاب اُخروی سے محفوظ رہیں۔ اسی درخواست میں وہ آگے چلکر لکھتی ہیں :۔

"اب دُعاگو کی یہ تمنا ہے۔ کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے۔ کہ مرزا مرحوم حق عباد سے بری ہو جائیں۔ کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صُورت ادائے قرض فرماویں۔ تو کمال ثواب عظیم ہوگا۔"

مرزا کی خاندانی پنشن کے متعلق یہ امر تعجب انگیز ہے۔ کہ یہ یک قلم کیوں بند ہو گئی۔ بیوہ کو پوری نہ سہی اس کا کچھ حصہ تو ملنا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے بیگم صاحبہ نے درخواست کی تھی۔ کہ مرزا صاحب کی پنشن ان کے پسر متبنیٰ حسین علی خاں کے نام منتقل کر دی جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ ہمدردانہ کی۔ لیکن کمشنر نے حکم دیا۔ کہ حسین علی خاں کے نام پنشن نہیں جاری ہو سکتی۔ البتہ بیوہ کو دس روپے ماہوار وظیفہ مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کچہری میں حاضر ہو۔ بیگم صاحبہ نے یہ رقم اور یہ شرط قبول نہ کی اور ان حالات میں وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ خود مندرجہ بالا عرضداشت میں نواب رام پور کو لکھتی ہیں :۔

"اور پنشن میری دس روپیہ انگریز کرتا ہے۔ بشرط اینکہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہوگا۔ گو فاقوں ہی مر جاؤں۔ کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کروں۔ اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص دعام کے تھی حضور پر سب روشن ہے۔"

نواب صاحب رام پور نے تو غالب کا قرضہ ادا کرنے کے لئے کوئی مدد نہ دی۔ اور نہ ہی غالب کی بیوہ کا کوئی وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن مرزا کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد حسین علی خاں رامپور میں بسیغہ شعرا ۲۵ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے تھے۔ جس سے اس آفت زدہ خاندان کا

بوجھ تھوڑا بہت ضرور ہلکا ہو گیا ہوگا۔ قرضے کی ادائیگی اور امراؤ بیگم کی ضروریات کے لئے انکے چچازاد بھائی اور مرزا کے عزیز شاگرد نواب ضیاءالدین نیر و درخشاں اور ان کے بھائی نواب لوہارو نے مدد کی۔ مولینا مہر لکھتے ہیں:۔

"نواب سر امیرالدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے۔ کہ نواب ضیاءالدین احمد خاں نے قرض خواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی تھی۔ اور امراؤ بیگم کے لئے پچیس روپے یا پچاس روپے ماہوار لوہارو سے مقرر ہو گئے تھے۔ جو تادم وفات انہیں باقاعدہ ملتے رہے"۔

اس سے پہلے بھی، جب غدر کے بعد مرزا کی پنشن اور قلعہ کی تنخواہ بند ہوئی تھی تو نواب ضیاءالدین نے ہمت اور جوانمردی سے کام لیا۔ اور امراؤ بیگم کے لئے پچاس روپے ماہوار کا انتظام کر دیا۔ مرزا کو بھی اس کی توقع تھی۔ اور آخری ایام میں جب انہیں اپنے وابستگان کا خیال مضطرب کرتا۔ تو وہ دل کو یہ کہکر تسلی دیتے۔ کہ بیوی کے لواحقین اسے بھوکا نہیں مرنے دیں گے۔ وہ نواب امین الدین رئیس لوہارو کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے۔ اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں۔ اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے۔ اور انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ کہ تم جیتے رہو۔ اور میں تم دونوں (نواب امین الدین اور نواب ضیاءالدین) کے سامنے مر جاؤں۔ تاکہ اگر اس قافلے کو روٹی نہ دو گے۔ تو چنے تو دو گے۔ اور اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے۔ تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے ان غمزدوں کے غم میں نہ اُلجھوں گا۔"

میرزا کی وفات کے بعد ریاست لوہارو کی طرف سے مرزا کی بیوہ کے لئے پنشن مقرر ہوگئی تھی۔ لیکن انہیں وہ بہت دن لینی نصیب نہ ہوئی۔ مرزا کی وفات ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ ہجری کو ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سال بعد، عین ان کی برسی کے دن[1] امراؤ بیگم بھی اپنے رفیقِ حیات سے جا ملیں ✤

---

[1] ذکرِ غالب صر ۷۵

تبصرہ

یادگارِ غالب ہم ذکر کر چکے ہیں کہ شعرا کے تذکروں میں غالب کو اس وقت سے جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ جب ابھی وہ آگرہ چھوڑ کر دلی نہ آئے تھے۔ لیکن ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو ان میں اتنے شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا کہ کسی ایک کے متعلق تفصیلی حالات کی گنجائش نہ رہتی۔ دوسرے ترتیب ابجد وار ہوتی تھی۔ اس لئے بیان میں تاریخی تسلسل نہ رہتا۔ جب مولانا آزاد نے ان نقائص کو محسوس کر کے اردو شاعری کی نئے طرز سے تاریخ لکھی۔ تو انہوں نے غالب کو بھی اپنی کتاب میں باعزت جگہ دی۔ اور یادگارِ غالب سے پہلے غالب کا مفصل ترین تذکرہ آبِ حیات ہی میں تھا۔ لیکن آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ اور اردو کے بہترین انشا پرداز۔ جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آتا۔ وہ دلائل کی کمی انشا پردازی سے پوری کر دیتے۔ چنانچہ غالب کے حالات سے غالب کے مداح مطمئن نہ ہوئے۔ اور ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنی مشہور کتاب یادگارِ غالب لکھی۔

حالی کی کتاب کو سوانح نگاری کا معجزہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کتاب کو غالب کی شہرت اور مقبولیت میں اتنا ہی دخل ہے۔ جتنا دیوان غالب اور اردوئے معلٰی کو۔ حالی کی کامیاب سوانح نگاری کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ عام طور پر اب یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ حالی اور غالب عمر بھر ایک دوسرے کے رفیق رہے۔ اور ایک نقاد نے اس بات کی شکایت کی ہے۔ کہ حالی جو غالب کی رفاقت کی وجہ سے اُس کی شاعرانہ زندگی کے مختلف دوروں اور اردو غزلوں کے سنینِ تصنیف سے واقف تھا۔ اس نے شاعر کے کلام کو کیوں نہ تاریخی ترتیب سے مرتب کر دیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حالی کو مرزا کی رفاقت کا کوئی خاص موقع میسر نہیں آیا۔ غدر سے پہلے حالی فقط دو سال دلی رہا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اور وہ گھر سے روپوش ہو کر ایک بے سروسامان طالب علم کی طرح دہلی آیا تھا۔ اس اثنا میں اسے غالب کو عام مشاعروں میں غزل پڑھتے دیکھنے اور کبھی کبھار اپنا کلام سنانے کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن یہ بعید از قیاس ہے۔ کہ وہ غالب جیسے امیر طبع انسان کا گہرا دوست یا ہر وقت کا رفیق ہو گیا ہو۔ اور نہ ہی غالب کے خطوط یا کسی اور معاصرانہ شہادت سے اِس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حالی کو غالب سے ملنے اور غالب کے حالاتِ زندگی جاننے کا زیادہ موقع اس وقت ملا۔ جب وہ مرزا کے قدیمی دوست اور محسن نواب مصطفٰے خاں کے لڑکوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور نواب صاحب کے ساتھ گاہے گاہے دہلی آنے جانے لگا۔ لیکن اس زمانے میں بھی غالب کا کوئی خط حالی کے نام نہیں ملتا۔ اور نواب مصطفٰے خاں کے نام کے ایک خط میں جو حالی کا سرسری ذکر ہے ("مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام") اس سے بھی کسی تپاک کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ یادگارِ غالب کے اندراجات ذاتی تعلقات اور معاصرانہ مصاحبت کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ بیشتر مورخانہ تحقیق اور

ریسرچ[1] کا ثمرہ ہیں۔ بہت حد تک تو یہ تحقیق و تفتیش غالب کی اپنی تصنیفات میں کی گئی۔ لیکن یادگارِ غالب کی تصنیف کے وقت بہت سے ایسے اصحاب زندہ تھے۔ جنہیں مرزا سے ملنے اور ان کے واقعاتِ زندگی جاننے کا موقع ملا تھا۔ حالی نے ان کی معلومات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی کتاب میں کئی ایسے واقعات درج کر دئے۔ جن کی تفصیلات غالب کی کتابوں میں نہیں۔

حالی کی کتاب کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلا سوانحی۔ دوسرا تنقیدی۔ پہلے حصے پر حال میں کئی اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ اس میں واقعات

---

[1] یادگارِ غالب میں سنین اور اشخاص کی دو تین معمولی غلطیاں ہیں۔ مولینا مہر نے اپنی کتاب میں انہیں پھیلا کر حالی پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ان غلطیوں کو بغور دیکھنے سے واضح ہوتا ہے۔ کہ حالی کو ان امور میں سہو اس لئے ہوا کہ اس نے غالب کی اپنی تصنیفات سے معلومات اخذ کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً غالب کے سفرِ کلکتہ کی غلط تاریخ غالب کے ایک اُردو خط پر مبنی ہے۔ اور سفرِ لکھنؤ کے دوران میں فرمانروائے اودھ اور نائب السلطنت کے ناموں میں حالی نے جو غلطی کی ہے وہ اس فارسی قصیدے کی بنا پر ہے جس میں سفرِ لکھنؤ کے حالات ہیں۔ اور جس میں نصرت دین حیدر اور روشن الدولہ بہادر کے نام آتے ہیں۔ غالباً یہ قصیدہ اس وقت لکھا گیا جب غازی الدین حیدر بادشاہِ سلطنت اور معتمد الدولہ وزیر تھے۔ (اسکے بعض اشعار گلِ رعنا کے دیباچہ میں درج ہیں) لیکن چونکہ اس وقت پڑھا نہ گیا۔ لبعد میں ناموں کی تبدیلی سے پیش ہوا۔ حالی نے بعد کے ناموں کو ہی اصل نام سمجھا۔ اور غلطی میں مبتلا ہوگیا۔ حالی کو تحقیق و تنقید کی وہ بعض سہولتیں (مثلاً مکمل جنتریاں۔ شاہانِ اودھ کی انگریزی اور اُردو تاریخیں) حاصل نہ تھیں جو موجودہ تذکرہ نگاروں کو میسر ہیں۔ اور وہ ان غلط فہمیوں کا شکار ہوگیا جن سے مہر صاحب کی کتاب یا غالب نامہ محفوظ ہے لیکن پھر بھی یادگارِ غالب میں تحقیق و ریسرچ کی مخلصانہ اور بالعموم کامیاب کوشش کے آثار نمایاں ہیں +

بے ترتیبی سے لکھے گئے ہیں۔ اور تاریخی تسلسل کا لحاظ نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کتاب میں سطحی واقعات درج ہیں۔ لیکن غالب کی ذہنی نشوونما اور اس کی باطنی کشمکشیں اور الجھنیں نمایاں کرنے کی کوئی کوشش نہیں۔ تیسرا اعتراض ہے۔ کہ یادگار میں شاعر کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ ہُو بہُو واقعات کے مُطابق نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراضات بالکل بے وزن نہیں۔ لیکن ان سے کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگار میں تاریخی تسلسل نہیں لیکن اس میں ایک قسم کا فنی تسلسل ضرور ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ کہ اس میں واقعات بے ترتیبی سے درج ہیں۔ اور اندراجات کی دلچسپی کا یہ عالم ہے۔ کہ کتاب شروع کر کے ختم کیے بغیر اسے بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم سوانح نگاری میں تاریخی تسلسل کی اہمیت مانتے ہیں۔ لیکن اس کا فقدان ایک ایسی کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسری خوبیاں بآسانی کر سکتی ہیں۔ اور اگر دوسری خوبیاں موجود نہ ہوں۔ تو اس کی موجودگی ایک ایسی بڑی خوبی نہیں۔ کہ دوسری کوتاہیوں کو چھپا سکے۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں سرسید کے واقعاتِ زندگی بڑی باقاعدگی اور تاریخی تسلسل سے لکھے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یادگارِ غالب حیاتِ جاوید کی نسبت بدرجہا زیادہ کامیاب سوانح عمری نہیں!

یادگار میں نفسیاتی تعمق کی کمی کی جو شکایت ہے۔ وہ ضرور صحیح ہے۔ لیکن اگر یہ کمی یادگارِ غالب میں ہے۔ تو اس دور کی کونسی سوانح عمری ہے۔ جس میں یہ کمی نہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ عملی نفسیات کی نشوونما مغرب میں بھی حال ہی کی چیز ہے۔ اور حالی سے اسکی توقع رکھنا بے انصافی ہے۔ تیسرا اعتراض بھی بالکل بے جا نہیں۔ اور یادگار غالب کے چند ایک بیانات ایسے ہیں جن میں سوانح نگار کے حسن ظن کو دخل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دو تین

باتیں دھیان میں رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یادگارِ غالب میں کوئی اصولی غلط بیانی یا بے انصافی نہیں۔ دوسرے یہ کہ حالی خود طبعاً اس قدر نیک تھا۔ کہ اس کی نظر دوسروں کی نیکیوں پر ہی پڑتی حالی کی یہ "نگاہِ پاک بیں" ایک نقادانہ خوبی نہ سہی۔ لیکن اس کی اخلاقی پاکیزگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ بعض وجوہ ایسے تھے۔ جن کی بنا پر حالی نے قصداً غالب کی خامیاں نمایاں کرنے سے احتراز کیا۔ حالی نے جس وقت یادگارِ غالب لکھی۔ اس وقت غالب کی شہرت عام اور مسلمہ نہ تھی۔ اور کتاب کی تصنیف کا مقصد عوام کو غالب سے روشناس کرانے کا تھا۔ اب اگر ایسی حالت میں حالی بے خوفی سے شاعر کے تمام نقائص نمایاں کر دیتا تو ڈر تھا۔ کہ ان کی بنا پر ظاہر بین عوام بدک جاتے۔ اور کتاب کی تصنیف کا اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ حالی نے خود اس الجھن کا اظہار حیاتِ جاوید کے دیباچے میں کیا ہے۔ اور اپنی ابتدائی سوانح عمریوں (حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب) کی نسبت لکھا ہے:۔

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ کہ کسی شخص کی بائیوگرافی[1] کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ اور اسکے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے۔ اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"

---

[1] حالی نے خود تسلیم کیا ہے۔ کہ "ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔" لیکن جن حالات میں یادگارِ غالب لکھی گئی۔ ان کا خیال کرتے ہوئے حالی کا طریقِ کار ہی صحیح معلوم ہوتا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

یادگارِ غالب کا تنقیدی حصّہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دو حصوں میں اُردو نظم اور اُردو نثر پر تبصرہ ہے۔ اور باقی دو حصّوں میں فارسی کلام اور فارسی نثر پر۔ فنی نقطۂ نظر سے یادگارِ غالب کا تنقیدی حصّہ اس قدر عمیق اور بلند پایہ نہیں جس قدر مقدمۂ دیوانِ حالی۔ لیکن اس طویل حصّۂ کتاب کے صفحے صفحے سے حالی کی سلامت روی، حسنِ مذاق اور عوام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور ان کی استعداد کے مطابق طرزِ تحریر اختیار کرنے کی قابلیت نمایاں ہے۔ کتاب کا مقصد عوام کو مرزا کی شخصی اور ادبی خوبیوں سے واقف کرانا تھا۔ اس لئے وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔ جو اس مقصد کے حصُول کے لئے موزوں تھا۔ کتاب کا بہت سا حصّہ اُردو اور فارسی نظم و نثر کے نہایت بامذاق انتخاب پر مشتمل ہے۔ مشکل اشعار کا مطلب آسان اُردو نثر میں شعر کے ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اور جہاں کہیں کسی شعر کے متعلق مزید تشریح یا تبصرے کی ضرورت تھی۔ وہاں وہ بھی مہیا کر دیا ہے۔ ہر حصّے کے شروع میں ایک عام تبصرہ ہے۔ جس میں نفسِ مضمون کے مطابق اُردو یا فارسی نظم و نثر کی خصوصیات درج کی ہیں۔ اور انہیں مثالوں سے واضح کیا ہے۔ تمام کتاب میں حالی نے کہیں خطیبانہ جوش و خروش یا مبالغے سے کام نہیں لیا۔ ناظرین کو مرعوب کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں۔ شروع سے اخیر تک مصنف کی یہی کوشش رہی ہے۔ کہ سیدھے سادھے الفاظ میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۵)

آج بھی جبکہ حالات بہت بہتر ہیں۔ اور غالب کی شہرت کو کسی جائز تنقید سے ضعف پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ غالب نمہ کے بعض اندراجات سے متاثر ہو کر قتیل اور غالب کے مصنف نے غالب کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس سے، اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ حالی کے لئے "کریکل طریقہ سے" غالب کی سوانح عمری لکھنا کس قدر خطرناک تھا۔

غالب کی تصنیفات کی خصوصیات بیان کر دے۔ مشکل اشعار کی الجھنیں صاف کر دے۔ اور اس کی تصنیفات کا ایک نمایاں حصہ طویل فارسی کلیات اور دوسری تصانیف سے انتخاب کر کے ناظرین کے سامنے پیش کر دے۔ تاکہ وہ اسے سمجھ کر اس میں اس کی خوبیوں کے مطابق دلچسپی لینا شروع کریں۔ کتاب میں جہاں کہیں غالب کا اردو اور فارسی شاعروں اور نثر نویسوں کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ وہاں بھی سلامت روی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اور کوئی رائے ایسی نہیں ظاہر کی جو بے انصافی اور جنبہ داری پر مبنی ہو ۔

بجنوری۔ لطیف

یادگار کے بعد غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا سلسلہ اب تک برابر جاری ہے۔ بیشتر کتابیں اردو دیوان کی شرحیں ہیں۔ جن میں ضمناً مرزا کے حالات درج ہیں۔ اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ مستقل اور قابلِ ذکر کتابیں جو یادگارِ غالب کے بعد غالب کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ دو ہیں[۱]۔ محاسنِ کلامِ غالب۔ اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب۔ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے۔ ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ اور اگرچہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں اخذِ حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی مرزا کی اردو نثر اور فارسی نظم و نثر پر کوئی تبصرہ یادگار سے بہتر آج تک شائع نہیں ہوا۔ البتہ ان کے اردو کلام کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یادگار کے بعد دوسری کتاب ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ تھی۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس میں کئی فقرے ایسے لکھ گئے ہیں۔ جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں اور انہوں نے کئی اشعار کو بھی ایسے معنی پہنائے ہیں۔ جو شاعر کے خیال میں نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا مقدمہ اردو کی ایک قابلِ ذکر تصنیف ہے۔ ایک تو اندازِ تحریر اور زورِ عبارت کے نقطۂ نظر سے۔ اور دوسرے کلامِ غالب کے کئی پہلوؤں پر جو تبصرہ انہوں نے

[۱] یہ اندراج ۱۹۳۶ء کا ہے ؛

کیا ہے۔ وہ وسیع مطالعہ اور غور وخوض پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی تصنیف کو محاسن کلامِ غالب کا جواب سمجھنا چاہیئے۔ ان کی کتاب میں جنوبی ہندوستان کی باقاعدگی اور منطق ہے اور کلامِ غالب کا مطالعہ جن اصولوں پر انہوں نے کیا ہے۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ کڑے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اُنہوں نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ ایک تو غالب کے متعلق اندھی خوش اعتقادی کا جو سیلاب بہا آتا تھا۔ اُسے اُنہوں نے روکا اور الہلال کے اجرا کے بعد جو جذباتی طرزِ تحریر اور طرزِ تنقید اُردو میں عام ہو گیا تھا اُس کی اصلاح کی کوشش کی۔ دوسرے غالب اور کلامِ غالب کے متعلق کئی اہم باتیں تھیں۔ جن کی طرف سب سے پہلے انہوں نے توجہ دلائی۔ لیکن شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہوں گے۔ کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو انگریزی سے قریب قریب نابلد تھا یعنی حالیؔ۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگارِ غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا نہیں شائع ہوا۔ جس میں اُس سے کم خامیاں ہوں۔ اور پھر یادگار کے مطالعہ سے یک طرفہ اور غیر معتدلانہ رائے قائم ہونے کا کوئی احتمال نہیں جو ڈاکٹر بجنوری یا ڈاکٹر لطیف کی کتابوں سے قائم کی جاسکتی ہے ؛

کلامِ غالب کی خصوصیات

حالیؔ نے مرزا کے کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو جدّتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات کے علاوہ ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں۔ بلکہ اظہارِ مطالب کے لئے بھی بہت موزوں تھیں۔ دوسرے استعارہ اور کنایہ کا زیادہ استعمال تیسرے شوخی اور ظرافت۔ چوتھے ایسے اشعار کی بہتات جن کے ایک سے زیادہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے چوتھی

خصوصیت جسے ڈاکٹر بجنوری نے بہت سراہا ہے۔ بعض لوگوں کو بڑی پسند ہے۔ اور ہندوستان میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں۔ جن کے لکھنے اور سمجھنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑے۔ چنانچہ سنسکرت میں چند ایک ایسی نظمیں مشہور ہیں۔ جنہیں دائیں سے بائیں پڑھا جائے تو رام کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اوپر سے نیچے پڑھیں تو دشمن کی۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ایسے اشعار کا تعلق دل سے نہیں، دماغ سے ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں کو کمالِ شعر گوئی سمجھا جائے۔ تو شاعری، جسے دلی جذبات کا اظہار ہونا چاہیئے۔ معموں کا بے کیف مجموعہ بن جاتی ہے +

باقی تین خصوصیتیں ضرور قابلِ تعریف ہیں۔ اور حالی نے مناسب مثالوں سے انہیں بہت واضح کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہوں کی مثالیں دی ہیں۔ جو غائر مشاہدۂ فطرت پر مبنی ہیں لیکن جن ترکیبوں کو انہوں نے مرزا کی الفاظ سازی اور خوش نگاری کا نمونہ بتایا ہے (صفحہ ۴۴) ان کا جزوِ غالب بھی استعارے ہی ہیں۔ جن سے دو لفظوں میں غالب نے ایک مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔ مثلاً موجِ نگاہ، وادیٔ خیال، فردوسِ گوش، دامِ تمنا وغیرہ۔ فی الحقیقت مرزا تشبیہہ اور استعارہ کے بادشاہ تھے۔ اور دنیا کے شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نئی اور موزوں تشبیہوں اور استعاروں کی وہ افراط ہو۔ جو ان کے کلام میں ہے +

غالب کی تشبیہیں اور استعارے

مرزا کا بہت سا ابتدائی اردو کلام صائب کے رنگ میں تھا۔ اور اکثر غزلوں میں مصرعِ ثانی تمثیلی ہوتا تھا۔ جو تشبیہوں کی افراط اس زمانے کے اشعار میں تھی۔ وہ بعد کے اشعار میں نہیں یہ صحیح ہے کہ یہ تشبیہیں نئی تھیں۔ لیکن ان میں سے کئی انگریز شاعر جان ڈن کی تشبیہوں کی طرح غرابت سے خالی نہ تھیں۔ مثلاً جہاں مرزا نے اپنے تئیں "طائرِ رنگ پریدہ" کا

گھونسلا بتایا ہے یا "گلِ دستارِ یار" کو سوا نیزے پہ آئے ہوئے "آفتابِ صبحِ محشر" سے مانا قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کی تشبیہیں اس طرح شاعرانہ حسن یا موزونیت سے عاری نہیں۔ وہ نئی ہیں۔ لیکن اس لئے کہ جن مضامین کی توضیح کے لئے انہیں استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی نئے تھے۔ مثلاً

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بشرع آویز و حق میخوز مجنوں کم نہ آرے — کہ دل با محمل است اما زباں با سارباں دارد

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

غم چو ہم در افگند رو کہ مراد میدہد — دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد میدہد

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے — کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

تشبیہ اور استعارہ کا استعمال فقط مضمون کی وضاحت کے لئے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک کامیاب شاعر کے استعارے بسا اوقات اس کے مضامین سے بھی زیادہ دلآویز ہوتے ہیں۔ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اور ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے بھی عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ کیا ہے:-

Ah, Love! could you and I with Fate conspire
To grasp this sorry Scheme of Things entire,
Would not we shatter it to bits—and then
Remould it nearer to the Heart's Desire!

غالب اس انتہائی شاعرانہ بلندی پر تو کبھی نہیں پہنچے لیکن تخیل کی بیباکی جو اِن اشعار کو ممتاز کرتی ہے۔ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی اور تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی۔ مثلاً حمد میں کہا ہے ع

اے فلکہا حباب قلزمِ تو

یا ایک فارسی مصرع ہے ع

خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد

یا

از مہرِ جہاں تاب اُمیدِ نظرم نیست　　　این تشت پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز

قدیم یونانی ڈرامہ میں ٹریجیڈی کا ہیرو ایک غیر معمولی اوصاف کا آدمی ہوتا تھا۔ جن مشکلوں سے اُسے واسطہ پڑتا۔ وہ انسانی بس کی نہ ہوتیں۔ مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا۔ غالب نے اپنی زندگی کے متعلق یہی خیال تشبیہوں کی مدد سے ظاہر کیا ہے۔ اور ان میں سے ایک دو تو اس قدر موزوں ہیں۔ کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آسکتیں ؎

بوادیئے کہ دراں خضر را عصا خُفت است　　　بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفت است

یعنی زندگی کی ایک ایسی دُشوار گزار وادی میں جہاں خضر کی راہنمائی بھی کام نہیں دیتی اور جہاں میرے پاؤں چلنے سے عاجز ہیں وہاں مَیں سینے کے بل چل رہا ہُوں!

غالب نے ایک اور جگہ اپنی جسارت اور انسانی بے بسی کی تصویر نہایت واضح اور موثر تشبیہوں کی مدد سے پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

می ستیزم با قضا از دیر باز　　　خویش را بر تیغِ عُریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر می کنم　　　بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم

غالب کی شاعری کے پانچ دور

ہم نے ارمغانِ غالب میں مرزا کے کلام کو ردیف وار نہیں بلکہ سن ترتیب سے شائع کیا ہے۔ اور ان کی شاعری کے پانچ دور قرار دئے ہیں۔ پہلے دور میں ان اشعار کا انتخاب ہے جو پچیس برس کی عمر (۱۸۲۱ء) سے پہلے لکھے گئے۔ اور قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج ہیں۔ دوسرے دور میں وہ اشعار ہیں۔ جو قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے اس قلمی نسخہ میں موجود ہیں۔ جو علامہ شیرانی کے کتب خانہ میں ہے۔ اور جس میں ۱۸۲۷ء سے پہلے کے اشعار ہیں۔ تیسرے دور میں اس زمانے کے اشعار ہیں۔ جب مرزا کی توجہ بیشتر فارسی شعر گوئی کیطرف تھی اگرچہ کبھی کبھار وہ کسی ضرورت سے اردو اشعار بھی کہہ لیتے تھے۔ اس دور میں ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک کے فارسی کلام کا انتخاب اور اس زمانے کے اردو اشعار ہیں۔ چوتھا دور مرزا کا درباری دور ہے۔ اس میں ہم نے وہ اردو اشعار درج کئے ہیں۔ جو ۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھے گئے۔ اور اس زمانے کے فارسی اشعار کا انتخاب بھی درج کیا ہے۔ پانچویں دور میں ان اردو فارسی اشعار کا انتخاب ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے۔

کلام غالب کی تاریخی تدوین سے ہم نے مرزا کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمیں امید ہے۔ کہ جب اس نقطۂ نظر سے ان کے کلام کا غائر مطالعہ ہوگا۔ تو مرزا کی شاعری کی ارتقا زیادہ وضاحت اور صحت سے لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ اس تدوین کے دوران میں ہمیں جو باتیں قابلِ ذکر معلوم ہوئیں۔ ان کا ملخص نذرِ ناظرین ہے۔

ابتدائی دور

ابتدائی دور کی نسبت عام طور پر معلوم ہے۔ کہ فارسی الفاظ اور تراکیب کی

کثرت سے زبان بہت ثقیل ہوگئی تھی۔ اور چونکہ مضامین بھی عجیب و غریب اور عدم مشاہدے یا دنیائے شاعری سے بہت دور تھے اس لئے ان اشعار کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ اس کے علاوہ یہ اشعار شاعرانہ حُسن سے بھی عاری ہیں۔ اُن میں آمد کم ہے۔ آورد اور تصنع زیادہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کی تمام محنت عجیب و غریب خیالات اور دُور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی تھی۔ شعریت کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ مرزا اس دور کے ایک مطلع کی نسبت خود لکھتے ہیں۔ "اس مطلع میں خیال ہے دقیق۔ مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لُطف زیادہ نہیں"۔ یہ مطلع حسبِ ذیل ہے :-

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہُوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہُوا

مرزا کی اہم ترین خصوصیت انسانی فطرت سے واقفیت ہے۔ جو ان کے بعد کے کلام کے ہر صفحہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائی دُور میں اس کا وجود قریب قریب عنقا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف اشعار بعید از فہم تھے۔ بلکہ جیسا کہ غالبؔ نے خود کہا ہے "مضامین بیشتر خیالی" تھے۔ یہ اشعار کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہ تھے۔ بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پروا دماغ میں تھا۔ کئی جگہ ان کی بُنیاد محض رعایت لفظی پر ہے۔ اور وہ معنوی حُسن سے بالکل عاری ہیں مثلاً

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں — میرے ہاتھوں کو جُدا باندھتے ہیں

یا

اسد قربانِ لطفِ جورِ بیدل — خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

یا

شاید کہ مر گیا ترا رُخسار دیکھ کر — پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نُور تھا

کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں کتابی اور مروجہ تشبیہوں پہ زورِ دماغ صرف کر کے انہی سے ایک نیا خیال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس طرح یہ اشعار حقیقت سے بہت دُور ہوگئے ہیں۔ مثلاً شعرا شانہ کو ہاتھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا نے اس تشبیہ کو کسی نفسیاتی حقیقت کی وضاحت یا طرزِ ادا کی دلکشی کے لئے تو شاید کہیں استعمال نہیں کیا۔ لیکن تشبیہ کے مختلف پہلوؤں پہ نظر کر کے اور نئے پہلو سوچ کر انہی پہلوؤں کو مضمونِ شعر قرار دیا ہے مثلاً

کس کا دل زُلف سے بھاگا کہ اسدؔ　　دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

ایک شعر میں اس تشبیہ کو بطور تشبیہ کے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس کے اتنے دُور از کار اور غیر طبعی پہلو پہ توجہ کی ہے۔ کہ اس سے نفسِ مضمون میں اور پیچیدگیاں پڑ جاتی ہیں۔ اور کوئی شاعرانہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی ؎

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں　　جُوں شانہ پشتِ دست بہ دنداں گزیدہ ہوں

ناصر علی سرہندی اور غنی کے مقلدین تو ان اشعار کو "ندرتِ خیال" اور "مضمون آفرینی" کا بہترین نمونہ سمجھتے۔ لیکن مرزا متاخرین فارسی شعرا سے بہتر مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ سمجھ گئے۔ کہ یہ "خیالی قلابازیاں" کمالِ شاعری نہیں +

ان خصوصیات کے علاوہ ظرافت جو مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا بھی اس زمانے میں نشان نہیں ملتا۔ تصوف کے اشعار بھی ایک دو ہیں اور وہ بھی محض رسمی۔ چنانچہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کا مشہور اُردو قصیدۂ منقبت تو ۲۵ سال کی عمر سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ لیکن اس وقت مطلع یہ تھا ؎

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

جب بعد میں فارسی شعرا کے مطالعہ یا دوسرے اثرات سے طبیعت پر تصوّف کا رنگ زیادہ چڑھا۔ تو غالب نے مندرجہ بالا مطلع کی بجائے ذیل کا مشہور مطلع لکھ دیا جو صوفیانہ خیالات کا آئینہ ہے سے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں!

یہ زمانہ مرزا کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اور بظاہر اس میں عشق و محبت کے مضامین کی افراط ہونی چاہیئے۔ لیکن اس زمانے میں مضامین محض خیالی تھے۔ قلبی واردات کا اظہار نہ تھے۔ اسلئے عنفوانِ شباب کا کلام ہونے کے باوجود اس دورِ شاعری میں بہت عشقیہ اشعار نہیں ؛

اس زمانے میں مرزا نے کئی قصیدے منقبت میں لکھے۔ اور بہت سی اُردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے بہ غلو اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ لیکن بعد میں بالخصوص بعد کی اُردو غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں۔ مرزا کو ابھی تک کسی در پر جُبہ سائی کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ اس لئے پہلے دور میں مدحیہ قصیدہ کوئی نہیں ؛

بالعموم یہ کہنا صحیح ہے۔ کہ مرزا کی اس زمانے کی شاعری کتابی اور دماغی شاعری مرزا کی جن خصوصیات پر لوگ سر دھنتے ہیں۔ ان کا وجود عنقا تھا۔ لیکن اس دور کو سرے سے ہی بے فائدہ نہیں کہا جا سکتا۔ بیشک اس زمانے کی ادبی پیداوار مایوس کن ہے۔ لیکن دماغی کاوش و محنت کی جو عادت اس زمانے میں پڑی تھی۔ وہ مفید تھی۔ اور جب مرزا نے اسے صحیح طریقے سے استعمال کیا۔ تو اس کاوش و محنت کی بدولت، مرزا کے اشعار تازگی، جدت اور طرفگی خیال میں سب سے بڑھ گئے ؛

بادۂ نیم رس | یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا نے طرزِ شاعری

کب ترک کیا۔ لیکن چونکہ نسخۂ حمیدیہ میں صاف اور اعلےٰ درجے کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے اس لئے قرینِ قیاس ہے۔ کہ ۲۰۔ ۲۲ سال کی عمر تک یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد وہ ابتدائی طرز بالکل ترک کر چکے ہونگے۔ مرزا نے جس طریقے سے اپنا اسلوبِ شاعری بدلا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ ذیل کے مطلعوں والی غزلیں اور اپنا اردو کا بہترین قصیدہ وہ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے:۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی　　سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی　　امتحاں اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی
جبتک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　　مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ بھوپالی نسخہ میں کئی صاف اور بلند پایہ اشعار ایسے ہیں جن میں بیدل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور جو دورِ ثانی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے انہی کے مشابہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے تو یہ اشعار دوسرے دور کے اشعار کے ساتھ ترتیب دئے جانے چاہئیں۔ لیکن قیاس آرائی کے سوا اُن کی تدوین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اور ہم نے خارجی شہادت کی بنا پر نہیں نسخہ بھوپال کو اقتباسات کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ویسے یہ ظاہر ہے۔ کہ بیس۲۰ سے پچیس۲۵ برس کی عمر تک مرزا نے جو اشعار لکھے وہ اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب اہلِ زبان

آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ اور خیالات اور مضامین بھی شگفتہ اور سہل الفہم ہوتے جاتے تھے۔ اس دورِ ارتقا کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بیدل کا رنگ غائب تھا اور کئی نہایت صاف مثلاً:۔

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دوسرا دور ۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۷ء

دوسرے دور میں ہم نے وہ اردو اشعار درج کئے ہیں۔ جو نسخۂ بھوپال کی تاریخِ کتابت کے بعد لکھے گئے۔ لیکن نسخۂ شیرانی میں موجود ہیں۔

مرزا کے ابتدائی طرزِ شاعری کے متعلق ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ غالباً بیس بائیس سال کی عمر تک یعنی ۱۸۱۷ء تا ۱۸۱۸ء کے قریب وہ بیدل کی تقلید ترک کر چکے تھے۔ اور زبان و خیال کے لحاظ سے ان کے کلام میں وہ خصوصیات آ گئی تھیں۔ جو دوسرے دور کا مابہ الامتیاز ہیں۔ معنوی نقطۂ نظر سے شاید بہتر ہوتا۔ کہ ہم دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء کی بجائے ۱۸۱۷ء سے شروع کرتے۔ لیکن ۱۸۱۷ء تا ۱۸۱۸ء تک کے اشعار معین کرنے کا ذریعہ قیاس کے سوا کوئی نہیں۔ اس لئے ہم نے دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء سے شروع کیا ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ۱۸۲۱ء سے بہت پہلے مرزا اپنا طرزِ شاعری بدل چکے تھے اور جن اشعار کو ہم نے دور نمبر ۱ کے ضمن میں درج کیا ہے۔ ان میں کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو زبان اور مضمون کی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے دور کے سمجھے جانے چاہئیں۔

مرزا کا دوسرا دورِ شاعری ہم نے ۱۸۲۷ء پر ختم کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خیال ہے۔ کہ ان کی توجہ اردو کی بہ نسبت فارسی کی طرف زیادہ ہو گئی۔ اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک انہوں نے زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ انہوں نے

اُردو شعر گوئی یک قلم ترک کر دی تھی۔ قیامِ کلکتہ کے دوران میں جب وہ فارسی غزلیں، قصیدے قطعے اور مثنویاں لکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں بھی اُنہوں نے اُردو شعر کہے ہیں۔ (مثلاً چکنی ڈلی کی تعریف میں) اس کے علاوہ جب اُنہوں نے (۱۲۴۸ ہجری میں؟) منتخب اردو دیوان اشاعت کے لئے مرتب کیا۔ تو پرانی غزلوں کے تتمے لکھے۔ اور بعض دوسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے بعد چند ایک اہم اُردو مشاعروں کے لئے اُردو غزلیں لکھیں لیکن ان اشعار کی تعداد اس قدر تھوڑی ہے۔ کہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک کے بیس سال، مرزا کے فارسی کلام کا دَور سمجھے جا سکتے ہیں۔

نفسیاتی ژرف بینی

دوسرے دَور میں آئینہ طبیعت کا زنگ صاف ہو گیا ہے۔ فارسی ترکیبیں کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدل اور صائب کے بجائے عرفی اور نظیری کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں اور اظہارِ خیالات میں خلوص بہت نمایاں ہے۔ مضامین کے نقطۂ نظر سے اس دَور کی اہم ترین خصوصیت نفسیاتِ انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔ جو دیوانِ غالب کے صفحے صفحے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم اس سے پہلے مرزا کا بیان نقل کر چکے ہیں۔ کہ جب ہوش آیا۔ تو عرفی اور نظیری کی تقلید نے انہیں اس سراب سے نکالا۔ جس میں بیدل کی تقلید انہیں لے گئی تھی۔ عرفی اور نظیری کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی تھی۔ جس میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان ہوتی تھیں۔ لیکن معاملہ بندی کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ محبت کی وسیع اور متفاوت دُنیا میں سے فارسی شعرا نے چند حالتیں انتخاب کر لی تھیں اور انہی کو مختلف دلآویز طریقوں سے بیان کر دیا جاتا تھا۔ غالب کے پیشِ نظر بھی انہی شعرا کے نمونے تھے۔ لیکن ان کی نظر عہدِ اکبر کے فارسی شعرا سے بہت وسیع تھی۔ اور محبت کے تمام

پہلوؤں پر حاوی تھی۔[1] مثلاً پرانے شعرا کے نزدیک نقطۂ عاشق ہی نامراد اور مایوس ہونا تھا۔ اور دوسرے سب کامیاب۔ لیکن مرزا کی نظر اپنی ناکامی اور مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر رک نہ جاتی۔ اور فرطِ جذبات کے باوجود وہ زندگی کی صحیح تصویر ہی دیکھتے۔ چنانچہ اس مضمون پر ان کے کئی شعر ہیں۔ جو مشرقی عشق کے رسمی نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہیں۔ مثلاً ؎

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے　　　رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

ایسے اشعار کئی ہیں۔ لیکن ایک فارسی شعر تو بہت ہی پُرلطف ہے ؎

ماہم بہ لاغ ولابہ تسلی شویم کاش　　　ناداں ز بزمِ دوست چہ خوشنود میرود

اس خصوصیت کے علاوہ کہ مرزا کی نظر محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ایک توجہ طلب خصوصیت مرزا کی ژرف بینی ہے۔ یعنی ان کی نظر محبت بلکہ انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے۔ جن کی طرف عام طور پر خیال نہیں جاتا۔ اور ان کے کئی اشعار میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو بظاہر غلط یا عجیب اور توقعات کے خلاف نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ان پر غور کیا جائے۔ تو اُن کی صحت و صداقت سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ انسانی فطرت اور واقعات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ غالب نے ۲۶ برس کی عُمر سے پیشتر ہی دو شعر ایسے لکھے تھے۔ جو اس خصوصیت کی بہترین مثال ہیں۔ اور جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ شاعر کی نگہِ خارا شگاف پردۂ حقیقت کیسے عُریاں ہو گئی جس پر

---

[1] غالب عرفی کی نسبت کہتے ہیں ؎　　　او جستہ جستہ غالب دمن دستہ دستہ ام
عرفی گرفتہ است لیک نہ چوں من ولیں چہ گفتنا

ہماری ہم لفظی کی وجہ سے پرے پڑے رہتے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مرزا اگر اپنا بیان محبت تک ہی محدود رکھتے۔ اور اس کی گوناگوں کیفیتوں کو اس وسعت اور بالغ نظری سے بیان کر دیتے۔ تب بھی مشرقی شعرا میں وہ بے نظیر تھے۔ لیکن مرزا فقط قلمروِ محبت ہی کے رازدار نہ تھے۔ بلکہ محبت کے علاوہ قلبِ انسانی کی باقی تمام کیفیتوں سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرا شعر جو ہم نے نقل کیا ہے۔ وہ فقط محبت سے متعلق نہیں بلکہ انسان کی عام جذباتی زندگی پر صادق آتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں لوگ پروفیسر جیمز کے اس نظریے سے عام طور پر متفق ہیں۔ کہ جذبات کا اظہار ان کی توسیع بلکہ تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ جب شروع شروع میں جیمز نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تو سب عقلمندوں کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ اور آج بھی عام توقعات کے خلاف نظر آتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ معلمِ نفسیات کا ایک مسئلے کو دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کرنا اور ایک شاعر کا اپنے احساسات کو نظم کر دینا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن آخر یہ ایک امرِ واقعی ہے۔ کہ مرزا نے یہ شعر جیمز کی کتاب سے بہت پہلے لکھا تھا۔ اور شاعر کی چشمِ بصیرت اس "رازِ نہانِ روزگار" سے "محرم" ہوگئی تھی۔ جس کے لئے سائنسدان کو بھی برسوں انتظار کرنا تھا۔ یہی وہ اشعار ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعارِ این قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب کے ہاں اس قبیل کے اشعار بہت ہیں جن میں قلبِ انسانی کی وہ کیفیتیں نظم ہیں۔ جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت واقعات پر مبنی ہیں۔ ہم انمیں سے

چند اشعار درج ذیل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ جوں جوں نفسیات کا علم وسیع ہوتا جائے گا۔ غالب کے کئی اشعار کی دلچسپی بڑھتی جائے گی مثلاً ع

شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

یا ع۔ میانۂ من و او شوق حائل افتادست

رونق بہ بلا داد کہ درگرہیم بلا نیست ‏ ‏ مرغِ قفسی کشمکش دام ندارد

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ‏ ‏ تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

مدعی خواست رود بر اثر من غالبؔ ‏ ‏ آنچہ خود داشت، بہ سودائے ہوس من بودن رفت

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ‏ ‏ مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرزا غالب کی کامیاب نفسیات نگاری کی کئی وجہیں تھیں۔ ایک تو ان کا ذہنی اور جذباتی تجربہ بہت وسیع تھا۔ ان کی زندگی میں "منوہ بالشان" اور اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔ لیکن شاعرانہ زود حسی نے روزمرہ کے معمولی واقعات کو چمکا دیا تھا۔ اور مرزا کے مشاہدہ و تجربہ

لہ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مرزا کے رشک کے اشعار جو بعض لوگوں کو بہت پسند ہیں۔ نفسیاتی حقیقت پر مبنی نہیں۔ غالب میں انانیت بہت نمایاں تھی۔ اور یہ قدرتی امر تھا۔ کہ وہ رشک کے بہت سے مضامین نظم کرتے لیکن ان اشعار میں انہوں نے مبالغے اور شوخی سے اس قدر کام لیا ہے۔ کہ مضمون تو ضرور پُرلطف ہو گیا ہے۔ لیکن نفسیاتی حقیقت نظر سے پنہاں ہو گئی ہے۔

میں تنوع کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ رندی اور درویشی، خوشی اور افسردگی، بیقراری اور تسلیم و رضا، ان سب منزلوں سے گزر چکے تھے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ اپنے ذہنی مشاہدات پر اسی طرح ٹھنڈے دل سے اور جذبات و احساسات کو قابو میں رکھ کر غور کرتے۔ جس طرح ایک سائنسدان اپنے کیمیائی تجربات کو دیکھتا ہے۔ اس لئے انہیں اس مشاہدات کی دنیا میں وہ چیزیں نظر آجاتیں۔ جن سے بعض اس لئے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ وہ ان کے تجربے سے باہر ہیں۔ اور بعض اس لئے کہ وہ انہیں محسوس کرتے وقت، شدتِ احساس سے اس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں کہ صحیح مشاہدۂ نفس کے قابل نہیں رہتے۔ مرزا اپنے مسلک کی نسبت ایک خط میں مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں۔ "اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کر لیا ہے۔"

لیکن مرزا کا علمِ نفسیات اپنے مشاہدۂ نفس تک محدود نہ تھا۔ وہ بڑے مردم بیں اور مردم شناس تھے۔ آدمیوں کو پرکھنا، اور ان کے افعال و اعمال بلکہ ان کے "نہاں خانۂ دل" کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔ "ستّر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں۔ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں سے، زمرۂ عوام کا شمار نہیں۔" اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں۔ "میں آدمی نہیں ہوں، آدم شناس ہوں۔ شعر

نگہم نقب ہے زد بہ نہانخانۂ دل

مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم"

لفظی صناعی

دوسرے دور کے آخر یا تیسرے دور کے شروع میں مرزا نے اردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ یہ حک و اضافہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو

سادہ بنانے کے لئے کی گئی ہیں۔ اور دقیق فارسی الفاظ یا ترکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا۔ انہیں بدل دیا ہے۔ مثلاً

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائیگا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

عشرت ایجاد جہ بوئے گل و گو دودِ چراغ   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بعض جگہ چند الفاظ بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہو گیا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

پہلے یہ شعر اس طرح تھا ؎

ہے مری وحشت عدوئے اعتباراتِ جہاں   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا ؎

نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شروع شروع میں کئی تشبیہیں یا ترکیبیں کسی مضمون یا لفظ کی رعایت سے لکھی تھیں، جس سے مضمون زیادہ دقیق ہو گیا تھا۔ غالب نے انتخاب کے وقت لفظی رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ مثلاً

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

پہلے "داغِ حسرتِ دل" کی رعایت سے "گُنہ" نہیں بلکہ "بے گُنہی" لکھا تھا۔ اور شعر یُوں تھا۔
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے حسابِ بے گُنہی اے خدا نہ مانگ
ضعف سے ہے۔ نے قناعت سے یہ ترکِ جُستجو　یا　ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم
پہلے "تکیہ گاہ" کے خیال سے "گرانِ خوابی" لکھا تھا۔ لیکن لفظی رعایت قائم رکھنے سے مضمون پیچیدہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلا مصرع بدل کہ مضمون صاف کر دیا۔ نقشِ اوّل ملاحظہ ہو ؎
ضُعف نے باندھا ہے پیمانِ گرانخوابی اسدؔ　　ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم
زبان کی اس ترمیم اور الفاظ کے تغیر و تبدل کے علاوہ غالبؔ کے کلام میں کئی جگہ ایک خیال مختلف صورتوں میں نظم ہُوا ہے۔ یعنی نفسِ مضمون تو اصُولاً ایک ہے۔ لیکن مختلف اشعار میں اظہارِ خیال نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ بعض جگہ یہ مضامین ایسے ہیں۔ جو خود شاعر کو مرغوب ہیں (مثلاً بہشت کا استہزا۔ قلب انسانی کی فطری غمگینی۔ انسان کی بے بسی۔ رشک۔ مذہب کے معاملے میں آزاد خیالی اور چونکہ شاعر کے دل میں ان کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ انہیں بار بار نظم کرنے پر مجبور تھا۔ بعض جگہ ایسا بھی ہُوا ہے۔ کہ شاعر کو ایک مضمون سُوجھا۔ اُس نے اسے نظم کر دیا۔ لیکن اظہارِ خیال سے مطمئن نہ ہُوا۔ اور وہ خیال اُسے گدگداتا رہا حتےٰ کہ نقشِ ثانی میں وہ بہتر طریقے سے ادا ہُوا۔ مثلاً ؎

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مضمون بہت بلند پایہ نہیں۔ اور اس میں کسی شاعرانہ رفعت کی گنجائش کم ہے۔ لیکن جہاں تک طرزِ ادا کی لطافت۔ زبان کی تازگی اور بے ساختگی کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہے ؎
مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے　　بیٹھنا آکے وہ اُس کا تری دیوار کے پاس!
وہ نشتر ہیں کہ دل ہوتی جاتی ہے نیزۂ دل کے پار　یا　جو ری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

خیال نفیس تھا۔ لیکن لفظی رعایت نے شاعر کے مطلب پر خفیف سا پردہ ڈال دیا تھا نقش ثانی شاعر کے شہکاروں میں سے ہے۔ اور اس میں لطفِ بیان نے خیال کو اس طرح چمکا دیا ہے کہ اس سے بہتر طریقِ اظہار تصور میں نہیں آسکتا ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے۔ کہ خیالات سے قطع نظر غالب کو طرزِ بیان کا بھی بہت خیال تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے عالی ہیں۔ اور زبان ذوق کی۔ اگر زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے۔ جو ایک جگہ مقبول ہیں تو دوسری جگہ ناپسند۔ یا آج مستعمل ہیں تو کل متروک۔ تو یہ خیال بیشک صحیح ہے لیکن اگر ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب، اُن کی ہم آہنگی اور نشست۔ تو مرزا کا مرتبہ تمام اُردو شعرا سے بلند ہے۔ وہ صرف معنی پرست نہ تھے۔ بلکہ حسن ظاہری کی قدر و قیمت بھی پہچانتے تھے ؎

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

مرزا نے اپنے کلام کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بھی پوری نظر رکھی ہے۔ اور اُن کے اشعار میں الفاظ فقط اظہارِ مطلب ہی کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شاعرانہ حُسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ان کا استعمال اور ترتیب ایسی ہے کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر ان کا ترنم اور ہم آہنگی ہی بہت پرلطف ہے۔ مثلاً ؎

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ہاں وہ نہیں خدا پرست ۔ جاؤ وہ بیوفا سہی   جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

سودا کی غزلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان قصیدے کی زبان ہے۔ اور فارسی ترکیبوں سے تغزل کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھاشا میں مٹھاس زیادہ ہے۔ اور یاس و حرمان کے اظہار میں وہ زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن آخر محبت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں طرح طرح کی حسیات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور انہیں نظم کرنے کے لئے ایک کامیاب شاعر الفاظ اور تراکیب بھی مختلف انتخاب کرے گا۔ غالبؔ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

مُدت ہُوئی ہے یار کو مہماں کئے ہُوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہُوئے

اسمیں محبت کی اُس حالت کا بیان ہے۔ جس میں بُجھا ہُوا دل جی اُٹھتا ہے۔ اور عشق و محبت کے ولولے طبیعت کو پھر بیقرار کرتے ہیں۔ یہ تمام غزل فارسی ترکیبوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن جوش و ولولہ کا بیان ہونے کے باعث یہ ترکیبیں اظہارِ مضمون کو اور بھی موثر کرتی ہیں۔ اور اُردو شاعری میں اس کیفیت کی اس سے بہتر تصویر شاذ ہی کہیں ہو +

اس کے برعکس جب مرزا مایوسی اور غم کا بیان کرتے تو فارسی ترکیبیں بہت کم ہوتی تھیں۔ مثلاً ؎

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی   میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند   کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یا ذیل کی غزل لیجئے جو مندرجہ بالا غزل کی طرح شاعر کے دلِ محزوں کی ایک اور دلآویز تصویر ہے ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فارسی شاعری
(۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء)

یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا نے فارسی شعر گوئی اس وقت شروع کر دی تھی۔ جب وہ آگرہ چھوڑ کر ابھی دہلی نہ آئے تھے۔ اور جب اُن کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شروع میں اُن کی توجہ زیادہ تر اُردو کی طرف تھی۔ اور فارسی کی طرف بہت کم۔ لیکن سفرِ کلکتہ سے کچھ عرصہ پہلے اُنہوں نے فارسی شعر گوئی پر زیادہ توجہ شروع کر دی۔ اور اس سفر کے دوران میں مُتعدد فارسی غزلیں ایک بلند پایہ فارسی مثنوی اور کئی ایسے فارسی قصائد لکھے جو ایک نومشق کا نتیجۂ فکر نہیں معلوم ہوتے +

قیامِ کلکتہ کے زمانے میں اور اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا نے فارسی اشعار زیادہ لکھے۔ اور اُردو اشعار کم۔ اور غالباً یہ کہنا بیجا نہیں۔ کہ ۱۸۲۷ء یا اس سے کچھ عرصہ بعد سے لے کر ۱۸۴۷ء تک مرزا کی اصل ادبی زبان فارسی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا اس زمانے میں گاہے گاہے اُردو اشعار کہتے رہے۔ اور اس کے بعد بھی جب درباری تعلقات کی وجہ سے اُنہوں نے اُردو پر زیادہ توجہ کی تو اس وقت بھی اُنہوں نے فارسی شعر گوئی کو یک قلم ترک

نہ کر دیا۔ لیکن مرزا کے اپنے بیانات اور اُن کے کلام کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر کے ایک طویل حصے میں اُردو سے دانستہ کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ اور غالباً اس کی ایک وجہ ذوق سے اُن کی چشمک تھی۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک ابتدائی فارسی قصیدے میں کیا ہے ؎

ملالِ خاطرِ حاسد زمن بداں ماند   کہ گردِ راہ بہ ہوا پیچد از سبکساری
چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فن است چوں بہ سخن   زدودہ ام زورق داغِ ننگِ ہم کاری!

مرزا کے اُس زمانے کے فارسی اشعار کو جب فارسی کی طرف ان کی زیادہ توجہ تھی ہم نے تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ لالۂ صحرا کے تحت میں ہم نے ان اشعار کا انتخاب درج کیا ہے۔ جو سفرِ کلکتہ کے دوران میں یا اس سے پہلے کہے گئے۔ گلِ رعنا کے تحت میں وہ اشعار ہیں۔ جو مرزا کے قلمی دیوان منقولہ ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ لیکن سفرِ کلکتہ کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں۔ تیسرے حصے میں ان اشعار کا انتخاب ہے۔ جو قلمی دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء میں تو موجود نہیں۔ لیکن خارجی اور داخلی شہادت کی بنا پر ۱۸۴۷ء سے پہلے کے کہے جاسکتے ہیں۔

مرزا کی ان غزلیات کے مطالعہ سے جو اُنہوں نے سفرِ کلکتہ کے دوران میں لکھیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک اُردو غزل گوئی کا تعلق ہے وہ اس زمانے میں بیدل کا رنگ ترک کر چکے تھے۔ لیکن فارسی غزلیات میں یہ رنگ ابھی نمایاں تھا۔ اور ان غزلوں کے اکثر اشعار دقیق خیالات اور دُور از کار تشبیہات سے پُر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ فارسی زبان میں یہ طرزِ شاعری نیا نہ تھا۔ اس لیے مرزا کی ان فارسی غزلیات میں وہ اجنبیت اور غرابت نظر نہیں آتی۔ جو ان کی ابتدائی اُردو غزلیات میں نمایاں ہے۔ پھر بھی ان غزلیات اور بعد کی بلند پایہ فارسی غزلیات میں واضح فرق ہے۔ یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے

کہ اگرچہ مرزا کی اس زمانے کی فارسی غزلیں دقیق اور خیالی مضامین سے پُر ہیں۔ لیکن اُنکے اس زمانے کی فارسی مثنویاں اور قصیدے ان نقائص سے بری ہیں۔ تحفۂ دیر اور بادِ مخالف دونوں کی زبان بہت صاف اور شگفتہ ہے اور اُن کے اس زمانے کے قصائد میں بھی خیال اور زبان کی وہ الجھنیں نہیں۔ جو اس زمانے کی فارسی غزلیات میں نمایاں ہیں +

مرزا کی فارسی غزل گوئی کا عہدِ زرّیں وہ زمانہ ہے۔ جس کا انتخاب ہم نے گلِ رعنا میں دیا ہے۔ ان کے ضخیم فارسی کلیات میں سوا تین سو سے زیادہ غزلیں ہیں۔ اور ان میں اُنچاس[۴۹] غزلوں کے سوا باقی تمام غزلیں اس زمانے تک لکھی جا چکی تھیں، اور صرف یہی نہیں کہ مرزا کی غزلوں کا بہت بڑا حصہ اس زمانے میں لکھا گیا۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی مرزا کی اکثر بہترین غزلیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ قرینِ قیاس ہے کہ غزلیات کا ایک حصّہ سفرِ کلکتہ سے پہلے لکھا جا چکا ہوگا۔ اور اس دور کی کئی غزلیں ہیں۔ جو زبان اور خیالات کے لحاظ سے قیامِ کلکتہ کی غزلوں سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن جو انتخاب ہم نے گلِ رعنا کے عنوان سے درج کیا ہے۔ اُس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں مرزا کی فارسی شاعری کا رنگ بہت نکھر گیا تھا۔ اور اُن کی اکثر بہترین غزلیں اسی زمانے کی ہیں +

۱۸۳۸ء کے قلمی دیوان میں طویل فارسی قصائد اور ترکیب بند نسبتاً کم ہیں۔ غزلیات کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان مرتب کرنے کے بعد مرزا نے طویل نظموں پر زیادہ توجہ شروع کی۔ ۱۸۴۳ء کے مشاعروں کے لئے مرزا نے فارسی غزلیں کہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جو قلمی دیوان مرتبہ ۱۸۳۸ء کے بعد اور مطبوعہ دیوان ۱۸۴۵ء کی ترتیب سے پہلے لکھی گئیں۔ لیکن اُن کی تعداد تھوڑی ہے اور طویل نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سب سے اہم فارسی مثنوی ابرِ گہربار بھی اس زمانے کی یادگار ہے +

۱۸۴۷ء کے بعد بہادر شاہ سے مرزا کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ اور اب انہوں نے "انبساطِ خاطرِ حضرت" کے لئے اُردو کو اپنی زبان بنایا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی فارسی قصائد بہادر شاہ، شاہانِ اودھ اور انگریزی حکام کی تعریف میں لکھے۔ لیکن اس دَور کی بہترین یادگار اُن کا اُردو کلام ہے۔ جس پر ہم آیندہ سطور میں تبصرہ کریں گے۔

مرزا اپنے فارسی کلام کو اُردو کلام کے مقابلے میں جس قدر اہم سمجھتے تھے اس کا اظہار انہوں نے اشعار اور خطوط میں جا بجا کیا ہے۔ اور حقیقتاً جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ تیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک انہوں نے زیادہ فارسی زبان میں شعر لکھے، تو مرزا کا یہ اظہارِ خیال کچھ عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت محض شخصی نہیں اُن کا فارسی کلام صرف اس لئے اہم نہیں۔ کہ یہ اُردو کے بہترین شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔ بلکہ فی نفسہٖ اس کلام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فارسی قریباً سات آٹھ سو سال تک شمالی ہندوستان کی ادبی زبان رہی ہے۔ اور اس دوران میں بہت سے خوشگو فارسی شعرا اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اقبالؔ اور شاید امیر خسرو کے سوا کوئی ہندوستانی فارسی شاعر ایسا نہیں۔ جس کا مرتبہ غالبؔ سے بلند ہو۔ مرزا کا فارسی کلیات قریباً پانسو صفحوں پر مشتمل ہے۔ جو قصائد اور غزلیات سبدِ چین[۱] میں ہیں۔ وہ اس پر مستزاد ہیں۔ مرزا نے غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی

---

[۱] یہ مجموعہ مدت سے نایاب تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مسٹر مالک رام ایم۔ اے نے نواب حبیب الرحمان کے کتب خانے سے حاصل کر کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مکمل ہے۔ لیکن اس وقت بھی غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو نہ کلیات میں ہیں۔ نہ سبدِ چین میں۔ مثلاً مثنوی دمغ الباطل (ملاحظہ ہو دستور الحمل اودھ قلمی نمبر ۲۲۹ کتب خانہ رام پور) یا مرزا کی پانچ مختصر فارسی مثنویاں جو نسخہ دیوان غالب بانکی پور کے حاشیے پر درج ہیں۔

قطعہ۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور کسی میں ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا سے پیچھے نہیں رہے ؛

ہندوستان کے فارسی نثر نویسوں کے متعلق مرزا اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ اور یہاں کے فارسی شعرا میں بھی امیر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے سوا وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ انہوں نے خیالات اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بالعموم ان فارسی شعرا کی پیروی کی ہے۔ جو ہندوستان میں پیدا ہُوئے یا ایران سے آ کر ہندوستان میں ایسے بسے کہ یہیں کی خاک ہو گئے۔ ابتدا بیدل کے رنگ میں کی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے جن شعرا کا تتبع کیا۔ ان میں عُرفی۔ نظیری اور فیضی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا غالب تحقیقاً فارسی شعرا کی اُس لڑی کے آبدار موتی ہیں۔ جس کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع اور اقبال پر ختم ہُوا۔ آج ایران کے ادبی نقاد اور ان کے ہمنوا یورپین مؤرخ قومی عصبیت یا مغربی طرزِ تنقید کی روایات کے زیرِ اثر ان شعرا کی قدر نہیں کرتے۔ ادھر ہندوستان میں بھی کئی لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ہندوستان کی فارسی شاعری کو ہندوستانی ادبیات کا حصّہ نہیں سمجھتے۔ ان دونوں طبقوں کی سرد مہری کی وجہ سے ہندوستان کی فارسی شاعری سے بے توجہی برتی جا رہی ہے لیکن جو لوگ مُلکی اور مذہبی اختلافات سے بالا ہو کر شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اس شاعری کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ اور کلیاتِ غالب میں سے جو طویل فارسی انتخابات ہم نے ارمغانِ غالب میں درج کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام میں بھی ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جو زورِ بیان اور رفعتِ تخیل کے لحاظ سے دَورِ آخر کی ایرانی شاعری سے بدرجہا بلند ہیں ؛

چوتھا دَور | چوتھا دَور مرزا کی شاعری کا درباری دَور ہے۔ اس زمانے میں مرزا نے کئی

فارسی قصائد لکھے۔ اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اس زمانے کی یادگار ہے۔ لیکن دربار سے تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے انہیں درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا۔ اور اس زمانے کے اکثر اشعار اُردو میں ہیں۔ بیشتر غزلیں ہیں جو مرزا نے بادشاہ کو خوش کرنے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے لکھیں۔ لیکن اُن کے علاوہ بادشاہ یا شہزادوں کی تعریف میں قصائد اور قطعات بھی ہیں۔ جب مرزا نے پہلی دفعہ دیوان ریختہ مرتب کیا تھا تو اس وقت تک کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ نسخۂ حمیدیہ میں کوئی مدحیہ قصیدہ نہیں۔ اس کے بعد فارسی زبان میں قصائد لکھے گئے لیکن درباری دَور میں مرزا کو اُردو زبان میں کئی مدحیہ قصائد لکھنے پڑے۔ جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں +

ان قصائد میں سے ایک دو کسی قدر پُر لطف ہیں۔ لیکن اس زمانے کی صحیح یادگار اُردو غزلیں ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ یہ دَور مرزا کی پختگی کا زمانہ ہے۔ اُنہوں نے بیدل کی پیروی بیس اکیس برس کی عمر میں ترک کر دی تھی۔ لیکن وسیع اور پیچیدہ مضامین سے اُنس باقی تھا۔ اس لئے اُنہیں شعر میں ادا کرنے کے لئے فارسی ترکیبوں کا استعمال گوارا کرنا پڑتا تھا۔ دورِ ثانی کے کئی اشعار میں زبان اور ندرتِ خیال میں ایک طرح کا تصادم ہے۔ لیکن مرزا نے لطفِ زبان کے لئے خیالات کو قربان نہیں کیا۔ درباری دَور میں البتہ لطفِ زبان ندرتِ خیال پر غالب آگیا ہے۔ اور اخیر کی چند غزلیات میں تو خیالات شگفتہ الفاظ اور دلپذیر طرزِ اظہار کے لئے محض زنگار آئینہ کا کام دیتے ہیں +

مرزا کی شاعری میں اس نمایاں تغیر کی وجہ درباری تعلق تھا۔ بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کی طرز کے مداح تھے۔ جسے ذوق نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی مشاعروں میں دیکھتے تھے۔ کہ وہی غزلیں مقبول ہوتی ہیں۔ جن کی زبان سادہ اور آسان ہو تشبیہیں اور

فارسی ترکیبیں اسقدر ہوں۔ جس قدر آٹے میں نمک۔ روزمرے اور محاورے کی افراط ہو۔ چنانچہ مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ اور اس دور کی بعض غزلوں پر ذوق کا رنگ غالب ہے۔ مثلاً ان کی وہ مشہور غزل جس کے مقطع میں بہادر شاہ کے ارادۂ حج کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزل کا شاید کوئی شعر ایسا نہیں۔ جسے ذوق نہ لکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانہ ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

اس دور میں اس طرح کی غزلیات، جو معنوی حسن سے بیشتر عاری ہیں۔ اور غالب کے عام معیار شاعری پر پوری نہیں اترتیں۔ کئی ہیں۔ مثلاً ذیل کے مضمون والی غزلیں ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

غالباً یہ غزلیں ارشاد شاہی کی تعمیل ہیں۔ یا کسی مشاعرے میں پڑھنے کے لئے بہ عجلت لکھی گئیں۔ اور ان پر شاعر نے اپنا زور دماغ صرف نہیں کیا۔ ورنہ اس دور میں بھی جس پایہ کے اشعار غالب لکھ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کی غزلیں دیکھنے سے ہوگا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اس دور کی ایک خصوصیت ایک خاص رنگ کے اشعار کی فراوانی ہے۔ جن میں "دو مصرعوں" کے اندر شاعر نے جہانِ معنی جلوہ گر کیا ہے۔ اور ان میں تاسف تخیل اور تجربے کا اس طرح عطر کھینچا ہے کہ ان سے کاغذ کا دل و دماغ معطر ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کے ذہن میں نئے نئے شگفتہ خیالات اور لطیف تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ظرافت زبان کی سلاست اور خیالات کی سادگی کے علاوہ جس خصوصیت نے اس زمانے کے اشعار کو امتیازی رنگ دے دیا ہے۔ وہ مرزا کی شوخی اور ظرافت ہے۔ ابتدائی دور میں مرزا کے اکثر اشعار معمہ تھے۔ شاعرانہ حسن سے عاری، متین اور سنجیدہ لیکن ہم بتا چکے ہیں۔ کہ جب مرزا کی خود حسی اور داخلی کشمکش پر ان کی عقل سلیم غالب آئی۔ تو ان کے اشعار میں ایک طرح کی شگفتگی آگئی۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے۔ کہ جو آدمی احساسات کا غلام ہے۔ اس کے لئے زندگی ایک ٹریجیڈی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے والے کے لئے کامیڈی۔ مرزا بے شک قوی احساسات اور جذبات کے مالک تھے۔ لیکن ان کی فہم و دانش قوی تر تھی۔ اور جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی گئی۔ وہ ان واقعات پر مسکرانے لگے۔ جن کے لئے پہلے آنسو بہاتے تھے ؎

رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند　　　خندہ بر دانا و ناداں مے زنم

یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا کی شوخی کی اصل بنا ان کی جدت طرازی اور ہر بات میں نیا پہلو نکالنے کی عادت تھی۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طریقے سے انہوں نے رنج و غم کی باتوں میں شگفتگیٔ طبع کو برقرار رکھا۔ وہ اسی آدمی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ جس نے بقول ان کے "سخت وسستی در رنج و غم کو ہموار" کر دیا ہو۔ اور جو رنج و غم کی شدت سے اسقدر اندھا نہ ہو جاتا ہو۔ کہ رنج و غم کے سوا اسے اور کچھ نظر ہی نہ آئے۔

ازاں بگلشن گیتی نشاط مے ورزی
کہ بوئے زہر ہے نشنوی ز ریحانش

دنیا کے حوادث میں شاید المناک ترین واقعہ کسی کی موت ہے۔ جس پر دوست کیا دشمن بھی آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن اردوئے معلّٰے کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ مرزا نے

تعزیت کے موقعے پر بھی ظریفانہ انداز قایم رکھا۔ اور اظہارِ رنج اور تلقینِ صبر کے بجائے خطوں میں جانفزا لطیفے ہی لکھے۔ موت کے متعلق مرزا کا یہ انفرادی نقطۂ نظر کسی حد تک تو اُن کی جدت پسندی کی وجہ سے ہوگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ خاص زاویۂ نگاہ اسی عارفانہ[1] چشمِ بصیرت کا عطیہ تھا جس نے اُن کے لئے "سختی و سُستی اور رنج و آرام" سب کو ہموار کر دیا تھا۔ شروع میں جب اُنھوں نے جذبات کی باگ ابھی تک عقل کے ہاتھوں میں نہ دی تھی۔ اُن کے اشعار میں موت کا بیان اسی طرح تھا۔ جس طرح عام شعرا کے کلام میں۔ مثلاً "ہائے ہائے" کی ردیف میں ان کی مشہور غزل پڑھئے۔ جو اُنھوں نے تئیس چوبیس سال کی عمر میں "کسی" کی وفات پر لکھی تھی۔ اگرچہ یہ مرثیہ بہت پُر درد ہے۔ لیکن اسلوبِ خیال بالکل رسمی اور عامیانہ ہے جب ہم اس کا مقابلہ عارف کے مرثیے سے کرتے ہیں۔ جو اس سے پچیس تیس برس بعد لکھا گیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں شاعر کا نقطۂ نظر بہت بدل گیا ہے۔ بعد کے مرثیے میں مرزا نے ہجومِ غم کی وجہ سے اپنا سکون اور توازن نہیں کھو دیا۔ اور موضوع دردناک ہونے کے باوجود اُنھوں نے اپنی شوخ نگاری برقرار رکھی ہے۔ عارف سے خطاب ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے دادوستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور!

پچیس تیس برس کے وقفے سے مرزا نے جو دو مرثیے لکھے۔ ان میں جو فرق ہے وُہی

۱؎ ایک غیر مطبوعہ منظوم خط کے دو اشعار ہیں ؎

زرنجوریٔ من مخور غم کہ من — نہ دارم غمِ ہستیٔ خویشتن
نہ جاں از من است و نہ جسم آنِ من — خود از مردنِ من چہ نقصانِ من!

ان کی عام شاعری میں نمایاں ہے۔ اور اس عظیم الشان ذہنی انقلاب کا آئینہ ہے۔ جو ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ ابتدا میں شاعر پر متانت غالب تھی لیکن بتدریج خیالات شگفتہ ہوتے گئے اور جذبات میں توازن آتا گیا۔ اس ذہنی ارتقا کی انتہائی بلندی غالب کے اردو خطوط میں نظر آتی ہے۔ جو نہ صرف عارفانہ رواقیت (Stoicism) بلکہ مرزا کی ظرافت کے بہترین مخزن ہیں۔ لیکن جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ شوخ اور ظریفانہ اشعار کی جو کثرت درباری دور میں ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔

مرزا کی عام شاعری کا میدان وسیع تھا۔ اسی طرح شوخی اور ظرافت کو بھی انہوں نے چند مضامین تک محدود نہیں رکھا۔ اُن کی ظرافت بہت پاکیزہ تھی۔ اور تبسم زیر لب سے آگے کبھی نہ بڑھتی۔ لیکن اس میں رو رعایت کسی کی نہ تھی۔ گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے ؎

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

ایک دو جگہ تو شوخی حد سے گذر گئی ہے۔ اور محمل لینے کی طرف ہاتھ اٹھتا نظر آتا ہے ؎

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی　　آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

یہ ظریفانہ اشعار زیادہ تر شوخیٔ طبع کا اظہار ہیں۔ لیکن جس کثرت اور جس چبھتے ہوئے طریقے سے انہوں نے بہشت کا تمسخر اڑایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ موضوع انہیں بہت بھاتا تھا ؎

میں جو کہتا ہوں کہ ہم حشر میں لینگے تم کو　　کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حُوریں اگر واں ہوگئیں

پانچواں دَور کلامِ غالب کی پہلی تاریخی تدوین کرتے وقت ہم نے ان اشعار کو جو غدر کے بعد لکھے گئے باقی اشعار سے علیحدہ ترتیب دیا تھا۔ لیکن اشعار کی تعداد تھوڑی تھی۔ اس لئے ہم نے ان کی بنا پر ایک مُستقل دورِ شاعری معیّن نہ کیا۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے بعد سبدِ چین اور مکاتیبِ غالب شائع ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری رسائی غالب کے نئے کلام تک ہوئی ہے۔ اور بعض پُرانی غزلوں اور قصیدوں کے مُستند ہونے کی تصدیق بھی ہوئی ہے۔ اب اس حصّہ کلام کو جُداگانہ طور پر مطالعہ کرنے میں شاید کوئی ہرج نہ ہو۔

درباری تعلقات کی وجہ سے غدر سے پہلے کئی سال تک مرزا نے زیادہ توجہ اردو کی طرف رکھی۔ اس اثنا میں انہوں نے فارسی اشعار بھی کہے۔ لیکن ان اشعار، بالخصوص فارسی غزلیات کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ کلام کا بیشتر حصّہ اُردو میں ہے۔ غدر کے بعد دربار اور درباری تعلقات ختم ہوگئے۔ اب مرزا نے فارسی پر پھر زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ اور غدر کے بعد اُنہوں نے جو اشعار کہے ہیں۔ ان میں فارسی اشعار کی تعداد اُردو اشعار سے زیادہ ہے۔ بلکہ شاید ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۲ء تک اُنہوں نے سوائے ایک قصیدہ کے، جو منشی شیو نرائن کے نام سے لکھا گیا، اور چند اشعار کے، جن میں غدر کی مصائب کا رونا ہے، ایک بھی اُردو شعر نہیں کہا۔

غدر کے بعد مرزا نے جو اُردو فارسی اشعار کہے۔ وہ طرزِ تحریر اور خیالات کے لحاظ سے

ان کے درباری دَور کے اشعار سے مشابہ ہیں۔ کلام میں سادگی اور شوخی ہے اور تلمیحات اور دُور از کار تشبیہات کی بھرمار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیوانِ قاآنیؔ اُن تک پہنچ گیا تھا۔ اور دیوانِ حافظؔ کو بھی اُنھوں نے زیادہ توجہ کی نظر سے دیکھا۔ سبدِ چین میں کم از کم تین غزلیات ایسی ہیں جن میں حافظؔ کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایسی غزلیات بھی موجود ہیں۔ جن کی بحریں اور لفظوں کی ترتیب اور خوش آہنگی قاآنی کی یاد دلاتی ہے ؎

اے خداوندِ خردمند و جہاں داورِ دانا — دے بہ نیروئے خرد برہمہ کردار توانا

بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدکشایا — بہ کرم ابرِ عطایا، بغضب برق سنانا

بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن بذلہ طرازا — بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا

ایک اور فارسی غزل کی ردیف اور بحر بڑی دلچسپ ہے ؎

ہلہ من عاشقِ ذاتم تنانا ہا یاہُو — ناظرِ حسنِ صفاتم تنانا ہا یا ہُو

مرزا کی یہ جدت طرازیاں فارسی تک ہی محدود نہ تھیں۔ اُنھوں نے امیر کلب علی خاں کی تعریف میں جو دو اُردو قطعے اور نواب علاءالدین کے ایما پر جو اُردو غزل لکھی ہے۔ وہ بھی بحر و قافیہ کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا ان دنوں کُہن سالی اور خرابیٔ صحت کی وجہ سے تلاشِ مضمون میں تو بہت محنت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے الفاظ کی تراش خراش اور اشعار کی عروضی خصوصیات میں جدتیں پیدا کر کے دلچسپی بہم پہنچاتے رہے +

اسی زمانے میں مرزا نے اپنے اُردو اور فارسی کلام کے نئے ایڈیشن شائع کئے۔ اور اپنی تصانیف کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اردو دیوان، دو مرتبہ غدر سے پہلے، ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء میں شائع ہُوا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اُردو اشعار درباری دَور میں لکھے گئے ان سب کا مجموعہ ۱۸۵۷ء میں نواب یُوسف علی خاں کے لئے مرتب ہُوا۔ اور مرزا نے

اس نسخہ کی بنا پر دیوان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ۱۸۶۱ء میں اردو دیوان کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی، دہلی سے اور جون ۱۸۶۲ء میں چوتھا ایڈیشن مطبع نظامی، شہر کانپور سے شائع ہُوا۔ تیسرا ایڈیشن نسخہ رام پور کے مطابق ہے۔ لیکن چوتھی اشاعت میں چھ اشعار کا اضافہ ہُوا۔

فارسی دیوان ۱۸۴۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کئی فارسی قصائد اور غزلیات لکھی گئیں۔ ان سب کو نواب ضیاء الدین نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا۔ اور ۱۸۶۳ء میں کلیاتِ نظم فارسی شائع ہوئی۔ لیکن اس میں سے بعض چیزیں رہ گئی تھیں۔ اور بعض بعد میں اضافہ ہوئیں۔ مرزا نے انہیں کلیات میں شامل کرنے کے بجائے اگست ۱۸۶۷ء میں سبدِ چین کے نام سے ایک علیحدہ کتاب شائع کی۔

ان مجموعوں کی ترتیب و اشاعت کے علاوہ، ستمبر ۱۸۶۶ء میں مرزا نے نواب کلب علیخاں کی فرمائش پر اپنے اردو اور فارسی کلام کے دو انتخاب مرتب کئے تھے۔ ان دونوں کا مجموعہ اب انتخابِ غالب کے نام سے کتبخانہ رام پور کی طرف سے شائع ہُوا ہے۔

ان دواوین کی اشاعت سے مرزا کو اپنی زندگی میں ہی اپنا کلام بہ طریقِ احسن منضبط اور مدوّن کرنے کا موقع ملا لیکن اب بھی ان سے باہر کئی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک فارسی قطعہ تذکرۂ غوثیہ میں درج ہے۔ جو نہ کلیات میں ہے۔ نہ سبدِ چین میں۔ بہادر شاہ کے ایما پر مرزا نے جو فارسی مثنوی، بادشاہ کے عقائد کی توضیح میں لکھی۔ وہ بھی اگر ایک تشریحی نوٹ کے ساتھ شائع ہو جائے۔ تو نامناسب نہ ہو۔ اسی طرح مرزا نے اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر عربی مثنوی دعاء الصباح کا فارسی اشعار میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ بھی کلامِ غالب کے مجموعوں میں نہیں[۱]۔

---

[۱] مولوی امتیاز علی عرشی نے نگار، لکھنؤ، بابت مئی ۱۹۴۱ء میں اس مثنوی کو ایک فاضلانہ نوٹ کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

اسی طرح اُردو کے کئی اشعار ہیں۔ جو دیوانِ غالب کی چوتھی اشاعت میں نہیں۔ ان میں سے بعض تو بعد میں لکھے گئے۔ بعض (مثلاً غدر کے متعلق قطعہ) کی دیوان میں شمولیت مرزا نے مناسب خیال نہ کی ہوگی۔ اور چند ایک دیوان مرتب کرتے وقت مرزا کے پیشِ نظر نہ ہوں گے۔ ہم نے کوشش کی ہے۔ کہ ارمغانِ غالب میں مرزا کا سب غیر مطبوعہ اور غیر متداول اُردو کلام، جو اُنہوں نے خود مسترد نہیں کیا، یکجا کر دیا جائے۔ لیکن عجب نہیں۔ کہ بعض چیزوں تک ہماری رسائی نہ ہوئی ہو۔ نادر خطوطِ غالب اور تمہ شہرتِ کلامِ غالب میں جس طرح غالب کے نام زمانہ حال میں لکھے ہوئے رقعات اور غزلیں منسوب کی گئی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اس امر کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام، اصلی تسلیم کرتے وقت اس پر کڑی نظر ڈالی جائے۔ لیکن غیر مطبوعہ کلام کا اب بھی دستیاب ہو جانا ناممکن نہیں۔ لال قلعہ کی ایک جھلک میں سید ناصر نذیر فراق، قلعہ کی ایک ملازمہ کی زبانی کہتے ہیں۔ "جب میاں غلام نظام الدین (ابن میاں کالے صاحب) کا بیاہ ہونے لگا۔ تو مرزا نوشہ نے ایسا سہرا لکھا۔ جو ولیعہد کے سہرے سے اچھا تھا۔ مگر میں بھول گئی۔ دو ایک شعر یاد رہ گئے ہیں۔ وہ سنائے دیتی ہوں:

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا   چاند کا دائرہ لے زُہرا نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں   باندھنے کے لیے ...... جو اُٹھایا سہرا

میاں کالے صاحب کے ساتھ مرزا کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے یہ حکایت چنداں مستبعد معلوم نہیں ہوتی۔ اور ممکن ہے۔ کہ کسی معاصرانہ مجموعے میں یہ سہرا مل جائے۔

مرزا نے اس زمانے کی جن اردو فارسی غزلیات کو اپنے خطوط میں درج کیا ہے۔ وہ تو شاعرانہ نقطۂ نظر سے مرزا کے بہترین کلام کے ہم پایہ ہیں لیکن اس زمانے کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں۔ جو مرزا کے عام معیارِ شعر سے گرے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں تبرکاً

اور اپنے اندراجات کو مکمل کرنے کے لئے درج کتاب کر دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہنگامی اشعار کی بنا پر مرزا کی شاعری کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا +

غالب کے اُردو خطوط غدر کے بعد مرزا نے گاہے گاہے اُردو فارسی غزلیں، اور ضرورت کے وقت فارسی قصیدے اور قطعے لکھے۔ لیکن اس زمانے کی بہترین یادگار ان کے اُردو خطوط ہیں۔ جو عودِ ہندی۔ اردوئے معلےٰ اور مکاتیبِ غالب، تین مختلف مجموعوں میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اور اب منشی مہیش پرشاد کی محنت اور کوشش سے زیادہ صحت اور حسنِ ترتیب کے ساتھ یکجا شائع ہو رہے ہیں +

غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ وہ سب کے سب بے تکلّف دوستانہ خطوط ہیں۔ اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو یہ سان گمان نہ تھا۔ کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے۔ ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن بعد کے خطوط کے متعلق نہیں۔ اخیر ۱۸۵۸ء میں جب منشی شیونرائن نے مرزا کو اُردو رقعات چھپوانے کے لئے کہا۔ تو انہوں نے ۶ ار نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس کی مخالفت کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اُردو کے رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا۔ جو مَیں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔"

اسی سلسلے میں انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہؔ کو بھی لکھا "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے۔ تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔" ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے۔ اُن کی اشاعت کو

وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو فرق ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے +

غالب کے رقعات خواہ کن حالات کے ماتحت لکھے گئے ہوں۔ ان کی اہمیت بہت ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے غدر کے بعد دہلی میں جو سناٹا ہوا تھا۔ اُس کی صحیح اور موثر داستان انہی خطوط میں ملتی ہے۔ مکتوب نویسی میں بھی ان خطوط نے ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا۔ کہ اگر اس طرح کے خطوط لوگوں کی نظر کے سامنے نہ آتے تو اُردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی کی تھی۔ وہاں اُردو خطوط بھی رقعاتِ بیدل اور انشائے مادھورام کے طرز پر لکھے جاتے۔ علاوہ ازیں اُردو نثر کی تاریخ میں ان رُقعات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بیشک اس سے پہلے کلکتہ کالج میں کئی ایک کتب مقفیٰ اور مسجع عبارت سے عاری شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعۂ دہلی سے وابستہ تھا۔ یہاں بھی دہلی کالج کے سلسلے میں صاف اُردو میں چند کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ لیکن وہ محض ترجمے تھے۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے بے وقعت۔ یہاں جمد رنگ مقبول تھا۔ اس کا نمونہ مولوی غلام امام شہید کے مضامین ہیں یا آثار الصنادید کے باب چہارم میں ملتا ہے۔ بلبشک اس طرزِ تحریر کو اختیار کرتے وقت عبارت آرائی اور قافیوں اور تشبیہوں کی تلاش میں انشا پرداز کو بہت محنت کرنی پڑتی۔ لیکن نتیجہ فقط یہی کہ اصل مطلب پر تو بر تو پردے پڑ جاتے۔ غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرزِ بیان سے وہ گلکاریاں کیں۔ کہ اُردوئے معلےٰ خواص و عوام کو پسند آئی۔ اور اردو نثر کے لئے ایک طرزِ تحریر قائم ہو گیا جس کی پیروی دوسروں کے لئے لازم تھی +

غالب کے خطوط آج سے اسّی نوّے[90] سال پہلے لکھے گئے۔ لیکن ان کی مقبولیت اور دلآویزی کا وہی عالم ہے۔ جن اصحاب کے نام وہ خط لکھے گئے وہ چل بسے۔ جن حالات اور واقعات کا اُن میں ذکر ہے۔ وہ اب خواب و خیال ہو گئے۔ لیکن پھر بھی ان خطوط کی تازگی اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ ان خطوط کی بدولت وہ اشخاص جن کے نام یہ لکھے گئے۔ یا جن کا ان میں تذکرہ ہے۔ ادبِ اُردو میں مستقل جگہ پا گئے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو۔ خطوطِ غالب کی دلپسندی اور ان کی ہر دلعزیزی کا آج بھی یہ حال ہے۔ تو ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی خصوصیات اور ان خوبیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ جن کی وجہ سے ان کی دلپسندی اور مقبولیت میں فرق نہیں آتا۔

مرزا غالب کی اُردو اور فارسی شاعری کو قبولیت عامہ حاصل کرنے دیر لگی۔ لیکن ان کے اُردو خطوط نے فوری شہرت حاصل کی۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ تھا۔ جو فی الواقع سب سے نرالا تھا۔ مولینا حالی لکھتے ہیں:-

"انہوں (مرزا) نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دُور از کار تھیں۔ سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

مولینا حالی کا بیان صحیح ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ خطوطِ غالب کی مقبولیت کی وجہ صرف یہی نیا طرزِ مکتوب نگاری ہے۔ کیونکہ ایک تو مرزا نے سب خطوں میں القاب و آداب ترک نہیں کئے۔ وہ خط لکھتے وقت مکتوب الیہ کے مرتبہ اور اپنے تعلقات کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے۔ اپنے شاگردوں

اور بے تکلف دوستوں کے لئے اُنہوں نے وہی مختصر القاب استعمال کئے ہیں۔ جو حالی نے مندرجہ بالا سطور میں گنائے ہیں۔ لیکن ذی مرتبہ حضرات کے لئے، بالخصوص جن سے ان کی بے تکلفی نہ تھی۔ اُنہوں نے القاب اور آداب کا پوری طرح خیال رکھا ہے، نواب میر غلام بابا خاں رئیس سُورت کے اکثر خطوں کو "نواب صاحب، جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت" لکھ کر شروع کیا ہے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام جتنے خط ہیں۔ قریباً سب کا آغاز "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت" سے ہوتا ہے۔ دوستوں میں بھی حفظِ مراتب کا پورا خیال تھا۔ خان بہادر منشی غلام غوث بےخبر کے نام کے خطوط "قبلہ" "پیر و مُرشد" "حضور" یا اس طرح کے مودبانہ الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ نواب انور الدولہ سعد الدین شفق کو اکثر "پیر و مُرشد" "خداوندِ نعمت" "قبلہ صاحبا" لکھ کر یاد کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ اگر خطوط غالب کی مقبولیت کا باعث یہی بے تکلف طرزِ تحریر ہوتا۔ تو اس کی تقلید بڑی آسان تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ اردو کے بعض مشہور انشا پردازوں نے غالب کے اس طرزِ نامہ نگاری کی پیروی کی ہے۔ اور القاب و آداب کو بے حد مختصر کر دیا ہے۔ لیکن ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ اور ان کے خطوط میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی۔ جو اردوئے معلےٰ اور عودِ ہندی کے معمولی رقعوں میں ہے۔

غالب نے جس طرح القاب و آداب دوستانہ خطوط میں مختصر کر دئے تھے اسی طرح طرزِ تحریر بھی بڑا بے تکلف اور سادہ استعمال کیا تھا۔ ویسے اس میں بھی حفظِ مراتب، اور موضوع کی موزونیت کا خیال رہتا۔ علمی مسائل کی توضیح کے لئے یا ناواقف نامہ نگاروں کے جواب میں جو خط گئے ہیں۔ ان میں فارسیت زیادہ ہے۔ اور ذی علم اور ذی مرتبہ حضرات کے نام کے خطوط میں بھی زیادہ تکلف روا رکھا گیا ہے۔ مثلاً مفتی سید محمد عباس اور مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام جو خطوط ہیں۔ ان میں وہ بے تکلفی نہیں۔ جو مرزا کے خطوط کی عام خصوصیت ہے۔

اسی طرح نواب سُورت کے نام جو پہلا خط لکھا ہے۔ وہ بھی ثقیل فارسی الفاظ وتراکیب سے بھرا ہُوا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"سبحان اللہ تعالےٰ شانہ' اعظم برہانہ'۔ جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خاں بہادر سے بتوسط میاں داد خاں صاحب شناسائی بہم پہنچی۔ لیکن واہ اول ساغر و دُردی۔ کیا جگر خوں کُن اتفاق ہے۔ پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا۔ اُس میں خبر مرگ۔ اب جو میں اسکا جواب لکھوں۔ اور یہ میرا پہلا خط ہوگا۔ لامحالہ مضامین ماندوہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق نہ محبت نامہ صرف تعزیت نامہ۔ صریر قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے جلفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے۔"

لیکن ایسے خطوط کی تعداد جن میں یہ تکلف اور آورد اور فارسی الفاظ وتراکیب کی فراوانی ہو۔ بہت نہیں۔ جُوں جُوں مرزا کا طرزِ تحریر پختہ ہُوا۔ اور اُنہوں نے دیکھا۔ کہ سلیس اُردو میں کیا کیا گلکاریاں ہو سکتی ہیں۔ تو فارسی تراکیب کی کثرت بھی جاتی رہی +

غالب نے مرزا علی بخش کی استدعا پر جو فارسی رسالہ ۱۸۲۵ء میں فارسی مکتوب نویسی کے متعلق لکھا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ خط وکتابت کے متعلق ان کا شروع میں ہی ایک خاص نقطہ منظر تھا۔ اور وہ چاہتے تھے۔ کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال کی جائے جو گفت وشنید میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "نامہ نگار را باید کہ نگارش طرازِ گزارش دُور تر نہ بُردہ بنشستن را رنگ گفتن دہد" لیکن اس کے باوجود انہوں نے فارسی خطوط میں اس نقطۂ نظر کی پوری طرح پیروی نہیں کی۔ اور فارسی مکتوب نویسی میں وہی رسمی طرزِ تحریر استعمال کیا۔ جو ان کے زمانے میں مروّج تھا۔ اور جس پر ان کے پیشرو کار فرما تھے۔ چنانچہ وہ قتیل کی سلیس فارسی نثر پر نکتہ چینی کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:۔

"تقریر بلا رہے۔ تحریر ادر ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط سے اور

شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثریں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے ۔ اور وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بتقلید اہلِ ایران لکھی ہیں نہ قلم فرمایا کرتے "

مرزا نے نثر نویسی کے متعلق قتیل کا نقطۂ نظر جو اصولاً صحیح تھا قبول نہ کیا ۔ لیکن جب وہ ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے ۔ اور ان کے پاس اس قدر وقت نہ رہا ' جو فارسی مکاتیب جنہیں وہ بڑی محنت اور جگر کاوی سے لکھا کرتے تھے ۔ کے لکھنے کے لئے کافی ہو ۔ اور ساتھ ہی بڑھاپے کی وجہ سے وہ اس کاوش اور دماغ سوزی کے قابل نہ رہے ۔ تو انہوں نے اُردو میں مراسلت نگاری شروع کی ۔ اور اس زبان میں وہ بے تکلف طرزِ تحریر استعمال کیا ۔ جو عام گفتگو میں کام آتا تھا ۔ اور جس کے لئے اس قدر محنت کی ضرورت نہ تھی ۔ وہ منشی نولکشور کو لکھتے ہیں :-

"در پارسی زبان بسا سخن گفته ام و سمر نامه ها نگاشته اکنون که دل از ناتوانی سگالش بر نمی تابد ۔ کار بخود آسان کرده ام و هر چه می باید نبشت ۔ در اُردو می نویسم ۔ گوئی گفتار در نامه فرو می پیچم ۔ و به دوست می فرستم ۔ حاشا که در هندو زبان نیز سخن نمائی و خود آرائی آئین باشد ۔ آنچه با نزدیکاں تواں گفت ۔ بہ دوراں نوشته میشود" ۔

مرزا نے اُردو میں سادہ اور بے تکلف طرزِ تحریر کسی ادبی اصول کے تحت نہیں بلکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شروع کیا تھا ۔ اور ابتدا میں اس کا ذکر بڑی معذرت کے ساتھ کیا کرتے تھے لیکن جب یہ طرزِ تحریر کامیاب ہو گیا ۔ اور ان کی طبعِ خداداد نے اس میں ایسی ایسی رنگینیاں پیدا کر دیں ۔ کہ خاص و عام کو یہ انداز پسند آیا ۔ تو وہ اس طرزِ تحریر پر فخر کرنے لگے ۔ اور اسے خاص اپنی ایجاد قرار دیتے ۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔ "مرزا صاحب! میں نے

وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کہو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ جن حضرات نے مرزا کے خاص طرزِ مراسلت نگاری یعنی القاب و آداب کے اختصار اور بے تکلف اندازِ بیان کی پیروی کی ہے۔ وہ اس میں کامیاب نہیں رہے۔ وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ اگرچہ القاب و آداب کا ترک کرنا اور غیر رسمی اور بے تکلف طریقِ خطاب اختیار کرنا آسان ہے۔ لیکن اس کا نبھانا اور اس میں دلآویزی پیدا کرنا بڑا مشکل ہے۔ غالب کے مقلدین عموماً دو مختلف عیوب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے بے تکلف طرزِ اظہار پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ان کے خطوط میں عامیانہ پن اور بے کیفی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جنہوں نے اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریر میں تصنع اور آورد نمایاں ہے۔ مرزا کا طرزِ تحریر صحیح معنوں میں سہل ممتنع ہے۔ دیکھنے میں آسان اور پوری طرح اختیار کرنے میں مشکل۔ بے تکلف اندازِ بیان اسی انشاپرداز کا کامیاب ہو سکتا ہے۔ جس کی اپنی شخصیت اس قدر شگفتہ اور بوقلموں ہو۔ کہ اُس کا بے تکلف اظہار اور انشاپرداز کے عام خیالات اور اس کی زندگی کے عام واقعات کا بیان دلچسپ اور دلآویز ہو۔ یہ بات غالب کے مقلدین کو حاصل نہیں۔ اس لئے ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں +

مرزا کو ان کے مقلدین پر جو فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں۔ کہ مرزا کی شخصیت ان کی نسبت شگفتہ اور ہمہ گیر تھی۔ بلکہ دوسری اہم وجہ یہ ہے۔ کہ مرزا بطور انشاپرداز کے ان سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہیں۔ عام روزمرہ کے واقعات کو دلچسپ بنانے کے لئے ہماری انشاپردازی کے مروجہ حربے کام نہیں آتے۔ اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ موٹے موٹے فارسی عربی الفاظ سے عبارت کو پُرشکوہ بنا لیا' یا اساتذہ کے اشعار اور

دہلی کے منتخب محاورے جا و بیجا درج کر کے رنگینیٔ بیان میں مدد لی یا جھوٹے سچے لطیفے جمع کر کے مُتمسّک اور بے کیف عبارت کو دلچسپ بنا لیا یا ناظرین کے جذبات بھڑکا کر اور ان کی قوتِ منتبیزہ شل کر کے ان سے خراجِ تحسین وصُول کیا۔ مرزا غالب نے یہ کبھی نہیں کیا۔ لیکن انکی نثر میں ایسی لسانی اور فنی خوبیاں موجود تھیں۔ جنہوں نے انہیں اُردو کا بہترین انشا پرداز بنا دیا تھا۔ بے تکلف دوستانہ خطوط میں حُسن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مراسلہ نگار نگہ انتخاب اور قوتِ مشاہدہ رکھتا ہو۔ جو روزمرہ کی معمولی باتوں میں بھی وہ چیزیں ڈھونڈے جو دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اسے قوتِ متخیلہ سے پوری طرح متصف ہونا چاہیئے۔ تاکہ عام باتوں کے دلچسپ اور پر لطف پہلو بھی اسے نظر آجائیں۔ اور وہ انہیں مثالوں اور تشبیہوں سے اور بھی دلآویز بنا دے۔ موزوں اور موثر الفاظ کا ذخیرہ بھی اس کے پاس وافر ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر ایک خیال کو صحیح طور پر ادا کر سکے۔ اور انتخاب الفاظ کا بھی اسے صحیح ملکہ ہو۔ تاکہ معمولی باتوں کا بیان اس طرح کرے۔ کہ اسے پڑھ کر لطف حاصل ہو۔

مرزا غالب میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ اور ان کے علاوہ ان کی فطری شوخی اور ظرافت سونے پر سہاگہ، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نہایت معمولی باتوں کو انہوں نے اس دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے۔ کہ پڑھنے والا پہروں وجد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انکے وہ خطوط ملاحظہ ہوں۔ جو انہوں نے ۱۸۶۲ء کی برسات کے متعلق مختلف دوستوں کو لکھے۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

"برسات کا نام آگیا۔ لو پہلے تو مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا۔ ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا۔ ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آجاتا ہے

جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی تارے اگر دکھائی دیتے ہیں تو لوگ جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار جگہ کسی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر۔ وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہُوا۔ یہ پَن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے دانے بہ گئے۔ جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟"

انہی کو دو مہینے بعد لکھا ہے :-

"برسات کا حال نہ پوچھو۔ خُدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہُوئے جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حُجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنیاں ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں۔ قلمدان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہُوا۔ کہیں چلمچی دھری ہُوئی خط لکھوں کہاں بیٹھ کر؟"

نواب علاء الدین کے نام ایک خط میں لکھا ہے :-

"میاں مَیں بڑی مصیبت میں ہُوں محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں۔ ہائے دبی! ہائے مری! دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ مَیں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ اور پھر اثنائے مرمت میں مَیں بیٹھا کس طرح رہوں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی مرزا کے زورِ قلم اور ملکۂ انشا پردازی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک نہایت عام بلکہ عامیانہ صورت حالات کو اُنہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ نثر شاعری سے زیادہ دلآویز ہو گئی ہے۔ اور سیدھے سادھے، عام گفتگو کے الفاظ میں طوفانی موسم کی ایک ایسی تصویر کھنچ گئی ہے۔ جو مکتوب نگار اور اہالیان دہلی کی مشکلات کو بھی پوری طرح واضح کرتی ہے۔ اور پڑھنے والے کو بھی مزا دیتی ہے +

مولانا حالی لکھتے ہیں:۔ "معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے۔ کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے۔ کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو"۔ بیشتر خطوط کی نسبت یہ رائے صحیح ہے۔ لیکن غالب کی بلند پایہ انشا پردازی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ جن خطوط میں مکتوب الیہ کو خوش کرنے کی کوئی کوشش نہیں۔ بلکہ اس کا دل جلانا مقصود ہے۔ ان میں بھی ایک خاص طرح کا لطف اور بانکپن ہے!

مثال کے طور پر ان کا وہ خط ملاحظہ ہو۔ جو انہوں نے دبدبۂ سکندری بند کراتے وقت مولوی محمد حسن خاں مالک مطبع حسنی کو لکھا۔

"مشفقی اور مکرمی محمد حسن خانصاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے۔ کئی خط آپ کے پھیرے۔ اور آپ اخبار بھیجتے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا۔ یا کوئی جھوٹ کی پوٹ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ۔ اور جو کچھ سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ۔ یہ غلط محض ہے کہ مطبع حضور کا ہے۔ اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف سے اللہ! اللہ! ڈگی جے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو۔ اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے پادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام کے آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو بس۔ اور اس قباحت کو

نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے۔ تو گویا ڈگی سنگھ جی کی تعریف بھی حضور سے ہوگی۔ ہندوستانی عملداری میں وہ ایک زمیندار مالگزار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی! "یک در گیر و محکم گیر" اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا کہ اپنے پادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو۔ کبھی صفحہ پر کبھی حاشیہ پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے۔ اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں۔ کہ دُہائی خدا کی! میں یکم جنوری ۱۸۶۸ء سے "دبدبۂ سکندری" کا خریدار نہیں ہوں۔ نہ بھیجا کرو۔ واسطے خدا کے! نہ بھیجا کرو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں "

بھلا اس سے زیادہ اور کوئی کیا لکھ سکتا تھا!!

حکیم تفضل حسین خاں کے نام جو خط "طلبِ دیوان کے لیے" لکھا ہے۔ وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے اپنا دیوان مکمّل کرنے کے لئے' اس کا جو نسخہ حکیم صاحب کے پاس تھا' ان سے طلب کیا۔ انہوں نے بھیجنے میں تامل کیا' مرزا کو غصّہ آگیا۔ اس "شانِ جلالی" کا اظہار ہے :-

"کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی' سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی، سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک ہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں' پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو' میرا اعتبار نہیں۔ یا مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب میرے آدمی

کو ابھی دیدو باللہ و اللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دونگا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتب حامل رقعہ ہذا کو نہ دو تو تم پہ آفرین!"

یادگارِ غالب کے مطالعہ سے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا ہے۔ کہ مرزا کو تالیفِ قلوب کا بڑا پاس تھا۔ اور وہ کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے۔ جس سے کسی کا دل دُکھے۔ ایک حد تک تو یہ رائے صحیح ہے مرزا ایک بامروت اور نیکدل انسان تھے۔ دوسروں کا دل دُکھا کر انہیں خوشی نہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ دل کے کھرے تھے۔ اگر انہیں کسی کی کوئی ادا ناپسند ہوتی یا کوئی امر خلافِ طبع ہوتا۔ تو وہ بے جا تکلف یا ریاکاری سے کام نہ لیتے بے تکلف اپنے دلی خیالات کا اظہار کر دیتے تھے۔ ہم نے جو دو خطوط اوپر نقل کئے ہیں۔ ان سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس صاف گوئی بلکہ تلخ گوئی کی کئی اور مثالیں غالب کے خطوط میں ملیں گی۔ ایک خط میں حکیم احمد حسن کو لکھتے ہیں:۔

"حضرت! آپ کے جد امجد کا غلام تو مر گیا۔ کثرتِ احکام، تواتر ورود اشعار، پھر یہ پنجہ کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو...... غزلیں آپ کی برستی ہیں۔ کہاں تک دیکھوں آپ کی غزلوں کے ساتھ دوسری غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔"

مرزا کے عزیز اور سعادتمند شاگرد منشی ہرگوپال "تفتہ" دوسرا دیوان چھپوانے کی فکر میں ہیں۔ غالباً مرزا سے "دیباچہ و تقریظ" کی فرمائش کی ہے۔ انہیں اس فرمائش کی تعمیل مشکل معلوم ہوتی ہے۔ تفتہ کو صاف صاف لکھتے ہیں:۔

"صاحب! دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے، کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا، کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے۔ تو ابھی کیے جاؤ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا!"

لیکن خوبی یہ ہے۔ کہ اس تلخ گوئی بلکہ بے مروتی میں بھی ایک حُسن ہے۔ شوخی ہے، بانکپن ہے۔ مکتوب الیہ کو تو اُس کی درخواست کی تکمیل سے انکار، یا اُس کے طریقِ کار پر حرف گیری ناپسند ہوگی۔ لیکن بے انصافی ہے۔ اگر وہ زبان و بیان کی ان خوبیوں کی قدر نہ کرے۔ جو ان خطوط کو ممتاز کرتی ہیں!

اُردو نثر میں خطوطِ غالب کا مرتبہ

غالب کے خطوط کو لکھے ایک زمانہ ہوتا ہے۔ اس طویل مدت میں اُردو ادب اور اردو زبان نے بڑی ترقی کی ہے۔ بڑے بڑے اہل قلم نے اپنے نتائجِ طبع سے اس زبان کو مالامال کیا ہے۔ اور اب زبان میں اتنی لچک اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ کہ طرح طرح کے خیالات اور علمی مضامین آسانی سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن زبان اور ادب کی اس ترقی کے باوجود کہنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا جیسا انشا پرداز، جو روزمرہ کے معمولی واقعات کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کرے، کہ ان میں افسانے کی دلچسپی اور عاشقانہ اشعار کی دلآویزی نظر آنے لگے، ابھی تک پیدا نہیں ہُوا۔

خالص انشا پردازانہ نقطۂ نظر سے مولینا محمد حسین آزاد کا مرتبہ سب سے بلند تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور یہ صحیح ہے۔ کہ اُردو ادب کو انمول موتیوں سے بھرنے اور "گیسوئے اُردو" کی "شانہ کشی" میں جس طرح انہوں نے خونِ جگر کھایا ہے۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہُوا۔ ان کی محنت سے چمنِ اُردو میں رنگا رنگ کے ایسے خوشبودار پھول آئے ہیں، جن کی مہک جب تک یہ گلستان قائم ہے، برقرار رہے گی۔ لیکن طبع انصاف کو یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ اگر آبِ حیات کی دلچسپی اور دلآویزی اُردوئے معلےٰ سے زیادہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ بطور ایک انشا پرداز کے غالب کا پلّہ آزاد سے ہلکا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اُردوئے معلےٰ روزمرہ کے معمولی واقعات کا بیان ہے۔ اور آبِ حیات کا موضُوع ہی ایسا شگفتہ اور دلپسند تھا۔ کہ اسے دلچسپ بنانا

بہت مشکل نہ تھا۔ ہم آبِ حیات کی فنی خوبیوں اور اردو ادب میں اس کی تاریخی اہمیت کے قائل ہیں۔ اور آزاد کو اردو زبان اور ادب کے سب سے بڑے محسنوں میں سے گنتے ہیں۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں اُردو شعرا کے لئے آبِ حیات ثابت ہُوئی۔ اور اس نے اُردو شاعری کی تاریخ اور مشہور اُردو شعرا کے حالات کو اس قدر دلچسپ طریقے سے پیش کیا۔ کہ چھوٹے بڑے اسے مزہ لے لے کے پڑھتے ہیں، اور اس کی بدولت عام اُردو دان، اردو شاعری کی مشہور شخصیتوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے آزاد نے واقعات کی صحت کا خاص خیال نہ رکھا۔ اُن واقعات کو زیادہ اہمیت دی۔ جو غلط ہوں یا صحیح، دلچسپ ضرور ہوں، اور بیان کی دلچسپی کے لئے بعض ایسے واقعات بھی بڑھائے جن کی تصدیق کسی تاریخی کتب سے نہیں ہوتی، اور بعض اہلِ تحقیق کے خیال میں مصنف کے اپنے نگار خانۂ دماغ کی تخلیق ہیں۔ مرزا غالب کے خطوط میں اس قصہ آفرینی اور مصنوعی دلچسپی کی گنجائش نہ تھی۔ انہیں اپنے گرد وپیش کے عام واقعات میں رنگ بھرنا تھا۔ اور یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے۔ کہ حقیقت سے رُوگردانی کئے بغیر انہوں نے ان واقعات کو اس آب وتاب سے بیان کیا ہے۔ کہ دلچسپی اور نشاط انگیزی میں اُردوئے معلّٰے آبِ حیات سے بہت نیچے نہیں۔

اس کے علاوہ طرزِ تحریر کا فرق ہے۔ آزاد کی تحریر میں تصنّع ہے۔ آورد ہے۔ مرزا کی تحریر کی طرح سرسری اور سادہ نہیں۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں فارسی اور اُردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ اس مُلک میں نثر نویسی کے تین مختلف اسکول ہُوئے ہیں۔ ایک وہ انشا پرداز جنہوں نے نثر نویسی میں "سخن آرائی و خود نمائی" کی بڑی کوشش کی ہے۔ انہوں نے عبارت کو مقفّٰے اور مسجّع بنا کر، یا پُر شکوہ اور فوق البھڑک الفاظ کی مدد سے، یا بیان میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی پیدا کر کے اپنی تحریر کو آب وتاب دی ہے۔ اور اپنی انشا پردازی

اور قابلیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فارسی کے کئی مشہور نثر نویسوں کی تحریر اسی قبیل سے ہے۔ سہ نثر ظہوری، غالب کی مہر نیمروز، اور کئی دوسری مشہور کتب میں یہ "منشیانہ" شان خود نمائی موجود ہے۔ اردو میں اس کی مثال مولوی غلام امام شہید کا مولود شریف، اور مرزا غالب کی بعض اپنی تقاریظ میں ملتی ہے۔ مولانا آزاد کو بھی اصولی طور پر اسی سکول سے متعلق سمجھنا چاہیے۔ ان کی تحریر میں تصنع اور آورد اور نمائش انشا پردازی کی کمی نہیں۔ لیکن انہوں نے کرنیل ہالرائڈ اور حالی کے ساتھ زمانہ گزارا تھا۔ وہ قدیم منشیوں کی بھونڈی کوششوں کے عیوب خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا طرز تحریر اختیار کیا، جس کے نبھانے کے لئے اسی قدر زورِ دماغ صرف کرنا پڑتا۔ جس قدر انوار سہیلی اور تاریخ وصاف کے مصنفوں کو اپنے طرزِ تحریر میں لکھنے کے لئے لیکن اس سے انشا پرداز کا مطلب سمجھنے میں دقت نہ ہوتی۔ بلکہ عبارت میں ایک شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا۔ اور نثر دلآویزی میں شاعری کو شرمانے لگتی +

نثر نویسی کا دوسرا اسکول ان بزرگوں کا ہے۔ جنہوں نے نثر میں "خطیبانہ" روش اختیار کی ہے۔ ان کی تحریر میں اپنی لیاقت جتانے اور زورِ انشا پردازی دکھانے کی اتنی کوشش نہیں جتنی ناظرین کے خیالات اور اعتقادات بدلنے اور انہیں اپنے ہم خیال بنانے کی۔ اس طرزِ نثر نگاری میں فنِ خطابت کے اصول ملحوظ رہتے ہیں۔ چونکہ عوام کے معتقدات بدلنا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اس لئے الفاظ ثقیل اور تشبیہیں اور استعارے دشوار الفہم نہیں ہوتے۔ بیان میں جوش اور زور ہوتا ہے۔ تاکہ ناظرین متاثر ہوں۔ خطیبانہ طرزِ تحریر کو بالعموم ان مذہبی اور سیاسی راہنماؤں نے استعمال کیا ہے۔ جو اس کی مدد سے اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ فارسی میں اس طرزِ تحریر کی ایک نمایاں مثال حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان مکتوبات میں ملے گی۔ جو انہوں نے اپنے زمانے کے امرا یا دوسرے بااثر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے

کے لئے لکھے۔ اردو میں شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف تقویت الایمان میں یہی شان ہے۔ حال میں مولینا ابوالکلام آزاد نے اس طرز کو بڑا فروغ دیا ہے ٭

نثر نویسوں کا تیسرا طبقہ ان حضرات پر مشتمل ہے۔ جو نہ تو کسی کو اپنے زورِ انشا پردازی سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی ناظرین کو اُکسا اور جوش دیکر انہیں کسی ایک خاص راہ پر چلانا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد فقط صاف زبان میں اپنے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بہترین علما مثلاً شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہی طرزِ تحریر اختیار کیا۔ اور مغل بادشاہ اور دوسرے ارباب عمل جو لفاظی اور کھوکھلی انشا پردازی کی مضرتوں سے واقف تھے' اُن کی تحریریں بھی سادگی اور سلاست نمایاں ہے۔ اور تُزک بابری۔ تُزک جہانگیری۔ رقعاتِ عالمگیری اس طرزِ تحریر کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس اسلوبِ تحریر میں بڑا خدشہ اس امر کا ہوتا ہے۔ کہ عبارت پھیکی اور طرزِ بیان خشک یا عامیانہ نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں جہاں قصص و حکایات سے عوام اس قدر مانوس ہیں۔ کہ علمی اور تنقیدی کتابوں میں بھی بجائے اُن پُر معنی اور عمیق نکتوں۔ کے جن سے واقفیت میں اضافہ ہو' اور دل و دماغ کی تربیت ہو' لطیفے اور قصے ڈھونڈے جاتے ہیں' یہ نقص خاص طور پر مہلک ہوتے ہیں۔ لیکن کامیاب انشا پرداز ان عیوب سے بچ نکلتا ہے۔ بلکہ اپنے مضمون کی عمدگی اور نفاست سے یا ان انشا پردازانہ خوبیوں سے جو اس کے اصل مقصد میں حارج نہیں ہوتیں' اپنی تحریر میں ایسی برجستگی اور موزونیت پیدا کر لیتا ہے۔ جو معنی رس ناظرین کو "منشیانہ" طرزِ تحریر کی مصنوعی انشا پردازی اور خطیبانہ طرزِ تحریر کے عامیانہ جوش و خروش سے کہیں زیادہ پسند خاطر ہوتی ہے۔ غالب نے یہ آخری طرز اختیار کیا۔ اور اس کو اپنی ان شخصی اور فنی خوبیوں کی مدد سے جن کا ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں۔ معراجِ کمال تک پہنچا دیا ٭

آبِ حیات اور اُردوئے معلّے کا طرزِ تحریر اور ان کے موضوع اس قدر مختلف ہیں۔ کہ ان کا صحیح طور پر موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آزاد کی ایک اور یادگار باقی ہے۔ جو اُردوئے معلّے کی طرح مصنف کے ذاتی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یعنی مکتوباتِ آزاد۔ اس میں کسی کسی صفحے پر ایک آدھ فقرہ ایسا مل جاتا ہے۔ جو آبِ حیات۔ قصصِ ہند اور دربارِ اکبری کا مصنف ہی لکھ سکتا تھا۔ لیکن ان مکتوبات کا غالب کے رقعات سے کیا مقابلہ؟ ؎

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت؟ خاک کو آسمان سے کیا نسبت؟

یہ صحیح ہے کہ آزاد نے جس کی ادبی زندگی کا ماحصل مکتوبات نہیں۔ بلکہ اُردو نثر کی دُوسری مُستقل کتابیں تھیں۔ اپنے خطوط میں وہ جگر کاوی نہ کی ہوگی۔ جو مرزا نے بعض رُقعات میں کی۔ لیکن مکتوباتِ آزاد اور اردوئے معلّے کے موازنہ سے کم از کم فنِ مکتوب نویسی میں غالب کی غیر معمولی فوقیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے +

ایک اور انشا پرداز جن کے طرزِ تحریر کا مرزا کی نثر سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مولینا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولینا مہر لکھتے ہیں :۔

"غالب کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہُوئے ہیں۔ میں نے قریباً سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دورِ حاضر کے اکثر اکابر اہلِ قلم سے بھی خط و کتابت کا شرف حاصل رہا۔ لیکن حضرت ابوالکلام آزاد کے سوا مجھے کسی بزرگ کے اندازِ تحریر میں غالب کی دلکش خصُوصیات نظر نہیں آئیں۔ مولینا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرۂ علم و فضل غالب کے مُقابلے میں بہت وسیع ہے"

مولینا کے خطوط ابھی تک چھپ کر شائع نہیں ہُوئے۔ اس لئے ان کی انہیں نثر دل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئی ہیں۔ مثلاً اُنکے وہ مضامین

جو الہلال یا البلاغ میں شائع ہوئے۔ تذکرہ۔ سوانح سرمد۔ ترجمان القرآن۔ بدقسمتی سے مولینا کے طرزِ تحریر نے اتنے رنگ بدلے ہیں۔ اور مختلف موقعوں پر اس نے اس قدر مختلف انداز اختیار کئے ہیں کہ اس کے متعلق آسانی سے کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ مولینا کی تحریریں ثقیل اور غیر مستعمل فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی۔ علمی اصطلاحوں کے لئے جہاں اُردو میں آسان الفاظ مل بھی سکتے تھے، وہاں وہ عربی کے غیر متعارف استعمال کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وہ اتحادِ اسلامی تحریک کے راہنما تھے۔ اور چاہتے تھے کہ تمام اسلامی دُنیا میں مشترک علمی اصطلاحیں استعمال ہوں۔ آج معاملہ دگرگوں ہے۔ اب وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اُردو کو ایک خالص اسلامی رنگ دینے سے یہ مُلک کی عام زبان نہیں بن سکتی۔ اور اس سے ملک کی دو نوں قوموں کے درمیان تمدنی اختلاف کی خلیج اور وسیع ہو جائیگی۔ چنانچہ اب وہ آسان زبان لکھتے ہیں۔ اور بھاشا اور ہندی کے وہ الفاظ، جنہیں حالی اُردو کی جان سمجھتا تھا۔ اور جن کا استعمال مولینا کے نزدیک اب تک ادبی کفر تھا، کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ بالجملہ مولینا کے تین اسالیب بیان ہیں۔ ایک تو وہ انشا پردازانہ رنگ جسے ان کے بعض معتقدین مولینا کا مخصوص طرزِ تحریر" سمجھتے ہیں۔ اور جسے انہوں نے تذکرہ کے آخری صفحات' یا سوانح سرمد' افسانہ' ہجر ووصال اور اس طرح کے دوسرے شاعرانہ رنگ کے مضامین میں برتا ہے۔ اس طرزِ تحریر میں تصنع اور آورد اور شانِ خودنمائی بہت ہے۔ کہیں کہیں نیرنگِ خیال کے مصنف کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ مضامین ایک ممتاز صاحبِ فن کی تحریریں ہیں۔ ان میں بھی ایک خاص انفرادی شان اور دلآویزی ہے۔ لیکن انہیں مرزا کی سادہ اور بے تکلف اُردو نثر سے وہی نسبت ہے۔ جو سحرِ سامری کو اعجازِ موسوی سے تھی۔ مولینا کی تحریریں بنگالے کا جادو ہے۔ (وہ دہلوی کہلاتے ہیں۔ لیکن نہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ نہ ہی ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس عروس البلاد میں گزرا)

ان کی تحریر میں وہ کوثر و تسنیم سے دُھلی ہُوئی اُردوئے معلےٰ ' جو خواصِ دہلی کی خصوصیت اور خطوطِ غالب کا زیور ہے ، مشکل سے ملے گی ۔

مولیٰنا کا دوسرا اسلوب تحریر خطیبانہ ہے ۔ جو الہلال اور البلاغ کے اکثر مضامین کی خصوصیت ہے ۔ اور جس نے ان کے "آتشیں" قلم میں اس قدر زور اور اثر بھر دیا تھا ۔ اردو زبان میں شاہ اسمٰعیل شہید کے بعد کسی نے یہ طرزِ تحریر اختیار نہ کیا تھا ۔ اور جب مولیٰنا نے اسے اختیار کیا تو اس میں اور ہی جدتیں اور شوخیاں پیدا کیں ۔ نتیجہ یہ کہ مولیٰنا کا یہ اسلوبِ تحریر اخبار بینوں کو بالکل نیا معلوم ہُوا ۔ اور الہلال اور البلاغ کو اس طرزِ تحریر کی بدولت ہی ایسا درجہ مل گیا ۔ جو کبھی کسی اُردو اخبار کو حاصل نہ ہُوا تھا ۔ آج مولیٰنا نے یہ طرزِ تحریر بہت حد تک ترک کر دیا ہے ۔ اور شاید وہ اس کی مضرتوں سے آگاہ ہو گئے ہیں ۔ اُنہوں نے دیکھا ہوگا ۔ کہ اس طرزِ تحریر کا تتبع بہت آسان ہے ۔ اور اسے ان کی مخالفت اور تردید کے لئے بھی اُسی زور اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ جس طرح اُنہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کیا تھا ۔ واقعہ یہ ہے ۔ کہ جن ملکوں نے کچھ ترقی کی ہے ۔ وہ جوشیلے اور خطیبانہ طرزِ تحریر کو ایک سراب اور دھوکہ سمجھتے ہیں ۔ اور اسے ادب کی ایک پست شاخ (Rhetoric) میں جگہ دیتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں ۔ کہ خواہ تقریروں میں جوش اور خطیبانہ حربے جائز ہوں (اگرچہ دیدہ ور لوگ وہاں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر مقرر کے بیان میں جو ٹھوس سچائی ہو ، اسی کو دیکھتے ہیں ۔ اور انگریزی میں تو جوشیلی تقریروں کے لئے ایک بڑا حقارت آمیز لفظ Harangue استعمال ہوتا ہے) لیکن تحریر میں تو اُن کا استعمال بہت کم ہونا چاہئے ۔ جوشیلی تقریر سے ایک ہنگامی جوش پیدا ہو جاتا ہے ۔ جس سے شاید کوئی وقتی نتیجہ نکل بھی آئے ۔ لیکن تحریر کا مقصد تو پائدار اور دیرپا کام ہوتا ہے ۔ اس کے لئے جوشیلا طرزِ بیان کار آمد نہیں ہو سکتا ۔

بلکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے ۔ جس میں قوتِ متمیزہ شل' اور سوچنے اور عملی کام کرنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے ۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر یہ حقیقت نہیں سمجھی جاتی ۔ آج بھی جب کوئی تیز طرار مقرر جس کا دماغ مغز و ہوش سے عاری ہوتا ہے' لیکن جس کے منہ میں گز بھر کی زبان ہوتی ہے' اٹھتا ہے ۔ اور اٹھو ۔ جاگو کا شور الاپتا ہے ۔ تو لوگ سمجھتے ہیں ۔ کہ ایک نیا مسیحا آگیا ۔ جو مُردوں کو زندہ کر دے گا ۔ لیکن مغز و ہوش کی تلافی چرب بانی سے اور ٹھوس عملی کام اور محنت کی کمی جوش و خروش سے پوری نہیں ہو سکتی ۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی اتنے مسیحاؤں کی آمد کے باوجود لوگ جیسے پہلے تھے ۔ ویسے اب ہیں!

خطیبانہ طرزِ تحریر میں بڑی خامی یہ ہے ۔ کہ اسے نہ صرف حق' بلکہ باطل کی حمایت کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اور اس سے نہ صرف عالمانہ خیالات کو زیادہ مقبول اور حکیمانہ اور پُر مغز ہدایات کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے ۔ بلکہ چالاک لوگ اسے اپنی تہی مغزی چھپانے اور اپنے معمولی اور بے مایہ خیالات کو آب و تاب دینے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں ۔ مولینا کے بعض مقلدین میں یہ نقائص ہیں ۔ لیکن مولینا کی تحریر کی نسبت کوئی نہیں کہہ سکتا ۔ کہ یہ ایک استخوانِ بے مغز ہے ۔ جوشیلے اور خطیبانہ طرزِ تحریر کے باوجود اس میں مولینا کی وسیع علمیت' خلوص اور ذہانت کا عکس ہے ۔ اور اس طرزِ تحریر کو انہوں نے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ۔ اس طرزِ تحریر میں خطرات بہت زیادہ ہیں ۔ اور ہمارے خیال میں مولینا نے اسے اردو صحافت میں رواج دیکر قوم کی کوئی خدمت نہیں کی +

مولینا کا تیسرا طرزِ تحریر وہ سادہ اندازِ بیان ہے ۔ جسے انہوں نے ترجمان القرآن کے مقدمہ یا حال کے بعض مضامین میں استعمال کیا ۔ لیکن اس نثر کی مقدار بہت تھوڑی ہے ۔ اور اگرچہ یہ علمی مضامین کے لئے مولینا کے مخصوص طرزِ تحریر یا خطیبانہ اندازِ بیان سے زیادہ

موزوں ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی امتیازی نشان نہیں۔ کہ اسے مرزا کی نثر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

قصہ کوتاہ مولینا ابوالکلام آزاد کا عام رنگ مرزا کی نثر سے اس قدر مختلف ہے۔ کہ ان دونوں کا صحیح طور پر مقابلہ مشکل ہے۔ اور بہرکیف مولینا کی نثر کو مرزا کی نثر کے ہم پایہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگرچہ اس میں ایک دو ایسی خصوصیتیں ہیں۔ جو مرزا کی تحریر میں نہیں لیکن اس میں کئی ایسے اہم بنیادی نقائص ہیں۔ جن سے مرزا کی نثر پاک ہے۔ مولینا کی نثر کا مرزا کی نثر سے شائد اس وقت صحیح طور پر موازنہ ہو سکے۔ جب مولینا کے خطوط شائع ہوں۔ اور یہ دیکھا جا سکے۔ کہ ان خطوط کے متعلق مولینا مہر کی رائے کس حد تک صحیح ہے۔ پتہ نہیں یہ وقت کب آئے۔ (اور مولینا نے اپنے حالات بر اخفا کا ایک ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے۔ کہ شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے) لیکن ہمارا خیال ہے۔ کہ اس وقت بھی اردوئے معلٰے اور عودِ ہندی کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور اسکی وجہ وہ عظیم تفاوت ہے۔ جو مرزا اور مولینا کی شخصیت میں ہے۔ مولینا مرزا کے بڑے مداح ہیں لیکن ان کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین ہے۔ مولینا ایک مذہبی عالم، مرزا ایک رند، آزاد خیال، آزادہ رو۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مولینا بھی رندی کے کوچے[1] سے نابلد نہیں۔ لیکن انکا اور مرزا کا کیا مقابلہ!

اس کے علاوہ مولینا کے خطوط میں شوخی و ظرافت کہاں سے آئے گی۔ جو مرزا کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولینا طبعاً جوشیلے، اور متین، مرزا شوخ، اور رنگین خیال اور بذلہ سنج، اس کے علاوہ دونوں کے فلسفۂ زندگی اور عام اسلوبِ خیال میں بڑا فرق ہے۔ مرزا بھی ایک

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ کا آخری باب

امنگوں اور آرزوؤں بھرا دل لاتے تھے۔ اپنے جیسا کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ لیکن زندگی میں ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ کہ سارے نشے ہرن ہو گئے۔ اور خود اعتمادی اور تیقن کی جگہ تردد اور تشکک نے لے لی۔ مولینا کا حال اس سے مختلف ہے۔ انہیں چھوٹی عمر میں ایسی فقید النظیر کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ کہ ان کے دل میں گرہ بیٹھ گئی۔ کہ ان کے سامنے باقی سب طفل مکتب ہیں۔ وہ ابھی چبیس برس کے نہ تھے۔ جب انہوں نے 'الہلال' جاری کیا۔ اور اس کی مدد سے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ان میں اگر خود رائی اور خود بینی آ گئی۔ تو کونسا تعجب کا مقام ہے ؎

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بُت آئینہ سیما مرے آگے!

مرزا بھی اپنے مقابلے میں دوسروں کو ہیچ خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے تئیں غلطی سے مبرا نہ سمجھتے تھے۔ اپنی غلطی ماننے اور اس کی اصلاح کرنے میں انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ ناطق مکرانی نے انہیں ان کے ایک شعر میں سقم بتایا۔ تو انہوں نے فوراً اس کی اصلاح کر دی۔ 'افسوس اور اسف' کی اصل کے متعلق غلط رائے بتانے پر انہوں نے کئی جگہ تاسف کا اظہار کیا۔ لیکن مولینا کی زندگی اور تصانیف میں ایسی مثالیں ڈھونڈے سے نہ ملیں گی۔ اس کے علاوہ مرزا کے تلخ تجربوں نے ان کے فلسفۂ زندگی میں توازن پیدا کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ سب امنگیں، خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہوں، اور سب ولولے خواہ وہ نیک ہی کیوں نہ ہوں۔ پورے نہیں ہوتے۔ اس احساس نے ان کی ابتدائی خود اعتمادی کم کر دی تھی۔ وہ اُس تبسم زیر لب کے ساتھ جس سے ایک فرزانۂ جہاں دیدہ شباب کی سادگی بلکہ سادہ لوحی کو دیکھتا ہے، ایک عزیز کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ہوس پیشہ ہیں ۔

ہر مُدعا کے حصُول کو آسان سمجھتے ہیں"۔ لیکن مولینا ابوالکلام آزاد کے نزدیک تو یہ تشکک جو فی الواقع زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہونے کا نتیجہ ہے ضعفِ ایمان کی علامت ہے۔ وہ مولینا شبلی سے اس لیئے ناراض تھے۔ کہ وہ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تردد و تامّل کیوں کام میں لاتے تھے[1]۔ اُن میں خود اعتمادی و خود رائی غضب کی ہے۔ دُنیا ان کی نگاہوں میں ایک کفِ دست سے بھی مختصر ایک صاف اور چٹیل میدان ہے۔ جس کی ہر راہ سے وہ واقف اور ہر روش سے آشنا ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک حق و باطل[2]، خلوص و ریاکاری کی ایک مُسلسل آویزش ہے۔ جس میں ان کا راستہ اور طریق کار معین ہے۔ لیکن جو بدقسمت یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس ناقص دنیا میں کبھی کبھی باطل بھی حق کے رُوپ میں رُونما ہو جاتا ہے۔ اور عام دنیاوی معاملات میں تو حق و باطل اس طرح دست و گریباں ہیں۔ کہ انہیں متمیز کرنا مشکل بلکہ حق و باطل کے مختلف ناموں سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ وہ اگر اپنی مشکلات کے حل اور حق و باطل کی حقیقت سمجھنے کے لئے مولینا کی طرف رجُوع کریں۔ اور مولینا اپنے نہاں خانۂ ضمیر میں نگاہ ڈال کر، اور اپنے باطنی رجحانات سے کماحقہٗ آشنا ہو کر جواب دیں۔ تو شاید انہیں ایک

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ صہ ۱۸۱

[2] الہلال اور البلاغ میں بیسیوں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ جن میں مولینا نے روزمرہ کے معمولی واقعات کو حق و باطل کے رُوپ میں نمایاں کیا ہے۔ مثلاً "مُسلم یونیورسٹی" کا مسئلہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کے متعلق دیانتدارانہ اختلاف رائے کی گنجائش تھی لیکن مولینا نے ہمیشہ اسے جس رنگ میں دیکھا۔ اسکے ملاحظہ ہو "مسئلہ مُسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو دُنیا خواہ کچھ ہی سمجھے۔ مگر میں نے ہمیشہ اس میں ایک ہی چیز کو دیکھا۔ اور ہمیشہ اسے ایک ہی طرح کی صدائیں سنیں ہیں نے دیکھا کہ حق و باطل معرکہ آرا ہیں۔ اُسے گو مختلف صداؤں، مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں منظر آرائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر انکے اندر بجز حق و باطل کے مقابلے کے اور کچھ نہیں ہے"۔

فرانسیسی سیاست دان کے فقرے دُہرانے پڑیں "حق؟؟- حق، میرے دوستو، وہ ہے جس کی میں حمایت کروں۔ اور باطل، وہ جس کا میں مخالف ہوں!!"

غرض کہ اگرچہ مولینا ابوالکلام آزاد علمی قابلیت، ذہانت اور ادبی ذوق و شوق میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اور ان کے قلم سے ایسے ایسے زوردار اور پُرشکوہ مضامین نکلے ہیں، کہ اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں ان کا مقام زبان کے ممتاز ترین انشاپردازوں کے ساتھ ساتھ ہوگا۔ لیکن ان کی۔ اور مرزا غالب کی طبیعتیں مختلف ہیں۔ طرزِ تحریر جُداگانہ ہیں۔ ان کے خطوط کی اشاعت سے مکتوباتِ غالب کی مقبولیت کم ہونے کا کوئی امکان نہیں ÷

غالب کی مقبولیت کے اسباب

ہم نے مرزا کی شاعری اور نثر کی خصوصیات جس ترتیب سے وہ کسی دور میں زیادہ نمایاں تھیں۔ بیان کردی ہیں۔ لیکن غالب کی غیر معمولی مقبولیت سمجھنے کے لئے وہ کافی نہیں۔ کلامِ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے۔ "لوح سے تمت تک مشکل سے سَو صفحے ہیں لیکن کیا ہے۔ جو یہاں حاضر نہیں۔ کونسا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لئے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں۔ جو دیوان غنی میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت ہے۔ اور انسانی فطرت کی داستان سُننا ہو۔ تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی کہ جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جائے گی ان کا لُطف بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے۔ اور لُطف

اُٹھاتا ہے :

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں۔ اور ہر نغمہ دلآویز ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ کلامِ غالب سنی سُنائی باتوں کا بیان نہیں۔ بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں۔ اور دیوانِ غالب انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

سر والٹر رالے نے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے۔ "وہ کمیاب ترین چیز تھا یعنی ایک پورا انسان" شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں۔ تو مرزا کا پلہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طنزاً لکھا تھا۔[1] "آپ انتخابِ زماں ہیں۔ یکۂ دوراں ہیں۔ جس طرف طبیعت آئی۔ اس کی خاک اڑائی چنانچہ دخترِ رز سے جو لاگ لگائی۔ تو وہ ظرف پیدا کیا۔ کہ مینائے گردوں میں شرابِ شفق واضیٔ آفتاب بادب پیشکش لایا۔ اور قمار بازی پر جو دھیان کیا۔ تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے۔" لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر مے خانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے۔ تو شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولینا صدرالدین اُن کے عزیز ترین دوست تھے۔ اور جس کثرت سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں ادا ہوئی ہیں ہندوستان کے شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملیں۔ وہ رنگ رلیوں میں بلکہ جوان ہوئے تھے۔

---

[1] گلستانِ بیخزاں

لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر اُن پر چلائے اور جہاں وہ بزمِ نشاط اور محفلِ عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے وہاں دردمند دل کی مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخوار ہو یا محتسب۔ شوخی اور ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ فلسفی ہو یا عاشق مزاج ان سب کے لئے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے ؞

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے۔ اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا۔ آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے۔ اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی۔ بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے۔ جب کلکتہ میں انکے اشعار پر یہ اعتراض ہُوا کہ انہوں نے قتیلؔ کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ تو انہوں نے بڑے جوش سے کہا تھا ؎

زلہ بردارِ کس چرا باشم　　من ہُمایم مگس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر اُن کی امتیازی خصوصیت رہی۔ اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے۔ وہ اگرچہ بہت بلند پایہ نہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یہ بات مشترک ہے۔ کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے۔ مغربی شاعری کے تنقیدی اصول بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزا نے اردو مکتوب نویسی میں جو

رنگ اختیار کیا۔ وہ فارسی فن انشا کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے ۔ مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی بہ نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہیں؛

اعتراضات

موجودہ نسل کو پرانی طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالب سب سے زیادہ پسند ہے ۔ لیکن جن لوگوں نے فن تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزوی اور فروعی باتوں میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے ۔ انہوں نے غالب کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے ۔ کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں۔ اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے ۔ مضمون کی وحدت سے نہیں ۔ اور غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کی بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے وقف ہیں لیکن آخر یہ غالب کی بد قسمتی تھی ۔ کہ جب اُس نے شعر گوئی شروع کی تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنفِ شاعری مقبول نہ تھی ۔ اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالب کے دیوان میں مسلسل غزلیات اور قطعہ بند اشعار کی جو کثرت ہے ۔ وہ کسی اور اُردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی ۔ اور اس کی بہترین غزلوں میں کچھ قافیہ ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کی اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت چھپ گئی ہے ۔ اور کوئی تال بے سُر معلوم نہیں ہوتی؛

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے ۔ کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں

اس لئے غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور اُن کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے۔ اُسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے۔ اور نہ غزل میں شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو۔ لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنےٰ ہیں۔ انہوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:-

"کیا ہنسی آتی ہے۔ کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے۔ اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اُس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔"

ایک اور خط میں غزل کے لئے عشق و محبت اور معشوق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے:- "شعر کیا کہوں گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں۔ جو غزل کی روش ضمیر میں آوے رہا قصیدہ۔ ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح　　اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل"

قطع نظر اس امر سے کہ مرزا قافیہ پیمائی سے خود متنفر تھے۔ ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ تو کل دوسرا۔ چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تفاوت موجود ہے۔ لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا۔ جسے غالب کی

اُس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جا سکے۔ جس سے ہم یادگارِ غالب کی وجہ سے خوب واقف ہیں۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا۔ اور ان کے اشعار میں بھی اپنے ہی خیالات کی تکرار ہوتی ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ انہوں نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا۔ اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے بیسیوں اشعار ہیں۔ اور ہر شعر ان کی وسعتِ نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے۔ اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر، وہ مرزا ہی کے اسلوبِ خیال کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھ دیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل ایک جامۂ موزوں ہے۔ جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا۔ اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا ؛

اُردو کے کلاسیکل نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں۔ وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں۔ یا بقول سر والٹر رالے "جیب کھترو والوں" کی نقادی یعنی سرقہ اور توارد کی بحث! مرزا یاس اور مولینا آرگس (مولینا عبدالباری آسی؟) نے محنت اور تحقیق سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے کئی شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانے میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا تھا۔ لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں۔ اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اسکے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہو جاتیں ؛

نیچرل شاعری

مرزا کی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ "نیچرل" نہیں۔ جب حالی نے یہ اصطلاح شعر و شاعری میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی تو اُس نے اس سے وہ شاعری مراد لی تھی جو خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہو۔ اگر کلامِ غالب کو اس نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو یہ اعتراض صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگرچہ مرزا نے عام شاعروں کی طرح کئی جگہ مبالغے سے کام لیا ہے لیکن انکے بیشتر مضامین امورِ فطرت کے مطابق ہیں۔ اور فطرتِ انسانی کے جو راز اُن کے کلام میں بے نقاب ہوئے ہیں۔ وہ دوسرے اُردو شعرا کے کلام میں بہت کم ہیں۔ لیکن معترضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظرِ قدرت کی شاعری مراد لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ مرزا کے کلام میں یہ بڑا عیب ہے کہ انہوں نے مغربی شاعروں کی طرح مناظرِ فطرت کے متعلق نظمیں نہیں لکھیں۔ حقیقتاً یہ اعتراض بھی خاص مرزا کے متعلق نہیں۔ بلکہ بیشتر مشرقی شعرا پر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ عموماً وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کی تقلید سے تو آزاد ہو جاتے ہیں۔ لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کو انتہائی آزاد خیالی اور معراجِ کمال سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں مناظرِ فطرت کے متعلق ہیں اور انگریزی ادب میں مناظرِ فطرت کی شاعری کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انگلستان بالخصوص لیک ڈسٹرکٹس میں شاندار مناظرِ قدرت کی جو فراوانی ہے۔ وہ ہندوستان یا کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں میسّر نہیں۔ اور اگر کوئی دہلوی شاعر اس خیال سے مرعوب ہو کر کہ انگریزی شاعری میں مناظرِ فطرت کے متعلق بہت نظمیں ہیں۔ خود بھی اُونچے اُونچے پہاڑوں اور خوش منظر جھیلوں کے خوبصورت مناظر اور چہچہاتے پرندوں کی موسیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے۔ تو ظاہر ہے کہ

اس سے زیادہ "اَن نیچرل" یا مصنوعی شاعری کوئی نہ ہوگی۔ کیونکہ شاعر نے تو خود یہ مناظر دیکھے ہی نہیں۔ جو لوگ گرم ملکوں اور چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہ دلفریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر۔ سوئٹزرلینڈ یا لیک ڈسٹرکٹ میں بہم پہنچائے ہیں۔ انہیں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ وہ نہایت محدود ہیں۔ مثلاً چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی، دریا کا کنارہ، بسنت، بہار، برسات۔ اور اُردو میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں +

مرزا بھی ان مناظر سے بے پروا نہ تھے۔ اور اُن کے فارسی کلیات اور اُردو دیوان میں متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بہار، صبح، شام، برسات اور موسم سرما کی دلآویز تصویریں کھینچی ہیں۔ "نمودارئ صبح" اور "ہجوم ظلمتِ شب" کے متعلق تو مرزا نے فارسی نثر میں بھی عبارت آرائی کی ہے اور اس سلسلے میں دو دلچسپ فارسی مثنویاں لکھی ہیں۔ مرزا کے ابتدائی اردو کلام میں بھی کئی نئی تشبیہیں ایسی ہیں۔ جو شاعر نے مناظرِ فطرت سے اخذ کی ہیں۔ اور جو ذاتی مشاہدے پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن مناظرِ فطرت کا بہترین بیان مرزا کے ان کے قصیدوں میں ہے۔ جن کی تشبیبیں ان مناظر کے لئے وقف ہیں۔ بہار کا موضوع مشرقی شعرا کو خاص طور پر مرغوب ہے۔ اور مرزا بھی اس سے مستثنٰی نہ تھے۔ اُردو میں ان کا پہلا قصیدہ منقبت میں ہے۔ لیکن اس کی تشبیب بہار کی چمن آرائیوں کے لئے وقف ہے۔ اُردو میں ایک مشہور قطعہ بند غزل ہے۔ جو تمام کی تمام بہار کے متعلق ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی　　　کہ ہُوئے مہر و ماہ تماشائی

کئی فارسی قصائد کی تشبیبیں اس دلکش موضوع کے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک کے

کے چند اشعار ہم ارمغانِ غالب میں درج کریں گے ؎

بازپیغامِ بہار آورد باد　　مژدۂ بہرروزگار آورد باد

ایک فارسی قطعہ میں اس موسم کی حیات بخش کیفیتوں کو بڑے جوش اور سرور کے ساتھ نظم کیا ہے ؎

نوروز و مہرگاں نبود در طریقِ ما　　اما شگفتہ روئی گلہائے تر خوش است
نوروز عید نیست بہار است و در بہار　　آئینِ شادمانی و ذوقِ نظر خوش است
از بادِ زمہریر بہ گیتی نشاں نماند　　جوشِ گل و نشاطِ نسیمِ سحر خوش است
بویش مشام پرور و زنقش نظر فروز　　خوش باد وقتِ گل کہ جہاں سر بسر خوش است
از رنگ رنگ ترد و از گونہ گونہ گل　　گلزار و شہر بیشہ و کوہ و کمر خوش است
دریا خوش و سراب خوش و کوہسار خوش　　منزل خوش است توشہ خوش است و سفر خوش است

بہار کے علاوہ مرزا کا دوسرا پسند موضوع صبح کا سماں تھا۔ جسے اُنھوں نے کئی قصائد میں بڑے دلآویز طریقے سے بیان کیا ہے۔ اُردو کا ایک مشہور قصیدہ ہے ؎

صبح دم دروازۂ خاور کھُلا　　مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　اِک نگارِ آتشیں رخ سر کھُلا

فارسی میں بھی صبح کا بیان کئی قصیدوں میں ہے۔ ایک پُرلطف قصیدہ کا مطلع ہے ؎

داد کو تا ستم بر اندازد   طرحِ نو چرخ دیگر اندازد

اس کی تشبیب تمام ترراِت کے اختتام اور ہنگامۂ صبح کے آغاز کے متعلق ہے۔
بہار کی نسبت تو شاید کہا جائے۔ کہ یہ ایک فرسودہ موضوع ہے۔ جسے ہندستانی شعرا زیادہ تر فارسی شعرا کی تقلید میں نبھاتے آئے ہیں۔ یہاں پر بہار کا اصل سماں موسم برسات میں ہوتا ہے۔ لیکن مرزا بھی اس اطمینان اور مسرت سے ناواقف نہ تھے۔ جو اس ملک میں موسمِ گرما کے اختتام اور برسات کے آغاز پر ہوتا ہے۔ ایک فارسی قطعہ کے ابتدائی اشعار ہیں؎

بہارِ ہند کہ نامند برشگال آں را   پس از دو سال بہ اہلِ جہاں مُبارکباد
بہ باغ و کشت و بیاباں و کوہ سرتاسر   سحاب و سبزہ و آبِ رواں مُبارکباد
گذشت عہدِ سموم و وزید بادِ خنک   زجاں بہ تن دگر از تن بجاں مُبارکباد

اردو میں بھی ایک مختصر سا قطعہ ہے۔ جو مرزا نے "ابرِ رحمت کے شکریہ" میں لکھا ہے۔ بیشتر اشعار نواب کلب علی خاں کے لئے دعائے صحت اور اپنے عرضِ حال کے متعلق ہیں۔ لیکن برسات کا بیان بھی بڑی شوخی اور نئے رنگ سے کیا ہے؎

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک   رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیِ مہ وش کہاں ہے، ابرِ مطیر؟   بیار، لا مئے گُلنار گوں، بیار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی   درِ حضور پر اے ابر بار بار برس

موسمِ برسات کی دل آویزیاں تو اس ملک میں سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن مرزا یہ بھی جانتے تھے کہ موسمِ سرما جو شیراز و غزنی اور بخارا و سمرقند میں برفباری اور بڑی اذیتوں کا موسم ہوتا ہے۔ اور جس کی ان علاقوں کے شعرا قدرتی طور پر مذمت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر خوشگوار ہوتا ہے۔ انہوں نے نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کے قصیدہ میں اس موسم کے متعلق جو کچھ

لکھا ہے۔ وہ تمام تر ذاتی مشاہدہ پر مبنی اور شخصی خیالات کا اظہار ہے ؎

عیدِ اضحےٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد　　وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب برون رفت و حرارت ز ہوا　　محملِ مہرِ جہانتاب بہ میزاں آمد
روز میکاہد و شب راست و افزائش رو　　موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد
ہند در فصلِ خزاں نیز بہارے دارد　　گونہ گوں سبزہ محلّی بندِ خیاباں آمد
دے و بہمن کہ در اقلیمِ دگر یخ بندد　　اندریں ملک گُل و سبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست کہ اورہ نسیم　　گفت جانیست دم گر سر زدہ نتواں آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ　　گوئے و چوگاں بکف آورد و بمیداں آمد
تا برد داغِ غمِ ہجر شقائق ز دلش　　گُلِ صد برگ بہ دلجوئے دہقاں آمد

گر نہ ایں گرمئ ہنگامہ تماشا دارد
از چہ نرگس پئے نظارۂ بستاں آمد

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ مرزا مظاہر فطرت سے بے پرواہ نہ تھے اور اُنہوں نے ان کے متعلق بہت پاکیزہ اور دلآویز اشعار لکھے ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ کہ انکے ہاں نیچر فقط ایک دلچسپ شاعرانہ موضوع ہے۔ ورڈز ورتھ اور بعض دوسرے مغربی شعرا کی طرح ایک ایسی زندہ اور دلآویز شخصیت نہیں۔ جس سے شاعر کو محبت ہو جاتی ہے۔ اور جو اسے انسانی دنیا کی کلفتوں سے بچا کر آرام و سکون بہم پہنچاتی ہے۔ مرزا کو نیچر سے وہ والہانہ دلبستگی نہ تھی۔ جو ورڈز ورتھ کو تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ نیچرل شاعری کی نشو و نما ایک شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔ اور ایک شہری شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ نیچر اور مناظرِ فطرت کی شاعری میں معراجِ کمال حاصل کرے +

غالب کی عشقیہ شاعری

محبت کی خیالی اور رسمی تصویریں

محبت غزل گو شعرا کا مقبول موضوع ہے۔ اور مرزا اس سے مستثنےٰ نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہا جاسکے کہ محبت اور زندگی غالب کی شاعری کے دو سب سے اہم موضوع ہیں محبت کے متعلق غالب کے اشعار کئی طرح کے ہیں۔ زیادہ تعداد ان اشعار کی ہے۔ جنہیں مضمون آفرینی اور خیال آرائی کی مثالیں سمجھنا چاہیئے۔ ان اشعار میں محبت کی جو رسمی تصویریں ہیں۔ غالب نے انہی کو آب و تاب دیگر یا شوخی اور جدت خیال سے انکا نیا پہلو سوچ کر پیش کر دیا ہے۔ ان اشعار میں غالب کی زندگی کے شخصی واقعات یا محبت کے متعلق اس کا خاص نقطۂ نظر نہیں ڈھونڈا جاسکتا یہ اشعار ذہنی مشق کی مثالیں ہیں۔ جن میں خیالات اور جذبات تو پرانے یا رسمی ہیں لیکن خیال بندی اور مبالغہ یا شوخی سے نئے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً ؎

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہے دلِ شوریدہ غالبؔ اک طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اُلجھتے تم ہو اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی | سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا | بس چُپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے
گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی | اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

یہ اشعار کسی اہم نفسیاتی حقیقت یا قلبی واردات کا اظہار نہیں۔ بلکہ اُس "خیال آفرینی" کی مثالیں ہیں۔ جسے ابتدائی شاعری میں مرزا نے دور از کار تشبیہیں لانے اور دقیق اور عجیب مضامین باندھنے میں صرف کیا تھا۔ اور ان اشعار میں مروجہ عشقیہ مضامین کے غیر معروف پہلو ڈھونڈنے اور ان میں لُطف پیدا کرنے میں "رشک" کے اشعار بھی اسی قبیل سے ہیں مثلاً ؎

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے | مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را | رشک نگذارد کہ گویم نام را

رشک کے اشعار کی سب سے زیادہ افراط آخری دَور میں ہے۔ جس میں صاف اور شگفتہ طرزِ تحریر کے علاوہ شوخی اور ظرافت کی کئی مثالیں ہیں۔ یہ اشعار بھی حقیقتاً اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جذبات سے زیادہ تفننِ طبع کا اظہار ہیں ؎

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار | مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل | میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا | کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے | ہُوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اسی طرح دَورِ ثالث کی ایک فارسی غزل ہے ؎

بمرگِ من کہ پس از من بمرگِ من یاد آر | بکوئے خویشتن آں نعش بے کفن یاد آر

بخود شمار وفاہائے من ز مردم پرس | من حساب جفاہائے خویشتن یاد آر
چہ دید جانِ من از چشمِ پرخمار بگو | چہ رفت بر سرم از زلفِ پرشکن یاد آر
بسنج تا ز تو بر من براں محل چہ گذشت | نخواندہ آمدنِ من در انجمن یاد آر

یہ غزل بھی ایک ذہنی مشق سے زیادہ نہیں۔ اس میں شاعر اپنے دلی جذبات کا بیان نہیں کرتا۔ بلکہ عشقیہ شاعری کے مروجہ اصولوں کے مطابق ایک خیالی تصویر بنا کر اسی سے ناظرین کی ضیافتِ طبع کا سامان کرتا ہے +

نفسیاتِ محبت

ان اشعار کے علاوہ غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں اپنی قلبی کیفیت تو خاص طور پر نمایاں نہیں کی۔ لیکن جن میں نفسیاتِ محبت کے بعض نئے یا اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک شعر نہایت بلیغ ہے ؎

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا | نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اس کے علاوہ اور کئی شعر ہیں ؎

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن | میانہ من و او ذوق حائل افتادہ است
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب | کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے | غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ایک اور تاسف (اور تجربے سے) بھرا ہوا شعر ہے ؎

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے | یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

مشہور عشاق کے متعلق غالب کی رائے

ان اشعار کے علاوہ چند دلچسپ اشعار وہ ہیں۔ جن میں غالب نے روائتی عشاق کے متعلق اظہار رائے کیا ہے۔ ایشیائی شاعری کے مشہور عشاق میں سے

فرہاد پر غالب نے اکثر نکتہ چینی کی ہے ۔ مثلاً ؎

عشق و مزدورئ عشرت گہِ خسرو کیا خوب　　ہم کو تسلیمِ نکو نامئ فرہاد نہیں

کریگے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر　　ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

اور بھی کئی شعر ہیں جن سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ۔ مثلاً ؎

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام　　ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب　　بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

زلیخا سے بھی مرزا بہت خوش نظر نہیں آتے ؎

نزدِ ما حیف است گر نزدِ زلیخا میل باش　　جذبۂ کز چاہ یوسف را به بازار آورد

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے　　ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

یوسف مصری کا ذکر بڑی شوخی سے کیا ہے ؎

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی　　سفیدی حضرتِ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پرانے عشاق میں سے قیس ایک ایسی ہستی ہے ۔ جس کا مرزا ادب کرتے ہیں ۔ اور جس کی "ہم طرحی" کا انہیں بھی خیال آتا ہے ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا　　فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

مندرجہ بالا اشعار تو ان عشاق کے متعلق ہیں ۔ جن کی محبتیں بشری اور مجازی تھیں ۔ عشاقِ الٰہی میں سے حضرت موسیٰؑ کی نسبت کئی اشعار ہیں ۔ جو مرزا کی شوخیٔ طبع بلکہ تنقیدی نقطۂ نظر کے مظہر ہیں ۔ مسلمان شعرا نے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ دیدارِ الٰہی اور رسولِ اکرمؐ کے واقعہ معراج کا اکثر موازنہ کیا ہے ۔ نعت میں ایک فارسی شعر ہے ؎

موسےٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات تو عین ذات مے نگری و در تبسمی

غالب نے بھی حضرت موسےٰ کے متعلق اس خیال کو نہایت نفیس طریقے سے نظم کیا ہے، ؎

نکتہ داریم و با یاراں نمے گوئیم فاش طالبِ دیدار باید تابِ دیدار آورد

کئی اشعار زیادہ واضح ہیں ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

منصور کی نسبت ایک نہایت پرمعنی شعر ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرتِ اسمٰعیل کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے ؎

رشکِ وفا نگر کہ بدعوےٰ گہِ رضا ہر کس چگونہ درپئے مقصود مے رود

فرزند زیرِ تیغ پدر سے نہد گلو گر خود پدر در آتشِ نمرود مے رود

غالب کا نظریۂ محبت

غالب کے واقعاتِ زندگی اور ان کے کلام پر غور کرنے سے ایک بات نمایاں ہو جاتی ہے۔ کہ انہیں دنیا کی اچھی چیزوں سے بے حد محبت تھی۔ نسوانی حسن ان اچھی چیزوں میں شاید سب سے بڑھ کر تھا۔ اور غالب کی جوانی جس طرح حسن پرستی میں بسر ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے۔ نواب اعظم الدولہ نے ان کی نسبت لکھا تھا "درخاطر متمکن غمہائے عشقِ مجاز۔ تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز"۔ غالب خود اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہر جلوہ راز من بتقاضائے دلبری از غنچہ بود محمل تازے بہ رہ گزار

ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دلبراں فرہنگ کاردانئے بیداد روزگار

ہم دیدہ از ادائے مغان شیوہ شاہداں | فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار
شوقم جریدۂ رقم آرزوئے بوس | ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و شور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار!

ان اشعار کے علاوہ اردو میں غالب کی ایک نہایت موثر غزل ہے۔ جس کی نسبت یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ محبوبہ کا نوحہ ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب کا یہ نوحہ تمام کا تمام بڑے غور و فکر کا مستحق ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں۔ جو اگر رسمی قافیہ پیمائی کا نتیجہ نہیں۔ تو ممکن ہے۔ ان میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔ ؎

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ | تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال | دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں | ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

مقطع کا شعر جسے غالب نے اشاعت کے وقت حذف کر دیا، بہت پر معنی ہے ؎

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسدؔ
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

یہ نوحہ غالب نے بیس بائیس برس کی عمر میں اس زمانے میں لکھا تھا۔ جب وہ ابھی اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جس محبوبہ کا اس میں ذکر ہے۔ اسے غالب سے اور غالب کو اس سے بڑی محبت تھی۔ اور شاید مرزا کی اتنی گہری دلبستگی پھر کسی سے نہیں ہوئی۔

اس واقعہ کے چالیس بیالیس برس بعد مرزا ایک خط میں مرزا حاتم علی مہرؔ کی معشوقہ کی تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں۔ اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چُھٹ گیا۔ اس فن میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

اس کے بعد کسی گہری محبت کے نشان غالب کی زندگی میں نہیں ملتے۔ لیکن مخلوقاتِ قدرت میں حسن ڈھونڈنے کی جو خواہش شاعر کے دل میں ازل سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ تمام عمر ساتھ رہی۔ چنانچہ مرزا نے اکتیس برس کی عمر میں جو فارسی مثنوی بنارس کے متعلق لکھی ہے اس میں اپنی "جنتِ نگاہ" کا نقشہ کھینچا ہے۔

بتانِ بنارس کی نسبت لکھا ہے ؎

میاں نہا نازک و دلہا توانا ۔۔۔ ز نادانی بکارِ خویش دانا

تبسم بسکہ در بہا طبیعی ست ۔۔۔ دہنہا رشکِ گلہائے ربیعی ست

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار ۔۔۔ خرامے صد قیامت فتنہ در بار

بہ لطف از موجِ گوہر نرم روتر ۔۔۔ بہ ناز از خونِ عاشق گرم روتر

قیامت قامتاں مژگاں درازاں

ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں!

اسی زمانے میں ایک بڑی زوردار غزل انہوں نے اُردو میں لکھی جس میں اپنی حسین و جمیل امنگوں کی ایک دلآویز تصویر الفاظ میں پیش کی ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

مرزا کی محبت خالص زمینی ہے۔ ایک صحت مند انسان کی دُنیا کی اچھی چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش لیکن گاہے گاہے اس میں فرطِ جذبات سے کیف و مستی اس حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کہ یہ زمینی جذبہ ایک سرورِ روحانی بن جاتا ہے۔ اس وجدانی کیفیت کی بہترین مثال مرزا کی ایک فارسی غزل ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
ز چشم و دل بہ تماشا تمتع اندوزیم — ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سرِ راہ پاسباں بگردانیم!

جمالِ ہمنشیں کے خیال سے مست ہو کر شاعر کہتا ہے ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گُل افگنیم و گُلابے بہ رہگذر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
ندیم و مُطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنے کارداں بگردانیم
نہیم شرم بہ یک سُو و باہم آویزیم — بشوخئے کہ رُخِ اختراں بگردانیم!

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب کے نظریۂ محبت کی نسبت لکھتے ہیں:-

"گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک عارضی (ارضی ؟) عورت ہے۔ ان کا عشق ہوس سفلیہ۔ لذاتِ حسیہ سے پاک ہے۔۔۔ ہوس سفلیہ کیا ہے؟ جب روح گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے۔ تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہوس مطلوب کو اپنے پُر شہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں غالب کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ انہوں نے کن اسباب کی بنا پر یہ رائے قائم کر لی۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ یہ رائے مرزا کے شخصی نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ جس خواہش گیرائی کو ڈاکٹر صاحب ہوسِ سفلیہ کہتے ہیں۔ غالب ہرگز اس سے بری نہ تھا۔ غالب نے اپنی جوانی کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ایک شعر ہے ؎

شوقم جریدۂ رقم آرزوئے بوس　　ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار

بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی ہے۔ اس میں اس "خواہش گیرائی" کا اظہار بہت صاف صاف ہے ؎

ز رنگیں جلوہ ہا غارتگرِ ہوش　　بہارِ بستر و نوروز آغوش
بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل　　سراپا مژدۂ آسائشِ دل

جس فارسی غزل میں سے ہم طویل اقتباسات دے چکے ہیں۔ اس میں فقط چشم و دل و جان کی ضیافت کی خواہش نہیں بلکہ "تن" کا بھی پورا خیال رکھا ہے ؎

ز چشم و دلِ بہ تماشا تمتع اندوزیم　　ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم　　گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

اُردو دیوان میں ایک حسرت بھرا شعر ہے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زُلفیں پریشاں ہو گئیں!

اس طرح کے اشعار کئی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری کی رائے کو قبول کرنا مشکل ہے جس ہوسِ گیرائی کی انہوں نے مذمت کی ہے۔ مرزا کے نزدیک وہ جذبۂ محبت کا ایک لازمی جزو تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بعض خیال پرست حضرات جس "خالص حسن پرستی" کے مداح ہیں۔ اور جسے ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے نظریۂ محبت کی خصوصیت خیال کیا ہے۔ وہ غالب کی فہم سے بالاتر (یا فروتر!) تھی۔ یہ مصنوعی جذبہ بالعموم ان شعرا کا خاصہ ہے۔ جو "ترکِ شیرازی" کے فدائی ہیں۔ جو ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں۔ جو نہ خود پی سکتے ہیں۔ نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔" غالب کے فلسفہ محبت میں لاکھ عیب سہی۔ لیکن وہ ترکِ شیرازی کی غلامی سے ضرور آزاد تھا!

غالب "ترکِ شیرازی" پرست نہ تھا۔ لیکن اس کی مستی "شرابِ طہور" کی وجہ سے بھی نہ تھی۔ اور شاید یہ ماننا پڑے کہ اسے محبت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کا موقع نہیں ملا۔ مرزا کے بعض بیانات سے خیال ہوتا ہے۔ کہ انہیں عشق میں ایک رِند سمجھنا چاہئے "عاشقِ صادق" نہیں۔ انہوں نے ایک اردو خط میں لکھا ہے:۔

"ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی۔ کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ اور ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے۔ جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو۔ تو چُنّا جان نہ سہی، مُنّا جان سہی"

محبت میں مرزا کا یہ دستور العمل تھا۔ تو ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ انہیں اس میں روحانی صبر و قرار نہیں ملا۔ محبت ان کے نزدیک ایک دل لگی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ایک ایسی زنجیر نہ تھی۔ جو ایک سے وابستہ کر کے دوسری تمام اُلجھنوں سے نجات دے دیتی ہے۔ بلکہ ایک طوق تھا جس سے وہ پہلی فرصت میں گلو خلاصی کرانا چاہتے تھے یہ کشمکش تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں نوازشِ جاناں کی صورت میں بھی بیقراری رہتی ہے

اسارِ زندانیٔ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں　　خمِ دستِ نوازش بن گیا ہے طوق گردن میں
تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں　　نگاہِ بے حجاب ناز تیغِ تیز عریاں ہے

محبت میں سکون اور قرار اسی صورت میں مل سکتا ہے۔ جب انسان اس جذبہ کو زندگی کی دوسری اہم طاقتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دے اور اپنی ذہنی کشمکش کو مٹا دے۔ مرزا "ہیوکھاؤ مزے اڑاؤ" کے اصول پر عامل تھے۔ اس اصول سے انسان اپنا ذہنی توازن تو شاید برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن محبت کی انتہائی بلندیوں تک اُس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ اصول فلسفۂ عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک شخص جو عقل کے ترازو سے اسے تولتا ہے۔ اسے اس میں نقصان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ مرزا کے کئی اشعار ہیں۔ جن سے مایوسی اور بیدلی ٹپکتی ہے۔ مثلاً

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مرزا عشق کی اہمیت سے واقف ہیں۔ لیکن وہ اسے ایک "برق خانہ ویراں ساز" سے زیادہ نہیں سمجھتے ہے

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ایک اور شعر میں عشق کی نسبت روائتی مشرقی نقطۂ نظر دہرایا ہے ہے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ایک فارسی مثنوی میں انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنے طرزِ محبت پر تنقید کی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو یاد کرکے کہا ہے ۔

گر مئے خورت کہ ازیں پیش بُود　　صرف براندازِ تن خویش بُود

آتش ہنگامہ بجاں داشتی　　داغ مغاں شیوۂ مغاں داشتی

آں ہمہ دیوانگی وجاہلی　　ویں ہمہ ناکامی و بے حاصلی

آں ہمہ بیراہہ روی ہائے تو　　ویں ہمہ بے صرفہ دویہائے تو

آں زجنوں برق بخرمن زدن　　ویں بجمہ دام ہوس تن زدن

مندرجہ بالا اشعار کسی نہایت تلخ لمحے کی یادگار ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ جس تلخی اور سرگرانی کا اظہار ان میں ہے۔ وہ اس نشہ اور شراب خانہ ساز کا لازمی نتیجہ تھیں جنہیں غالب نے محبت کا ماحصل سمجھا۔

محبت کا بلند تر تخیل

ہماری شاعری میں عشق کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور ہم اس تصویر سے اس حد تک نادانستہ طور پر متاثر ہو چکے ہیں) کہ آج عوام کے لئے یہ خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ کہ محبت کی ایک ایسی صورت بھی ہے۔ جس کا جزو غالب حرماں نصیبی۔ یاس۔ دکھ۔ درد۔ مصیبت نہیں۔ محبت ہمارے شاعروں کے نزدیک ایک "مرض" ہے۔ "روگ" ہے۔ غم ہے۔ جنون ہے۔ "زہر" ہے۔ "مرضِ عشق" "غمِ عشق" "سودائے محبت" کی ترکیبیں ہمارے ادب کا ضروری جزو ہوگئی ہیں۔ ہماری سب سے مقبول مثنوی کا نام "زہرِ عشق" ہے۔ غالب

لے ایام جوانی کا عشق و محبت ۔ ۲ے مقدمے کی تگ و دو

نے بھی بالعموم محبت کا یہی رُخ پیش کیا۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ محبت انہی لوگوں کی ہے۔ جن کی نظر ترکِ شیراز" یا "ستم پیشہ ڈومنی" سے پرے نہیں جاتی محبت کی ان دونو صورتوں میں یاس و حرماں، کشمکش اور بے چینی قدرتی اور لازمی ہے۔ پہلی صورت سوائے کشمکش کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی کم قابل اعتراض حالتوں میں بھی یہ ایک شراب ہے۔ جو نہ کوئی خود پی سکتا ہے۔ نہ کسی کو پلا سکتا ہے۔ اس مصنوعی محبت میں سوائے خود فریبی کے اور کچھ نہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جس طرح ایک افیونی افیم کے نشے میں پتہ نہیں کیا کیا معرکے مار لیتا ہے۔ اور کیسے کیسے خوشگوار خواب دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح بعض شعرا نے اپنی خود فریبی کو اس قدر جوش اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ سرابِ خیال ہی محبت کی آخری منزل ہوگیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اس محبت میں روح کی بالیدگی کا کیا سامان ہے۔ اور جب اصولاً یہ محبت فطرت کے بنیادی اصولوں، مذہب اور اخلاق، انسان کی اپنی فلاح و بہبود کے مخالف ہے۔ تو اس میں کشمکش، کرب و بے چینی، مایوسی اور حرماں کے ہزاروں موقع آئیں گے۔ دوسری محبت اس سے بہتر ہے لیکن چونکہ وہ بھی نفسانی خواہشات کی ایک جذباتی صورت ہے۔ قرار و سکون اس میں بھی میسر نہیں۔ بلندی و پستی، مستی اور سرگرانی اس کا لازمی جزو ہے۔ اگر آج شاعر اس سے مست ہو کر کہہ لیتا ہے ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم　　　　دگر ز شاہ رسد ارمغاں بگرد انیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم　　　　دگر خلیل شود میہماں بگردانیم

تو کل اسکا ردِ عمل بھی لازمی ہے۔ اور اسی شاعر کو یہ کیف و مستی، "برق بخرمن زدن" اور "دیوانگی و جاہلی" سے بہتر نظر نہیں آتی۔ غالب کی محبت اسی قسم کی تھی۔ ہم ان معاشرتی اور

شخصی اسباب سے بحث کرنا نہیں چاہتے ۔ جن کے زیرِ اثر محبت کی یہ دو صورتیں ہندستان اور ایران میں مقبول ہو گئیں ۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہو گی ۔ اگر محبت کی اس تصویر سے متاثر ہو کر ہم زندگی کی زیادہ خوشگوار اور بہتر حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں اور محبت کو سوائے "مرض" اور "جنوں" کے کچھ نہ سمجھیں ۔

یاسؔ کا ایک شعر ہے ؎

منزل کی فکر کیا ہے جب تو ہو اور میں ہوں ۔۔۔ پیچھے نہ مڑ کے دیکھئے کعبہ ہی کیوں نہ ہو

یاسؔ نے تو شاید یہ خیال قافیہ کی کشش سے نظم کیا تھا ۔ اقبال نے ایک بلند پایہ نظم میں عشق و محبت کے اس پہلو کی مفصل تصویر کھینچی ہے ؎

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر ۔۔۔ نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گُم نور کا لیکر آنچل ۔۔۔ چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم ۔۔۔ موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

تو جو محفل ہے ، تو ہنگامۂ محفل ہوں میں ۔۔۔ حُسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری ۔۔۔ شامِ غربت ہوں اگر میں ، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے ۔۔۔ تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے

حُسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا !

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار ۔۔۔ مرے بیتاب تخیّل کو دیا تُو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں ۔۔۔ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حُسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال ۔۔۔ تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا !!

محبت کی یہ صورت ہے۔ جس میں کشمکش۔ بے چینی اور یاس و حرماں نہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس میں زندگی کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے لئے تریاق موجود ہے۔ یہ ایک "بادۂ طہور" کا جام ہے۔ جس میں نہ غمِ محتسب" ہے نہ "بیم زوال"۔ اس کے شیریں اور لطیف نشے سے سرشار ہو کر انسان دنیاوی کلفتوں اور ان غموں کو جو ہماری دنیاوی زندگی کا جزو ہیں بھول جاتا ہے۔ جب دو روحوں میں اس طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ دونوں کی سب سے بڑی دلی خواہش ایک دوسرے کو دُکھ اور تکلیف میں "تسلّی" اور "ڈھارس" دینی اور ایک دوسرے کی بہتری اور برتری کی کوشش ہوتی ہے۔ اور جب دونوں کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ اس کے سامنے دُنیا کی کلفتیں اور دُنیا کے عیش بے حقیقت اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔ تو اس محبت سے شیریں تر چیز دُنیا میں کوئی نہیں۔ دولت یا طاقت یا علم یا جسمانی عیاشی وہ سکون اور تسکین نہیں بہم پہنچا سکتے۔ جو اس محبت میں حاصل ہوتا ہے۔ محبت کے اس باغ میں کوئی کانٹا نہیں۔ اس میں کشمکش اور بے چینی اور یاس و حرماں کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ محبت کی یہ صورت حاصل ہی تبھی ہوتی ہے۔ جب اس کا تصادم نہ اخلاق سے ہو نہ مذہب سے۔ نہ انسان کے اپنے خیر و فلاح سے نہ سوسائٹی کے قائم کردہ نظام سے۔ حقیقتاً ایسی محبت کا حصول انسان کی اپنی روحانی اور اخلاقی بلندی کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ حاصل ہو جائے۔ تو پھر یہ حالت ہوتی ہے ؏

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا!

یا

بارضائے تو ز ناسازیٔ ایام چہ بیم ۔۔۔ باوفائے تو ز بے مہریٔ افلاک چہ باک

ظاہر ہے۔ کہ یہ محبت ہر کہ و مہ کو حاصل نہیں ہو جاتی۔ لیکن شعرا سے شاید یہ توقع ضرور

کی جاسکتی ہے۔ کہ محبت کے سرچشمہ کو گندہ کرنے اور عشق کو مرض اور جنوں کی صورت میں پیش کرنے کے بجائے اس کی بہتر اور برتر صورتیں نظر کے سامنے لائیں۔ تاکہ ایک تو زندگی کی صحیح تصویر پیش ہو۔ اور دوسرے ان کا کلام روح کو پستی کے بجائے بلندی کی طرف مائل کرے۔ انگریزی شعرا نے جن کے دماغ پر حقیقی یا خیالی "ترکِ شیراز" یا "سنم پیشہ ڈومنیاں" مسلط نہیں اُس محبت کی جو سراسیمگی اور پژمردگی کے عالم میں بھی جاں پروری کرتی ہے اور رُوح کو پریشانی اور کشمکش سے بچاتی ہے۔ کئی تصویریں کھینچی ہیں۔ سولھویں صدی کے ایک قدیم انگریز شاعر کی ایک نظم ہے:۔

Love--a fulfilment.

Love is life's end (an end but never ending)
All joys, all sweets, all happiness awarding
Love's life wealth (ne'er spent but ever spending),
More rich by giving, taking by discarding;
Love's life's reward, rewarded by rewarding;
Then from thy wretched heart, fond care remove;
Ah, should thou live but once love's sweets to prove,
Thou wilt not love to live unless thou live to love.

زمانۂ حال کی ایک انگریزی نظم میں یہ اظہار شاید اس سے بھی بہتر ہوا ہے:۔

Our love is not a fading, earthly flower;
Its winged seed dropped down from Paradise,

And, nursed by day and night, by sun and shower
Doth momently to fresher beauty rise:
To us the leafless autumn is not bare,
Nor winter's rattling boughs lack lusty green.
Our Summer hearts make Summer's fulness where
No leaf or bud, or blossom may be seen!

غزل گو شعرا کے کلام میں تو ایسی محبت کا جو مرض نہ ہو۔ بلکہ "طبیب جملہ علتہائے ما" ہو نشان ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ لیکن مرشد رومی نے اس محبت کا اور اسکی روح پروری کا بڑے جوش سے ذکر کیا ہے ؎

از محبت تلخہا شیریں شود — از محبت مسہا زریں شود
از محبت دُردہا صافی شود — از محبت دردہا شافی شود
از محبت خارہا گُل میشود — از محبت سرکہا مُل میشود
از محبت دار تختے میشود — از محبت بار بختے میشود!

غالب نے بھی اس محبت کی شاذ ایک آدھ جھلک دیکھی تھی ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

لیکن یہ جھلک پائدار ثابت نہ ہوئی۔ اور عشق ان کے اشعار میں ایک "دردِ لادوا" ہے۔ "درد کی دوا" نہیں!

غالب کا فلسفہ

کیا غالب ایک فلسفی تھا؟

عشقیہ شاعری کے علاوہ ایک دلچسپ مسئلہ غالب کے فلسفہ کے متعلق ہے۔ غالب کے مداح مُصر ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔ اور اگر فلسفہ سے دقیق اور غور طلب خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے۔ تو اس رائے سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے فلسفے سے اس کا انسانی زندگی یا اس کے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطۂ نظر مراد ہے تو آج تک یہ دعوےٰ ثبوت کا محتاج رہا ہے۔ مرزا غالب کو خدا نے نکتہ رس طبیعت عطا کی تھی۔ اور ان کے ابتدائی دور میں بھی غور طلب اشعار کثرت سے ہیں۔ جب اس کے بعد مرزا نے اپنے ذہنِ بیدار کو خیالی طوطا مینا بنانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنی دلی کیفیتیں، حیاتِ انسانی کی کشمکشیں بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔ تو ان کے اشعار میں فلسفیانہ نکات کثرت سے آ گئے۔ لیکن چونکہ مرزا کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہ تھا۔ محض دل پر گزری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مطلوب تھا۔ اس لئے شاعر کی مزاجی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان خیالات کا رنگ بھی بدلتا رہا۔ کبھی ان میں رنج و الم کا بیان زیادہ ہوتا۔ اور کبھی تسلیم و رضا کا۔ کبھی ان میں تشکک کے مضامین کثرت سے آتے۔ اور کبھی شوخی اور تفننِ طبع کے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اس اختلاف کے باوجود ان اشعار میں مرزا کی شخصیت کے خط و خال نمایاں ہیں۔ لیکن یہ شخصیت جامد نہ تھی۔ حالات کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس کا اظہار مختلف وقتوں میں مختلف صورتوں میں ہوا ہے۔ اور ان سے ایک معین فلسفہ ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔

کہ جب تک وہ اقبال کی طرح اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے۔ یا حافظ کی طرح ہمیشہ ایک ہی نشے میں مست نہ رہے۔ اس کے کلام میں چند خیالات کی تکرار کے بجائے مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب کے فلسفے کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس کی تردید کے لئے غالب کے کلام سے بیسیوں اشعار مل جائیں گے۔

غزل کی اس خصوصیت کے علاوہ مرزا کا دل ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں ایک ہی نقش ہمیشہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس میں فطرت کے تمام نقوش باری باری سے نمایاں ہیں۔ ان کا کلام ایک آئینہ ہے۔ جس میں فطرت کے تمام عکس اس طرح نظر آتے ہیں کہ ایک تصویر سے دوسری تصویر مختلف ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ چند نقوش پر پردہ ڈالنے اور ایک آدھ کو زیادہ نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جا سکے۔ جسے خوش فہم حضرات غالب کا فلسفۂ زندگی یا اس کا شاعرانہ پیغام سمجھ لیں لیکن آخر اس کوشش سے فائدہ؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شاعر کوئی خاص پیغام یا معین فلسفۂ زندگی چھوڑ جائے؟ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک شاعر کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کا نچوڑ رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں اُن کے حوالے کر دے۔ تاکہ وہ انہیں دیواروں پر لگائیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے لئے چراغ راہ بنائیں۔ ان خوش نصیب لوگوں کی طبیعتیں سدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح ہیں جنہیں باگ کے اشارے سے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ لیکن عام لوگ اس قدر خوش قسمت نہیں۔ اور نہ ہی انسانی زندگی میں کوئی اہم انقلاب اتنی آسانی سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں۔ بلکہ تخیل کی نشوونما اور تربیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے راز جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں اگر ان کا نچوڑ حقائق اور فلسفے کی

صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک تخیل کی نشوونما اور روح کی تربیت اسی شعوری بلندی تک نہ ہو گئی ہو۔ ایک بلند مرتبہ شاعر جو انسانی فطرت کا بھی صحیح نباض ہوتا ہے۔ اس لطیف نکتے سے بے خبر نہیں۔ کہ انسانی زندگی کے ارتقائی دور میں انسان کے عقائد اور اس کے تخیل میں اکثر ایک خفیف سا تضاد ہوتا ہے۔ اور اگر فلسفۂ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دئے جائیں۔ لیکن اس کی دنیائے تخیل یا نفس غیر شعور اسی طرح رہے۔ تو یہ تضاد اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان بلندیوں تک نہیں پہنچتی۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے بہترین شاعری مفید ہو سکتی ہے۔ وہ ایک شراب خور کو دیکھتا ہے۔ جسے میخواری کے نقائص سمجھا دئے گئے ہیں اور جو اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے۔ کہ شراب خوری بری عادت ہے۔ لیکن اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شراب خور ہی کے خیالات موجزن رہتے ہیں۔ وہ پرہیزگاری کا فلسفہ خوب سمجھتا ہے۔ لیکن اس کی دنیائے تخیل ایک شراب خور کی ہے۔ اب انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس حالت میں شراب خوری کے خلاف جس قدر دلیلیں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ ان سے اس کی باطنی کشمکش میں اضافہ تو ہوگا۔ لیکن جب تک اس کی دنیائے تخیل ہی کو نہ بدلا جائے گا۔ یا زمانے کا سرد گرم چکھنے سے اس کے عقائد اور احساسات میں ایک طرح کا توازن نہ آ جائے گا۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ ایک آدمی فلسفۂ عمل کا بہت معتقد ہو۔ صبح شام اسرارِ خودی اور درسِ حیات کی تلاوت کرتا رہتا ہو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے۔ تو تخیل اس کا ساتھ نہ دے۔ بلکہ اس کی مخالفت کرے اور اس کے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے احساسات اور خیالات پیدا ہوں۔ جن سے عمل غیر ضروری بلکہ مضر معلوم ہو۔ ظاہر ہے۔ کہ

ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفۂ عمل سے ایک ذہنی کشمکش کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور بقول "حکیم الامتؒ" ع

برقے کہ بر خود بپیچد میرد بہ سحاب اندر

ہم یہ تسلیم کرتے کہ ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کا معیار انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دُنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے معین فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور روح کی نشوونما کا ایسا سامان چھوڑا ہے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب دونوں اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن یہ صرف ظاہر بیں ہی کہیں گے۔ کہ انہوں نے انسانی زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی معین فلسفہ دنیا کے لئے یادگار نہیں چھوڑا لیکن انسانی تخیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقا کے لئے ان کا کلام اسی طرح مفید ہے۔ جس طرح ایک عظیم اور بلند مرتبہ شخصیت کا فیضِ صحبت!

ایک بڑا شاعر خود ایک عظیم الشان شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت کا پرتو ناظرین کے دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ اور نہایت لطیف طریقے سے ناظرین کی تخیلی زندگی بھی اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ جو شاعر کے تخیل میں نمایاں

ہوتا ہے ۔ ان کا تخیل شاعر کی دنیائے تخیل سے بہرہ مند ہوتا ہے ۔ اور جس طرح یونانی ٹریجیڈی میں ہیرو کے کارہائے نمایاں دیکھنے اور دنیائے تخیل میں اُسی کی طرح محسوس کرنے سے ہم بھی ایک لطیف طریقے سے ہیرو کی خصوصیات سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اسی طرح ایک شاعر کے مطالعہ سے اس کی شخصیت اور اُس کے تخیل کا رنگ ہم پر چڑھ جاتا ہے ۔ اور اگر یہ مطالعہ مستقل اور گہرا ہو۔ تو یہ اثر بھی دیرپا ہوتا ہے ۔ بالکل اسی طریقے سے کلام غالب کے مطالعہ سے ہم پر غالب کی عظیم شخصیت کا پرتو پڑتا ہے ۔ اور اگرچہ یہ اثر اس طرح واضح اور نمایاں نہیں ۔ جس طرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدلنا ۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تخیل اور روح کی یہ تربیت، عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے ۔ اور شاعری کی یہی نیم پیغمبرانہ خصوصیت ہے ۔ جس کی طرف غالبؔ نے خود اشارہ کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار　　زیک جام اند در بزمِ سخن مست

ولے با بادہ بعضے حریفاں　　خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست!!

حزنیاتِ غالبؔ ہم لکھ چکے ہیں ۔ کہ غالبؔ کو فلسفی ثابت کرنے کے متعلق آج تک جو کوششیں ہوئی ہیں ۔ وہ اکثر ناکام رہی ہیں ۔

لہ یہ ایک لطیف نفسیاتی حقیقت ہے جسے علم نفسیات کے ماہر آج ہم پر ظاہر کر رہے ہیں لیکن قدیم شعرا اور صوفیائے کرام کے کلام میں اس کی طرف کئی اشارے ہیں ۔ مولینا جامی کہتے ہیں ؎

اگر در دلِ تو گل گزرد گل باشی　　ور بلبلِ بیقرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گر روزے چند　　اندیشۂ کل پیش نہی کل باشی

اِن کے علاوہ غالب کی افتادِ طبع اور اس کی شخصیت کے متعلق بھی کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبال کے کلام کی وجہ سے اس وقت رجائی اور قنوطی فلسفوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے۔ اس لئے غالب کے متعلق بھی چند مضامین اِس موضوع پر شائع ہوئے ہیں۔ کہ خواہ غالب کسی خاص سکول کا فلسفی نہ ہو۔ آخر اس کی طبیعت میں رجائی یا قنوطی، کونسا رنگ غالب تھا۔ مولینا نیاز فتح پوری نے ایک طویل مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے "کہ غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ فلسفہ تفاؤل و مسرت تھا" لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و حزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ کلام غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی اور زورِ طبع یا تخیل کی شوخی دکھانے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً ؎

ہفت آسماں بگردش و ما درمیانِ او غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

ہے سبزہ زار ہر درو دیوارِ غم کدہ جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

دانم کہ دوختند زمیں را بہ آسماں آں گونہ دادہ اند مرا درمیاں فشار

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پر جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی حد تک اُس مایوسی اور افسردگی کا ہے، جس کا اظہار انہوں نے خود ایک شعر میں کیا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا اُن بے اندازہ خواہشوں اور ارمانوں سے بھرا ہُوا دل لائے تھے جن کا پورا ہونا بہت مشکل تھا ؎

نامرادم ز رد این افزونیٔ خواہش بہ دہر آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

اس کے علاوہ کئی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ جب ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ اور مایوسی اور بے اطمینانی کا علاج کامیابی اور کامرانی سے نہیں ہوتا تو جس طرح شراب پینے والے خمار اور اعضا شکنی کو دُور کرنے کے لئے اور شراب پی لیتے ہیں اسی طرح وہ بھی اپنی خواہشوں کو اور بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔ بقول غالب ؏

ہر چہ از سرمایہ کاست در ہوس افزودہ ایم

یا

نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں اس قدر بڑھ جائیں۔ تو بے اطمینانی بھی لازمی ہے۔ اور خواہشیں اور آرزوئیں جسقدر زیادہ ہوں گی۔ مایوسی کے مواقع بھی اسی کثرت سے ہونگے ؎

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام مے کشیم دُردِ تہِ پیالۂ اُمید بُودہ است!

یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ اگرچہ مرزا کی زندگی کسی لحاظ سے ناکام نہیں رہی۔ لیکن ان کی قسمت میں مصائب کا حصہ بھی بہت تھا۔ وہ دو برس کے تھے۔ کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ برس کے ہُوئے تو چچا بھی مر گئے۔ اس کے بعد وہ بے شک عیش و عشرت میں پلے۔ لیکن اس چندروزہ عیش و عشرت کا خمیازہ بہت بھگتنا پڑا۔ قرضخواہوں کے پنجے سے انہیں عمر بھر نجات نہ ملی۔ زندگی کے بہترین سال دیوانی مقدمے کی تگ و دو میں گزرے۔

جس کا نتیجہ ناکامی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تیس برس کی عمر میں بھائی کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلنے کی فرصت ملتی۔ تو کوئی اور چرکا لگ جاتا۔ پچاس سال کی عمر میں قمار بازی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کے اُستاد ہوئے تو دو ہی سال میں ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جب مرزا کو ان نامساعد حالات سے سابقہ پڑا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا عنصر غالب ہے۔ لیکن غم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں بہت فرق ہے۔ ایک غم حالی کا ہے۔ جس سے بیتاب ہو کر شاعر اپنے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوسرا غم میر تقی میر کا غم ہے۔ جو ذاتی بے چینی اور باطنی کشمکش کا اظہار ہے۔ اور جس میں حساس اور زود رنج انسان کو غم سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے۔ کہ اسے دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو وہ اور بے چین ہوتا ہے۔ غالب کا غم نہ تو حالی کا غم ہے۔ جس پر دنیا کی سب خوشیاں نثار ہونی چاہئیں۔ اور نہ میر تقی میر ہی کا غم، جو اگر مستقل طور پر رہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے۔ غالب کا غم اس صحت مند آدمی کا حزن و ملال ہے۔ جسے دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہے۔ لیکن جب وہ مسلسل سعی کے باوجود انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ تو غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار میں حزن و افسردگی کی جھلک ہے۔ لیکن غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دُنیا کی مذمت کے باعث نہیں۔ بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ غالب کی انتہائی مایوسی میں بھی ترکِ دنیا۔ رہبانیت یا مردم بیزاری کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ یہ حزن و افسردگی اُس آدمی کی ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ اور جسے اس سے محروم رہنا ناگوار ہے۔ وہ خود ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

شاہا اگر ز درد نہ نالم بدیں نمط　　اندوہ چگونہ از دلِ مضطر برآورم
نے چارۂ آنکہ ز سرِ راحت تواں گذشت　　نے جائے آنکہ خار ز بستر برآورم!

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اگرچہ اشعار میں جو اُن کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ مایوسی اور بے اطمینانی صاف ٹپک پڑتی[1] ہے۔ لیکن عملی زندگی میں انہوں نے غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور میر تقی میر کی طرح پژمردگی اور غم کو خوش طبعی اور زندہ دلی پر غالب نہیں آنے دیا ؎

پیرم مگر بہ طبعِ جواناں گراں نیم
خوں خوردنم نہفتہ و مے خوردن آشکار

عرفانیاتِ غالب

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے۔ اور اسے نہیں پاتا۔ تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے۔ خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے۔ لیکن زندگی میں مسلسل اضطراب اور بے چینی نبھ نہیں سکتی۔ عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پر ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے۔ مرزا کی غم زدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا

---

[1] مرزا اپنے "آسودہ دل" نقادوں سے کہتے ہیں ؎

آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغانم　　دانند کہ من مردِ نیم رنج و المم را
غافل کہ ہم از ہولِ نگونساریِ بخت است　　فریادگر از لب جہد اربابِ ہمم را
غم خستہ درونِ من و خونابۂ آں زخم　　برچشم رہا داشت بروں دادنِ نم را
در سرمہ خرد خفتہ گدایانہ خروشیست　　پیش آمدہ در زیرِ سیہی حرفِ و رقم را

تھا۔ لیکن رسمی طور پر قسمت کو ملزم قرار دے کر نہیں۔ بلکہ اس نگاہِ ژرف بیں کی مدد سے جو انکی اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اُس سے پنہاں نہ تھیں انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا۔ اور ان سے کوئی محفوظ نہیں۔ تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار میں اس خیال کا اظہار ہے ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر　　حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کئے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

علاوہ ازیں مرزا نے زندگی کے انقلاب دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اگر خوشی محدود اور قلیل الفرصت ہے۔ تو غم بھی غیر محدود یا غیر فانی نہیں ؎

بیا کہ نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال　　بیا کہ نیست دوامے بدیں بیاض و سواد

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یکدگر اند　　روزِ روشن بہ وداعِ شبِ تار آمد و رفت

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند　　ہم خزاں ہم بہار در گزر است

اس کے علاوہ انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی باگ بہت ڈھیلی نہیں چھوڑی جا سکتی ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب   واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جب ان کے عزیز شاگرد دہر گوپال تفتہ ترک دُنیا پر آمادہ ہوئے تو مرزا نے ایک خط لکھا جس میں انسانی فطرت کی ان مجبوریوں کا ذکر کر کے اُن کو نہایت صائب مشورہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"کیوں ترکِ لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے۔ جس کو اُتار کر پھینکو گے۔ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائیگی۔ بغیر کھائے پیئے گذارا نہ ہوگا۔ سختی و سُستی و رنج و آرام کو ہموار کر دو جس طرح ہو۔ اُسی صورت بہر صورت گذرنے دو۔"

یک اور خط میں انہوں نے خود اس عملی رواقیت (stoicism) کی مثال قائم کی ہے مرزا تفتہ کو لکھا ہے :-

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مُردہ ہوں نہ زندہ۔ جیئے جاتا ہوں۔ باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ پیئے جاتا ہوں۔ جب موت آئیگی۔ مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت۔"

اس طرح کے اندراجات مرزا کے اردو خطوط میں کثرت سے ہیں۔ ان خطوط کا اکثر حصہ غدر کے بعد لکھا گیا۔ اور ان میں وہ مصائب جو مرزا یا ان کے عزیز دوستوں اور عام طور پر اہلِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ بیان ہوئی ہیں لیکن قاعدہ ہے سے

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان خطوط میں غم و الم کا بیان ہونے کے باوجود، سکون و صبر اور رضا و تسلیم کا اظہار کثرت سے ہے۔ بلکہ اگر غالب کے ان خطوط کا ان اشعار سے مقابلہ کریں۔ جو مرزا نے سفرِ کلکتہ کے

دوران میں لکھے۔ تو وہ عارفانہ رنگ جو مرزا پر دورِ آخریں غالب آگیا تھا۔ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک مضمون میں مرزا کی اُردو شاعری کے متعلق لکھا تھا۔

"لیکن ان کے کلام کی اصلی خوبیاں اور محاسن ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے ..... غالب مغلیہ سلطنت اور اسکے آئین کی مکمل تباہی سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور اسی تاثر نے ان کی شاعری پر دلگدازی اور رقت کا وہ رنگ چڑھا دیا۔ جو اس میں جدت و طلاقت پیدا کر دیتا ہے[۱]"۔

ہمیں معلوم نہیں۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا کے کس اُردو کلام کی نسبت یہ رائے قائم کی ہے۔ کیونکہ غدر کے بعد مرزا نے معدودے چند اُردو غزلیں لکھی ہیں۔ اور ان میں "دلگدازی اور رقت" کے بجائے شوخی اور تفنن طبع کا رنگ زیادہ نمایاں ہے ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ میں ملا لیں یارب　　سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ　　ہیں ہوس پیشہ بہت' وہ نہ ہوا' اور سہی
حُسن میں حُور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی　　آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

اُردوئے معلےٰ میں فقط ایک اُردو قطعہ ایسا ہے۔ جو اس زمانے میں لکھا گیا جب مارشل لا کی پابندیاں ابھی قائم تھیں۔ اور مرزا نے اس قطعہ اور ایک اُردو شعر میں ان پابندیوں کا تذکرہ رنج وافسوس سے کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ نو دس اشعار کی بنا پر جو ایک خاص واقعہ کے متعلق ہوں۔ ایک دور کی عام شاعری کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ غدر اور مابعد الغدر کی مصیبتوں سے مرزا پہ جو رنگ غالب آیا۔ وہ بے قراری اور بے چینی کا نہ تھا۔ بلکہ سکون و قرار کا تھا۔ مرزا نے "قلزمِ خوں میں شناوری" کی تھی قیامتِ حقیقی

---

[۱] سالنامہ کارواں لاہور ۱۹۳۴ء صہ ۳۵

تو خیر کس نے دیکھی ہے۔ لیکن مرزا نے اپنی آنکھوں سے دہلی کا سارا انظام روزِ حشر کی طرح نہ و بالا ہوتے دیکھا تھا۔ اور ان مصیبتوں سے دوچار ہوئے تھے۔ جنہیں قیامتِ صُغریٰ کہنا کسی طرح مُبالغہ نہیں۔ مرزا کے خطوط میں ان مصائب کی بڑی بڑی پُر اثر۔ رُوداد "بہ طریقِ حکائت" درج ہے۔ اور وہ ان سے بڑے متاثر ہُوئے۔ لیکن بالآخر ان کی حکیمانہ طبیعت ان کے غم و الم پر غالب آئی۔ انہوں نے زندگی کی تیرہ و تار حقیقتوں کو عریاں دیکھا تھا لیکن اب وہ ان سے بے قرار نہ ہوتے۔ اور ایک راضی برضا عارف کی طرح نیرنگیٔ قدرت کا تماشا دیکھتے

لے لکنت در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و رُوئے دریا آتش است

تفتہ کے نام انہوں نے جو تسلی و تسکین کے خطوط لکھے ہیں۔ وہ ان کے اس زمانے کے خیالات کا آئینہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی کئی خطوط ہیں۔ جن میں تسلیم و رضا کا سبق ملتا ہے۔ ایک خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں :۔

"پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ بھی ہُوا چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے۔ اُس کا گِلہ کیا ہے

چُوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور است،   بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

یہ تحریر بطریقِ حکایت ہے۔ نہ بہ سبیلِ شکایت"

ایک اور خط میں منشی بدرالدین کو مشورہ دیتے ہیں "قضا و قدر پہ چھوڑو۔ نیرنگیٔ قدرت کے تماشائی رہو" اسی اصول پر مرزا کا اپنا عمل تھا۔ غدر کے بعد جو حالات بدل گئے تھے۔ ان کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں " نہ وہ حکام ہیں۔ جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ محکمہ ہے۔ جس سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں۔ جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے

ایک کونے میں بیٹھا ہُوا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں"۔ میر مہدی حسین مجروح نے انہیں کسی خط میں صبر و تسلیم کا مشورہ دیا تھا۔ مرزا کو یہ مشورہ بُرا معلوم ہُوا۔ کیونکہ وہ اپنے تئیں شیوۂ تسلیم و رضا کا بہترین ترجمان سمجھتے تھے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:۔

"میری جان! تو کیا کہہ رہا ہے۔ بنئے سے سیانا' سودیوانا۔ صبر و تسلیم' توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون سمجھے گا' جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟"

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے۔ "چپکے ہو رہو۔ اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین و مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے عمل میں آتا ہے"۔ ایک خط میں نواب ضیاء الدین کے صاحبزادے' مرزا شہاب الدین احمد خان کو لکھتے ہیں (فروری ۱۸۵۸ء) "صبر کرو۔ اور چُپ ہو رہو!

بردل نفسِ اندوہ گیتی بسر آرید گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد"

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ایک غزل گو شاعر کے کلام میں اس کا پیغام اسی طرح ساری و پریشاں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک پھول کے نواح میں اس کی خوشبو۔ اس کی تعیین بہت مشکل ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی زندگی کے متعلق مرزا کے نقطۂ نظر کا بہترین اظہار شاید اُن فارسی اشعار میں ہے۔ جنہیں ہم نے "زندگی" کے عنوان سے منتخب کیا ہے ؎

تو نالی از خلۂ خار و تنگری کہ سپہر سرِ حسینِ علیؑ بر سناں بگرداند
برو بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند!

مرزا غالب کا مذہب

ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا کا مذہب ہے۔ ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہیں مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی ہے۔ مہرِ نیمروز (جس کے شروع میں ابتدائے آفرینش وغیرہ کے متعلق ہندو عقائد کا خلاصہ درج ہے) اور بعض اشعار (مثلاً "تحفۂ دیر") سے ہندو مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی جو غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ شائد اس زمانے میں بھی بہت کم مسلمانوں کو ہو گی۔ "دبستانِ مذاہب" اکثر انکے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے اُن کی ذاتی واقفیت تھی۔ ممکن ہے۔ کہ مذاہبِ عالم سے مرزا کی یہ دلچسپی ہرمزد کی تعلیم کا اثر ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہیں یہ دلچسپی ضرور تھی۔ اور اس مسئلے کے متعلق ان کے کئی نہایت پاکیزہ اشعار ہیں۔ جو رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

بامن میا دیز اے پدر فرزند آزر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم کہ با من وسعتِ بتخانہ ہائے ہند و چیں گوید

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را باشد کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

اس کے علاوہ جزدی عقائد سے قطع نظر عام مذہب کے متعلق مرزا کا نقطۂ نظر

بہت دلچسپ ہے۔ مشرقی شعرا بالعموم مذہب کے معاملے میں آزاد خیال رہے ہیں۔ اور دارالافتا کی تنگ نظری اور سختی کی تلافی حافظ۔ عمر خیامؔ اور فیضیؔ کی روشن خیالی اور وسیع مشربی سے ہوتی رہی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ مرزا بھی مذہب کے معاملے میں بے حد آزاد خیال تھے۔ لیکن انتہائی آزاد خیالی کے باوجود اُن میں ابو نواس اور سرمد کی بے قاعدگی نہ تھی۔ وہ انسان کی ذہنی اور روحانی نشوونما پر کسی طرح کی پابندیاں عائد کرنا ناپسند نہ کرتے تھے۔ لیکن وہ اس لطیف نکتے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ کہ یہ نشوونما بہترین طور پر اسی صُورت میں ہو سکتی ہے جب کسی نظام اور آئین کے ماتحت ہو۔ مثلاً عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ شریعت اور طریقت کے راستے جدا جدا ہیں۔ لیکن مرزا جانتے تھے۔ کہ حقیقتاً ان دونوں میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ طریقت کا تعلق انسان کے تزکیہ نفس اور اس کی ذاتی روحانی تربیت سے ہوتا ہے۔ اور شرع اس کے افعال کو اجتماعی یعنی سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اور انسان کی پوری نشوونما کے لئے شخصی اور اجتماعی دونوں پہلو بہت اہم ہیں۔ چنانچہ مرزا خود طریقت سے قریب نہ ہونے کے باوجود شریعت کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک قصیدے میں رسولِ اکرمؐ کی تعریف میں لکھا ہے ع

خرد بسایۂ شرعت ز فتنہ زنہاری

وہ طبعاً ہمسفر اور رہنما سے آزاد ہو کر آزادانہ تلاشِ حق کے قائل تھے۔ لیکن جانتے تھے۔ کہ "راہ و رسمِ منزلہا" سے واقفیت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے ؎

عناں گسیختہ براہِ تاختن تا چند
بہ شرع پیچم و گردم بیوۂ ہنجاری

ایک اور پُر معنی شعر ہے ؎

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر   وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشم پُر نم ہے

"شرع" اور "حق" کے تعلق کو مرزا نے ایک فارسی شعر میں نہایت لطیف پیرائے میں نظم کیا ہے ؎

بشرع آویزو حق میجوز مجنوں کم تہ بارے   کہ دل با محمل است آما نہ باں باسار باں دارد

اسی طرح صوفیہ کرام میں ایک مصرع مشہور ہے ع

با خدا دیوانہ با مصطفےٰ ہشیار باش!

یعنی خالق اور مخلوق کا تعلق تو انسان کے اپنے متعلق ہے۔ لیکن نبی کریمؐ ایک جماعت کے سردار ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس جماعت کے اصول و آئین ملحوظ رہنے چاہیئں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مرزا نے اس اصول سے سرِ مُو تجاوز نہیں کیا۔ خدا کا ذکر انہوں نے اپنی نظموں میں جس آزادی اور بے باکی سے کیا ہے۔ اس کی مثال ہندوستانی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن پیغمبر صلعم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔[1] اور اگرچہ خدا کے متعلق ان کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جنہیں دارالافتا میں کفر کے کلمات سمجھا جائیگا لیکن جہاں کہیں انہوں نے رسولِ اکرمؐ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا ہے۔ مرزا کی اس "پابند آزادی" یعنی آزاد خیالی اور حفظِ مراتب کی ایک دلچسپ مثال

---

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال اُن کا نہ لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ جو انہوں نے سراج المعرفت کے شروع میں لکھا اور جس میں انہوں نے شیخ ابن العربی کے غیر شرعی مقولہ "الولایت افضل من النبوت" کی اس طرح تاویل کی ہے۔ کہ اس سے کسی بے ادبی کا اظہار نہیں ہوتا۔

مختلف مذاہب کے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں ۔ یادگار غالب اور مرزا کے اپنے بیان سے ان کے ہندو اور عیسائی دوستوں سے جو مخلصانہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ تو اس قابل ہیں کہ روشن خیالی کے اس زمانے میں ہم انہیں چراغ راہ بنائیں لیکن ان کے باوجود مرزا "ضبط و آداب رسوم" سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور جماعت بندی کا بھی خیال رکھتے تھے ۔ وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"بندہ پرور، میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ۔ دوسرا مانے یا نہ مانے ۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں ۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے ۔ اور اس کے مراتب مدارج ہیں ۔"

مرزا شرع کی قدر و اہمیت سمجھتے تھے ۔ لیکن مذاہب کے جزوی اختلاف اور فقہ کی پیچیدگیوں اور بے ضرورت پابندیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ آجکل لوگ قانون کی موشگافیوں سے خوب واقف ہیں لیکن فقہ کی باریکیاں کچھ اس سے بڑھ کر ہوتی ہیں ۔ قرون وسطیٰ میں عیسائی مفکروں کے نزدیک فرشتوں کا حجم ایک اہم مسئلہ تھا ۔ اور ان کے درمیان اکثر اس سوال پر بحثیں ہوتی تھیں کہ ایک تلوار کی نوک پر بیک وقت کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن مرزا کی سلیم الطبعی کو یہ خیالی قلابازیاں پسند نہ تھیں ۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مروجہ تعلیم فقہ اور "مسائل ابو حنیفہ" کے خلاف بہت جلے کٹے فقرے لکھے ہیں ۔ ان کے خیال میں انسان کو چاہیئے کہ مذہب کی اصولی باتوں کو سمجھ لے اور ان پر ایمان رکھے ۔ فقہ اور مذہب کی جزوی باتوں میں وقت ضائع کرنا بے فائدہ ہے ۔ یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف ہونا چاہیئے ۔ میر مہدی کے نام ایک خط لکھا ہے ۔ جس میں میر سرفراز حسین کو تلقین کرتے ہیں :-

"میاں کس قصے میں پھنسا ہے ۔ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا ۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق

و فلسفہ پڑھ۔ جو آدمی بن چکا ہے۔ خدا کی بو۔ نبی اور نبی کے بعد امام۔ یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔"

انہوں نے ایک دو مذہبی بحثوں میں حصہ لیا لیکن ان میں بھی جزوی اختلافات اور فقہی موشگافیوں کو ناپسند کیا۔ چنانچہ خدا کے علاوہ کسی اور کو مخاطب کرنے کے متعلق مقلدوں اور غیر مقلدوں میں جو مشہور اختلاف ہے۔ مرزا اس کو بھی غیر ضروری اور جنگ ہی سمجھتے تھے ؎

ابلہاں را زانکہ دانش نارسا است
گفتگوہا بر سرِ حرفِ ندا است

ایک اور شعر میں شیعہ سنی اختلافات کی نسبت کہا ہے ؎

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں — کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

عقیدۃً مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ وہ وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء کے "بدل معتقد اور بزبان معترف تھے"۔ لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا ان کے بدن پر پوری طرح چسپاں نہ تھی ؎

ہنوز دین نشناسم درست و معذورم — نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

تمام مغلوں میں ایک طرح کی "بیگن ازم" پائی جاتی ہے۔ وہ بیشتر "عیشِ امروز" کے قائل ہوتے ہیں۔ اور "روزِ فردا" کا فکر انہیں اس طرح مضطرب نہیں رکھتا جس طرح سامی نسل کے لوگوں کو۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اور "عیشِ امروز" کے وہ بھی اسی طرح قائل تھے۔ جس طرح بابر یا جہانگیر اور جس طرح مغلیہ سلطنت کے بانی نے کہا تھا۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی طرح مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔ مثنوی ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا رُباعی جہاں کہیں انہوں نے بہشت کا ذکر کیا ہے، ہمیشہ شوخی بلکہ تمسخر ہی سے کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح دَورِ عباسیہ کے کئی مُسلمان حکما یا سر سید احمد خاں نعیم جسمانی کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح مرزا کی رائے بھی اِس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی +

غالبؔ اور مشاہیرِ اُردو شُعرا کا مُقابلہ

شعرا کا باہمی موازنہ کرنا اُردو تبصرہ نگاروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ عُموماً اس مقصد کے لئے شعرائے ہمعصر کی ہم طرح غزلوں یا متحد المضامین اشعار کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور ان کی بنا پر کسی ایک شاعر کی فوقیت ثابت کی جاتی ہے۔ اُردو میں یہ طریقِ تنقید بہت پُرانا ہے اور حالیؔ اور شبلیؔ نے اسے کثرت سے اختیار کیا۔ لیکن فی الواقع اس طریقے سے صحیح طور پر شاعرانہ فوقیت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اس طرح شاعر کی خاص ذاتی خصوصیتوں پر، جنہیں نمایاں کرنا تبصرہ نگار کا اصل کام ہے۔ کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ نہ ہی بہ حیثیت مجموعی اُس کا کلام پرکھا جاتا ہے۔ بلکہ ایک غزل یا چند اشعار کی بنا پر اس کی تمام شاعری کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو کبھی اتفاق سے صحیح ہو تو ہو۔ لیکن عام طور پر اس کے صحیح ہونے کا بہت کم امکان ہے +

اس طرزِ تنقید کی ایک دلچسپ مثال مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی کے وہ مضامین ہیں۔ جن میں انھوں نے غالبؔ اور میرؔ کی ہم طرح غزلوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور ان کی بنا پر

میر کی برتری ثابت کی ہے۔ ان مضامین میں تبصرہ نگار نے جن غزلوں کی بنا پر رائے قائم کی ہے۔ ان میں میر کا پلّہ ضرور غالب سے بھاری رہا ہے۔ لیکن ان غزلوں کی بنا پر غالب کے عام رتبۂ شاعری کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ میر کی جن غزلوں پر غالب نے غزلیں لکھیں۔ وہ میر کی بہترین غزلیں تھیں اور غالب کی اپنی غزلیں ایام طفلی کی مشق کا نمونہ ہیں۔ اور شاعر کے اس کلام کا جزو ہیں۔ جسے اُس نے اشاعت کے قابل نہ سمجھا۔ اور منتخب دیوان مرتب کرتے وقت نظر انداز کر دیا۔ اب اگر ان ہم طرح غزلوں کی بنا پر میر اور غالب کی تمام شاعری کی نسبت فیصلہ کیا جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کو حقیقت اور واقعات سے کوئی تعلق نہ ہوگا؀

دو شاعروں کا صحیح طور پر مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ان کی اہم خصوصیات بیان کی جائیں اور ان خصوصیات کی خوبیاں اور کوتاہیاں واضح کر کے ان سے شعرا کے ادبی مدارج کا اندازہ لگایا جائے۔ غالب کے کلام کا اگر اس نقطۂ نظر سے میر اور دوسرے اُردو شعرا کے کلام سے مقابلہ کیا جائے۔ تو نہ صرف اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ دوسرے شعرا کی خوبیاں اور خامیاں بھی ذہن نشین ہوتی ہیں؀

میر اور غالب

جہاں تک میر کا تعلق ہے، مرزا نے دو اشعار میں ان کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پہلا شعر اس زمانے کا ہے جب میر سے عقیدت انتہا پر تھی ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

دُوسرا شعر اس سے پچیس[۲۵] تیس[۳۰] برس بعد کا ہے۔ اور اس میں شاعرانہ تعلّی اور شوخی نے رنگِ عقیدت پر بہت سے دبیز پردے ڈال دئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا اُس

زمانے میں میرؔ کو اپنا مدِ مقابل بھی نہ سمجھتے تھے ؎

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے متعلق مرزا کی رائے خواہ کیا ہو۔ (اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اُنہوں نے میرؔ سے زیادہ کسی اُردو شاعر کی تعریف نہیں کی) لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ ایک بڑا بلند پایہ شاعر اور اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی ادبی روایات کا کامیاب ترجمان تھا۔ میرؔ نے شعر گوئی اس زمانے میں شروع کی۔ جب ابھی اردو میں بھاشا کا عنصر غالب تھا۔ اور ناسخ کے زیرِ اثر زبان میں فارسیت اور تصنع کا بہت دخل نہ ہوا تھا۔ میرؔ جن خیالات اور جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے لئے یہ زبان خاص طور پر موزوں تھی۔ اس کے علاوہ میرؔ کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ وہ اس دورِ انحطاط میں عام تھا۔ اس لئے میرؔ کے شعروں کو فوری مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن میرؔ کی یہ شہرت عارضی نہ تھی۔ میرؔ کی شاعری میں کئی ایسے عنصر ہیں۔ جن کی وجہ سے جب تک اردو زبان باقی ہے، میرؔ کا کلام پڑھا اور پسند کیا جائیگا۔

میرؔ کی شاعری

میرؔ کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ان کا سہلِ ممتنع طرزِ اظہار ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف شُستہ اور درحقیقت اُس زمانے کے طبقۂ شرفا کی عام بول چال کی زبان ہے۔ جس قدر سلیس اور پاکیزہ زبان میں انہوں نے شعر گوئی کی ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے سوا شاید ہی کسی غزل گو شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ ایسی سیدھی سیدھی ترکیبیں ہیں۔ کہ نثر اور نظم میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مقبولِ خاص و عام ہے۔ اور ان کے کئی اشعار ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً ؎

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

شرطِ سلیقہ ہے ہر اِک امر میں　　عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

سمندِ ناز پہ اِک اور تازیانہ ہُوا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا

جس طرح ان کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ اِسی طرح تشبیہیں سادہ و زود فہم ہیں ست

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اُسکی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میرؔ اِن نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی ان لبوں کی کیا کہیئے　　پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

شام ہی سے بُجھا سا رہتا ہے　　دل ہے گویا چراغ مفلس کا

میرؔ کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب تو زبان اور بیان کی دلآویزی پاکیزگی ہے لیکن شاید اس سے بھی زیادہ جس چیز نے اُن کے کلام کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا۔ وہ ان کی خلوص ہے۔ ان کی شاعری واردات قلب کا بیان ہے۔ کسی نقّاش طرز شاعری کا چربہ نہیں، ان کے اشعار دل سے نکلے ہیں۔ اس لئے دل میں اثر کرتے ہیں۔ ہم ذکر میر اور آب حیات کے ذریعے میرؔ کی ذاتی زندگی سے پوری طرح آشنا ہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ

کُلیاتِ میرؔ شاعر کی خود نوشت منظوم سوانح حیات نہیں؟؟

میرؔ کو فطرت سے ایک حسّاس دل ملا تھا۔ اور حسّاس انسانوں کے لئے دنیا ایک جائے امتحان ہے۔ میرؔ کو بھی رنج و مایوسی اور سوز و گداز کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ان کا

کلام اسی سوز و گداز، رنج و مایوسی کی صحیح تصویر ہے ؎

مَیں کون ہوں اے ہمنفساں ؟ سوختہ جاں ہوں
اِک آگ مرے دِل میں ہے، جو شعلہ فشاں ہوں

ہُوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اِس باغِ خزاں دِیدہ میں مَیں برگِ خزاں ہُوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دِل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو! اس وقت خُدا جانے کہاں ہُوں

اور ؎

میؔر دریا ہے، سُنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھُوٹ بہی
دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی

مرثیئے دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو
شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

میؔر کے اشعار اُن کے دل کے مرثیئے ہیں۔ ان میں وہی سوز اور درد ہے۔ جو شاعر کے اپنے دل کی گہرائیوں میں تھا۔ اور چونکہ یہ اشعار سُنی سُنائی باتوں کا اظہار نہیں۔ قلبی واردات کا بیان ہیں۔ پڑھنے والے کے دل پر بھی وہ گہرا اثر کرتے ہیں ؎

اِک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے۔ کچھ درد سا دل میں ہوتا ہے
مَیں راتوں کو رویا کرتا ہُوں جب سارا عالم سوتا ہے

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیمارئ دِل نے آخر کام تمام کیا

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

جہاں تک غالب اور میر کا تعلق ہے۔ اگر پاکیزگیٔ زبان اور سوز و گداز کو کمالِ شاعری سمجھا جائے۔ تو میر کو غالب پر ضرور فوقیت ہے۔ غالب کی زبان میں وہ صفائی نہیں جو میر کی غزلوں میں ہے۔ اور جو سوز و گداز میر کے اشعار میں عام ہے۔ وہ بھی غالب کو میسر نہیں۔ ان دونوں باتوں میں میر کا مرتبہ غالب سے بالا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ان دونوں کی شاعری کے دوسرے اہم پہلو بھی ہیں۔ جنہیں مدِنظر رکھنے سے غالب کی عظمت اور فوقیت ذہن نشین ہوتی ہے؂

میر کے کلام میں ایک بڑا عیب یہ ہے۔ کہ یہ بدرجۂ غایت ناہموار ہے۔ میر کے جو اشعار اچھے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن پست اور کم مایہ اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ غالب بڑی حد تک اس نقص سے بری ہے۔ سوائے ان اشعار کے جو اس نے بیس بائیس برس کی عمر تک لکھے اور جن میں ایک خاص طرزِ شاعری کی پیروی تھی، اس کے بیشتر اشعار ہموار اور بلند پایہ ہیں؂

زندگی میر اور غالب کی نظروں میں

میر کی شاعری میں دوسرا نقص یہ ہے۔ کہ زندگی کی جو تصویر انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کی۔ وہ بڑی تاریک اور یکطرفہ ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جو کچھ انہیں پیش آیا۔ اُسے انہوں نے اپنے تخیل اور زورِ کلام سے چمکا کر نظم کر دیا۔ لیکن ان کے حالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بدقسمتی سے فقط زندگی کا تاریک پہلو ہی دیکھنا نصیب ہوا۔ اور انہوں نے اس تاریک پہلو کو ہی زندگی کی مکمل تصویر سمجھ لیا!

یہ صحیح ہے۔ کہ میر کی زندگی غموں اور دکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن غم والم انسان کی ہمت اور شخصی عظمت کا امتحان بھی ہوتے ہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ انسان ان غموں کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ غم والم دوسرے انسانوں اور دوسرے شعرا کے حصّے میں بھی آئے۔ لیکن وہ بالعموم غم کی تندی کم کرنے کے ذریعے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بعضوں کو مذہب تمام کرب و بےچینی سے نجات دے دیتا ہے۔ حافظ اور خیام نے ایک فلسفۂ زندگی کی مدد سے تسکینِ قلب کا سامان بہم پہنچایا۔ اقبال تو خیر ایک ایسے عالم میں رہتے ہیں۔ جہاں غموں کا گزر ہی مشکل سے ہوتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کی زندگی میں مایوسیوں اور ناکامیوں کو بہت دخل تھا۔ اور ان کا اظہار ان کے اشعار میں بھی پوری طرح ہوا ہے۔ لیکن ان کی بلند ہمتی نے غم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ زندگی میں انہوں نے سکون کچھ تو اس شوخ طبعی اور حکیمانہ ظرافت کی مدد سے حاصل کیا۔ جو غم یا کسی دوسرے جذبے کو مناسب حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اور کچھ اس فلسفیانہ بالغ نظری سے، جس کے سامنے نہ صرف ان کی اپنی، بلکہ تمام انسانوں کی مایوسیاں اور کوتاہیاں بے نقاب تھیں۔ اس کے علاوہ وہ حسنِ محض کے شیدائی تھے۔ اور جب وہ اس کے نشے سے پوری طرح سرشار ہوتے۔ تو ان پہ ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی۔ جس میں اپنی ناکامیوں یا دنیا کے رنگ و بو کی کوتاہیوں کا خیال نہ آتا۔ ایک ایسے ہی لمحے کا بیان ہے ؎

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے　　روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے!
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے!

ایک فارسی شعر ہے ؎

منال از غم و ساز عیش کن کز بادِ نوروزی　　بہ گلشن جلوۂ رنگینیٔ عہدِ شباب استے

گدوں کی رنگینی کے علاوہ شراب و شاہد سے مرزا کو جو محبت تھی۔ اس کے زیرِ اثر انہیں یہ جہان جنت کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے

جہاں از بادہ و شاہد بداں ماند کہ پنداری   بدیں ابلیس آدم فرستادند مجبورا

میر کے اشعار سے بالعموم یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے غم کا مقابلہ کرنے یا زندگی کے تاریک پہلو کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو دیکھنے کی بھی کوئی کوشش کی ہو۔ بعض اشعار سے تو خیال ہوتا ہے۔ کہ انہیں غم سے اس قدر محبت ہو گئی تھی۔ کہ غم و حزن میں مبتلا رہنے اور جلنے کڑھنے سے ان کی ایک طرح کی تسکین ہوتی تھی۔ اس طرح کے تو شعر ہیں جن میں اپنی آہ و زاری پر فخر کیا ہے ؎

اور محزوں بھی ہم سنے تھے ولے   میر صاحب و سکے ہے کب کوئی

ہمیشہ رونا کڑھنا سینہ کوبی ہر زماں کرنا   مرو افسانہ کیا دل کے مرے ماتم نے دنیا کو

جب نالہ کش ہوا وہ تب مخفیں رلائیں   تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

جو اس شور سے میر روتا رہیگا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں   جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

مندرجہ بالا اشعار نہ صرف ایک سقیم (MORBID) ذہنی حالت کا اظہار ہیں۔ بلکہ فنی نقطۂ نظر سے بھی ان میں کوئی خوبی نہیں۔ غالب کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کے اشعار میں غم و حزن کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ لیکن اس غم و حزن کے اظہار میں بھی ایک طرح کا وقار اور ضبط ہے۔ اس کے علاوہ غالب اور میر کے غم میں ایک دوسرا نمایاں فرق بھی ہے۔ میر کی گریہ وزاری کا باعث اس کی ذاتی مصائب اور نامساعد حالات ہیں۔ غالب کے غم و حزن

ہیں بھی اس کی شخصی مایوسیوں کو دخل ہے۔ لیکن اسکے بہترین اشعار وہ ہیں۔ جن میں وہ اپنی ناکامیوں سے گزر کر نوعِ انسان کی فطری اور بنیادی کوتاہیوں پر آنسو بہاتا ہے ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند   کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے راہنما کرے کوئی

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

گر منافق وصل ناخوش ور موافق ہجر تلخ   دیدہ داغم کز دروئے دوستاں دیدن نداشت!

مندرجہ بالا اشعار غالب کی اُس خصوصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جو اسے میر بلکہ اقبال کے سوا دوسرے تمام اُردو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ عام غزل گو شعرا خیال آفرینی اور تلاشِ مضامین میں اس طرح محو رہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اشعار کو اپنی باطنی کیفیتوں کا آئینہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ لیکن جو شعرا میر کی طرح اس نقص سے بری ہیں۔ اور جن کے اشعار وارداتِ قلب کا بیان ہیں۔ ان کی نظر بھی انسانی زندگی کی ان بنیادی الجھنوں اور پیچیدگیوں پر نہیں جاتی۔ جن کا سامنا کم و بیش ہر ذکی الحس انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ اس بارے میں غالب تمام قدیم اُردو شعرا سے ممتاز ہے۔ اس کے اشعار میں فقط اس کی ذاتی مصائب اور الجھنوں کا ہی ذکر نہیں بلکہ ان الجھنوں کو حل کرنے کی کوشش میں وہ انسانی فطرت کے ان پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ جو دوامی اور عام ہیں۔ اور جن کے بیان نے اس کے کلام کی وقعت اور اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ اس قبیل کے زیادہ اشعار مرزا کے فارسی کلام میں ملیں گے لیکن اُردو میں بھی ان کی تعداد کم نہیں۔ اور طبقۂ خواص میں دیوانِ غالب کی غیر معمولی

مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہی اشعار ہیں۔

سوداؔ اور غالبؔ

غالبؔ اور میرؔ کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اگرچہ دونوں کی زندگی اور کلام میں غم کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن دونوں کی شخصیت اور طبیعت میں بڑا فرق تھا۔ شخصی رجحانات کے نقطۂ نظر سے مرزا غالب میرؔ کی نسبت سوداؔ سے زیادہ مشابہ تھے۔ سوداؔ کے کلام پر آج کل اس کی صحیح شاعرانہ عظمت کے لحاظ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ لیکن ایک زمانے میں اُسے بعض اہل الرائے میرؔ سے بہتر سمجھتے تھے۔ حکیم قدرت اللہ خاں اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرا فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سوداؔ در غزل گوئی بوے (میرتقی) نرسیدہ۔ ما ماحق آنست کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائیست بیکراں و میر نہرے است عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میرؔ را بر مرزا برتری است۔ و در قوتِ شاعری مرزا را بر میرؔ سروری"

میرؔ کے مقابلے میں سوداؔ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ ہر ایک صنفِ شاعری پر قدرت رکھتا تھا۔ اور میرؔ نے محض غزل گوئی (اور کسی حد تک مثنوی نگاری) میں کمال حاصل کیا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ سوداؔ کی نسبت لکھتے ہیں۔ "بہ زعمِ فقیر غزلش بہ از قصیدہ و قصیدہ اش بہ از غزل۔" سوداؔ کی نسبت 'آبِ حیات' کے اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے۔ کہ سوداؔ کے کلام میں "واہ" کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ سوداؔ کے کلام میں سوز بھرے اشعار کئی ہیں۔ اور چونکہ ان میں میرؔ کی طرح بے تحاشا گریہ وزاری نہیں، بلکہ ایک طرح کے ضبط اور وقار سے دردِ دل بیان کیا ہے۔ ان شعروں میں خاص ہی لطف ہے ؎

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس — پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

نگر ہو آباد جسکے دل کا نہ پوچھو اس سے تو دہر ہمارا — یہ درد سن اس کی ریتیں ہیں سے ٹک ہو لٹتے دیکھے دیار اپنا

ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک — کیا جانیں پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں — دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

غالب کی طرح سودا کے کلام میں شوخ نگاری بہت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسے انہوں نے ہجو نگاری کے لئے وقف رکھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ سودا کی زبان پرانی اور متروکات سے پُر ہے۔ فنی نقطۂ سے بھی میر اور غالب کے اشعار سودا کے اشعار سے بہتر ہیں۔ غالب میں سودا کی خوبیاں بھی تھیں، عیب کوئی نہ تھا لیکن میر کی نسبت سودا سے انکی طبیعت زیادہ ملتی تھی۔ اور جب کلیاتِ سودا پر کوئی نقاد نئے سرے سے نظر ڈالیگا۔ تو اُسے اُس طبعی ہم آہنگی کا صحیح اندازہ ہوگا۔ جو اُردو شاعری کے ان دو جلیل القدر "میرزاؤں" میں تھی +

غالب اور مومن

میر کے علاوہ ایک اور اُردو شاعر جس سے غالب کا موازنہ اکثر کیا جاتا ہے۔ مومن اور غالب میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں کو خدا نے شاندار دل و دماغ دیے تھے۔ دونوں میں خود پسندی بہت تھی۔ دونوں ناسخ کے مداح اور مقلد تھے۔ اور دونوں کی زبان میں فارسیت اور تصنع کا عنصر نمایاں ہے۔ دونوں معنی آفرینی اور خیال بندی کے شیدا تھے۔ دونوں زبان اور مضمون میں اونچے طبقے کے ترجمان اور شاہ نصیر اور ذوق کے مقبولِ عام اشعار اور نظیر اکبر آبادی کے پسندِ "سوقیانہ" کلام کے مخالف تھے۔ یہ

؎ گلشنِ بیخار مؤلفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ گلشنِ بیخار اور گلستانِ بے خزاں کا سرسری طور پر گذشتہ

(باقی آئندہ پر)

خصوصیتیں تو ایسی ہیں۔ جو دونوں میں مشترک تھیں۔ لیکن ان کے علاوہ کئی مشترک خصوصیتیں ایسی ہیں۔ جو ایک میں زیادہ تھیں۔ اور دوسرے میں کم۔ مثلاً نازک خیالی اور دقت پسندی

(صفحہ ۳۰۲ کے آگے)
صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے ادبی رجحانات نمایاں کرنے کے لئے گلستانِ بیخزاں کی وجہِ تصنیف بتانا ضروری ہے۔ یہ کتاب نظیر کے ایک شاگرد نے گلشنِ بیخار کے جواب میں لکھی۔ مصنف نے کتاب کی وجہِ تصنیف دیباچہ میں یہ بتائی ہے۔ کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں سوائے نوب اور ذی اقتدار شعرا (مثلاً غالب۔ مومن۔ صدرالدین آزردہ۔ نصیر۔ غلام علی خاں وحشت) کے دوسرے شاعر کا اچھی طرح ذکر نہیں کیا۔ اور بادی الشعرا نظیر اکبرآبادی کے ساتھ خاص طور پر بے انصافی کی ہے۔ اس غلطی کی تلافی کے لئے مصنف (میر قطب الدین باطن) نے گلستانِ بیخزاں لکھی۔ جس میں شیفتہ۔ غالب۔ آزردہ اور مومن خاں کی خوب خاک اڑائی ہے۔ اور نظیر کی بڑی تعریف کی ہے۔

گلستانِ بیخزاں کے مضامین سے ہمیں بحث نہیں۔ لیکن مصنف کے اپنے بیان سے بھی اس عداوت اور خصومت کا اندازہ ہو جائے گا۔ جو مومن۔ غالب اور ان کے احباب کو نظیر سے تھا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ شیفتہ نے نظیر سے پوری طرح انصاف نہیں کیا۔ شیفتہ نے اردو کے بہترین نقاد حالی کی تربیت کی۔ اور اردو شعرا کے قدیم تذکروں میں بہترین تذکرہ انہی کا ہے۔ اس لئے ہر شاعر کے بارے میں ان کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے۔ لیکن کئی باتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ نظیر کی خوبیاں پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ نظیر طبقۂ عوام کا ترجمان تھا۔ اس کے خیالات عام بلکہ عامیانہ۔ نظموں کے موضوع عام پسند۔ اور زبان عام فہم بلکہ بازاری۔ شیفتہ ایک تو خود طبقۂ شرفا کے ممتاز رکن تھے۔ دوسرے مومن کے شاگرد۔ انہیں نظیر کے اشعار کس طرح پسند آتے۔ حالی لکھتا ہے۔ "چھوٹے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونو متنفر تھے"۔ چنانچہ شیفتہ نے نظیر کے متعلق لکھا۔ "اشعار بسیار دارد۔ که بر زبان سوقیان جاری است۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

غالب اور مومن دونوں دلدادہ تھے۔ اور پُرانے مضامین کے لئے نئے اسلوب بیان اختراع کرنے میں دونوں بڑا زورِ دماغ صرف کرتے تھے۔ اس مقصد کے حصُول کے لئے دونوں

(بقیہ از صفحہ گذشتہ)
و نظر بہ آں ابیات دراعدادِ شعرائش شاید شمرد۔ اما بہ رعایت ابیاتِ منتخب قطع نظر کردہ شد"۔

شیفتہ کی جو رائے نظیر کے متعلق تھی۔ قریب قریب وہی غالب کی تھی۔ اس کا ذکر تو ہم نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا لیکن نواب سر امیر الدین احمد خاں صاحب مرحوم سابق والیٔ لوہارو نے راقم السطور سے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا۔ جس سے مرزا کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ ایک دفعہ انکی والدہ صاحبہ نے مرزا غالب کو کہلا بھیجا۔ کہ مرزا صاحب! آپ میرے بیٹے امیر الدین کو کوئی اپنا منتخب شعر یاد کرا دیں تاکہ وہ اسے پڑھتا پھرے اور اس پر عمل کرے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے مجھے ذیل کا شعر یاد کرنے کیلئے لکھ دیا:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

نواب صاحب فرماتے تھے۔ کہ میں یہ شعر پڑھتا پڑھتا اپنے والد نواب علاء الدین خاں کے پاس چلا گیا۔ اور انہیں جاکر سارا واقعہ سُنایا۔ انہوں نے یہ شعر سُنکر مجھے کہا۔ کہ تم مرزا صاحب کو جاکر میرا پیغام دینا۔ کہ مرزا صاحب! آپ نے چھوٹے سے بچے کو یہ معرفت کا شعر کیا یاد کرایا۔ اسے وہ کیا سمجھے گا۔ اسے تو کوئی آسان شعر یاد کرانا چاہیئے۔ امیر الدین صاحب نے یہ پیغام مرزا غالب تک پہنچایا۔ وہ اسے سُن کر کہنے لگے۔ کہ تمہارا باپ.... اچھے شعر کیا سمجھیگا۔ اُسے نظیر کے شعر سُنانے چاہئیں۔ جاؤ انہیں وہ قطعہ یاد کر کے سُناؤ۔ جسکا آخری مصرعہ ہے

ع　روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر![1]

مومن۔ غالب اور ان کے ساتھیوں اور نظیر کے درمیان جو بعد المشرقین تھا۔ وہ تو ظاہر ہے لیکن شاہ نصیر اور ذوق کے ساتھ بھی انہیں اسی طرح کا اختلاف تھا۔ چند متروکات کو چھوڑ کر شاہ نصیر اور ذوق وہی زبان استعمال کرتے تھے۔ جو میر اور سودا کی تھی مومن اور غالب ناسخ کے پیرو تھے۔ جس نے

---

[1] جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے۔ نواب صاحب نے یہی مصرع دُہرایا تھا۔ لیکن شاید یہ مشہور مصرع نظیر کا نہیں۔

بعض جگہ ایک ہی طرح کا تکیۂ فن (*Mannerism*) استعمال کرتے ہیں مثلاً محذوفات کے دونوں عادی ہیں۔ اور دونوں کے کئی اشعار میں کسی واقعہ یا حالت کا بیان کرتے ہوئے کئی ایسے اجزا چھوڑ دئے گئے ہیں۔ جنہیں پورا کرنے کے لئے دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس قبیل کے اشعار کلیاتِ مومن میں کئی ہیں ؎

اے کاش عدو کو غیرت آئے — مَیں منتظر اپنی موت کا ہوں
راز نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ! — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ نازک خیالی اور دقت پسندی کے غالب اور مومن دونوں دلدادہ ہیں۔ لیکن مومن اس معاملے میں بڑا غلو کرتے تھے۔ ان کے ایسے اشعار تھوڑے ہیں۔ جن میں یہ رنگ نمایاں نہیں۔ برخلاف اس کے غالب ہمیشہ اسی سراب میں سرگرداں نہ رہے۔

(بقیہ از صفحہ ۳۰۴)
شعرد شاعری کی زبان کو عام بولچال کی زبان سے ایک مختلف چیز بنادیا تھا۔ اور اُردو زبان کو اُس رستے پر ڈالا جو اسے ہندی سے بہت دُور لے جانے والا تھا۔ غالب کے شاگرد حالی نے اس روش کے خلاف قدم اُٹھایا۔ اور میر تقی میر کی صاف زبان اور سادہ و عام فہم مضامین کی تقلید کی لیکن اس کا اثر دیرپا نہ ہوا۔ اور غالب کی مقبولیت اور اقبال اور دوسرے پنجابی شعرا کے اثر کی وجہ سے آج جو زبان اُردو شاعری میں بالعموم رائج ہے وہ بولچال کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔

اور ان کی کئی غزلیں اور متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں نازک خیالی اور دقت پسندی نام کو نہیں

یہ اُردو ادب کی بدقسمتی تھی۔ کہ مومنؔ نے چیستاں گوئی اور مضمون آفرینی کو کمالِ شاعری سمجھا۔ ورنہ جو معنی یاب طبیعت اور "دلِ گداختہ" انہیں ازل سے ملا تھا اگر وہ اسے پرانے مضامین میں پیچ دے کر نئے پہلو نکالنے کی بجائے اپنی جودتِ طبع کے لئے نئے میدان تلاش کرنے یا غزل میں اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے صرف کرتے۔ تو اُردو ادب پر ان کا بڑا احسان ہوتا۔

اب بھی اُن کے کئی اشعار ہیں۔ جن کا جواب صرف دیوانِ غالبؔ میں ملیگا سے

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کرینگے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

پھر بہار آئی وُہی دشت نوردی ہوگی　　پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں　　وہ ہی ہم ہونگے وہی دشت و بیاباں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومنؔ　　آخری وقت میں کیا خاک مُسلماں ہونگے

خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں　　کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

مومنؔ کی بہترین غزل ایسی ہے۔ جس میں ان کے اپنے رنگ کی ایک بات نہیں۔ نہ ہی فارسیت۔ نہ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی لیکن یہ غزل اُردو کی بہترین غزلوں میں شامل ہونے کے قابل ہے سے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر　　مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکائتیں وہ مزے مزے کی حکائتیں　　وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو مومنؔ اور غالبؔ میں مشترک تھیں۔ اب ایک دو ایسے اوصاف کا ذکر باقی ہے۔ جو کلامِ غالبؔ کو ممتاز کرتے ہیں۔ لیکن مومنؔ کے اشعار میں عنقا ہیں۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر چیز ظرافت ہے۔ جو دیوانِ مومنؔ میں قطعاً نہیں۔ اس کے علاوہ سوز و گداز کے اشعار جو دیوانِ غالب میں کثرت سے ہیں۔ غزلیاتِ مومنؔ میں بہت تھوڑے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مومنؔ کی مثنویوں میں (جن کی نسبت معاصرانہ تذکرے بھی شاہد ہیں۔ کہ وہ مومنؔ کی اپنی آپ بیتی ہیں) پُر درد اور موثر اشعار کی کوئی کمی نہیں لیکن غزل کو انہوں نے بیشتر مضمون آفرینی اور جدّت نگاری کے لئے وقف رکھا۔ اسے غالبؔ یا میرؔ کی طرح داستانِ دل کہنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

مذکورہ بالا دو کوتاہیوں کے علاوہ کلامِ مومنؔ میں کئی فنی عیوب بھی ہیں۔ رعایت لفظی کی تو ان کے اشعار میں بھرمار ہے ؎

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
ہو کے یوسف جو دل چراتے ہو — کون ہو جائے گا غلام مرا
صاحب نے اِس غلام کو آزاد کر دیا — لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
دِل آگ ہے اور لگا میں گے ہم — کیا جانئے کسے جلائیں گے ہم

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مومنؔ نے غالب کی طرح اپنے کلام پر نقادانہ نظر نہیں ڈالی۔ اُن کی بہترین غزلوں میں اس طرح کے شعر آجاتے ہیں ؎

کہا ہیں نے بت وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی — تو کہا کہ جانئے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور باتوں سے قطع نظر غالبؔ اور مومنؔ میں ایک بیّن فرق اس طرزِ عمل میں ہے۔ جو دونوں کا اپنی شاعری کے متعلق تھا۔ غالبؔ اور مومنؔ دونوں فنِ شعر گوئی میں اپنے برابر کسی نہ سمجھتے تھے۔ لیکن مرزا نے اس جذبے سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کی اصلاح و تہذیب ترک نہیں کر دی۔ اُن کی تمام ادبی زندگی ترقی و اصلاح کی مسلسل داستان ہے۔ ان کا شروع کا کلام ادق اور غیر شاعرانہ تھا۔ اور بالآخر انہوں نے اس میں جو صفائی اور دلآویزی پیدا کر دی۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ عظیم الشان قلب ماہیت جس کی ادبیات میں بہت کم مثالیں ملیں گی۔ صرف اس لیے ہو سکی۔ کہ مرزا تمام عمر اپنے خیالات اور طرزِ شعر گوئی کی اصلاح میں کوشاں رہے جب کسی نکتہ چیں نے ان کی کوئی غلطی انہیں سمجھائی۔ تو انہوں نے سلامت روی سے اسے تسلیم کر لیا اور اصلاح کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ وہ بطورِ خود تمام مفید ادبی تحریکوں اور قابلِ تقلید ادبی شخصیتوں کے کلام سے واقف رہ کر ان کی خوبیاں اخذ کرنے میں کوشاں رہے۔ اخیر عمر میں قاآنی کا کلام ان تک پہنچا۔ اور انہوں نے اس کی خوش آہنگی کی تقلید کئی غزلوں میں کی۔ ادبی اور اصلاحی تحریکوں میں اُن کی دلچسپی مرتے دم تک باقی رہی۔ اخیر عمر کے ایک خط میں نواب علاء الدین کو لکھتے ہیں:۔ "مزا تو جب آئے گا۔ کہ تم دلّی آؤ۔ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامۂ انجمن کا حال بیان کرو۔"

اپنی شعر گوئی کے متعلق مرزا کا جو طرزِ عمل تھا۔ اس کا بہترین بیان ان کے اپنے ایک شعر میں ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یا ؎　　نغز گفتی نغز تر باید شنفت

یا ؎　　ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است

برخلاف اس کے مومن کہتے ہیں ؎

عبث ترقیٔ فن کی ہوس ہے مومن کو   زیادہ ہوئیگا کیا اس سے بے مثال تو ہے!

مومن کو خدا نے زبردست دل و دماغ دیا تھا۔ اور ان کا اردو شاعری میں بہت بلند مرتبہ ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تیز نقادانہ نگاہ بیشتر دوسروں کے عیوب و اسقام ڈھونڈنے کے لئے وقف رکھی۔ اس سے اپنی اصلاح میں پوری مدد نہ لی۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ان کی فنی ترقی رکی رہی۔ اور شاعرانہ عروج و ارتقا کے جو مدارج غالب کے کلام میں ہیں مومن کے ہاں معدوم ہیں ؛

خسرو۔ فیضی۔ اقبال۔ غالب

مرزا غالب ہندوستان کے فارسی شعرا کے قائل نہ تھے۔ وہ ہندوستانی شعرا میں فقط امیر خسرو کو پورا شاعر سمجھتے تھے۔ اور فیضی کی نسبت کہتے تھے۔ کہ اس کی بھی کبھی کبھی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ مرزا کا یہ بیان بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے عرفی نظیری اور صائب کا تتبع کیا۔ اور ان شعرا کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گذرا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ چونکہ یہ شعرا ہندوستان میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ مرزا انہیں ہندوستان کے شاعر نہ گنتے تھے۔ ان شعرا میں مرزا غالب سب سے زیادہ عرفی سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہی زورِ کلام۔ وہی رفعتِ تخیل۔ وہی اپج اور جدت پسندی اور وہی معنی یاب طبیعت لیکن یہ صحیح ہے۔ کہ عرفی کی جوانمرگی نے اسے تکمیلِ فن کا موقع نہیں دیا۔ اور اس کی شاعری میں وہ حکیمانہ سکون اور ژرف بینی نہیں آئی۔ جو مرزا کے بعد کے کلام کا مابہ الامتیاز

ہے ۔ بہ حیثیت مجموعی مرزا کا پایہ عرؔفی کی بہ نسبت بلند ہے ۔ اور ان کا یہ شعر کسی خلافِ حقیقت تعلّی کا اظہار نہیں ہے

عرؔفی کسے است لیک نہ چوں من دریں چہ بحث! او جسنہ جسنہ غالب و من دستہ دستہ ام

خسرو ہندوستان کے جن فارسی شعرا کا ذکر مرزا نے تعریف کے پیرائے میں کیا ہے ۔ ان میں امیر خسرو خاص طور پر ممتاز ہیں ۔ عام طور پر انہیں ہندوستان کا بہترین فارسی شاعر سمجھا جاتا ہے ۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے ۔ جب ہندوستان اور ایران کے درمیان ملکی اور نسلی تعصبات نے تنگ نظری کی دیوار نہیں کھڑی کر دی تھی ۔ ایرانی شعرا بالخصوص سعدؔی اور جاؔمی نے ان کی دل کھول کر تعریف کی ۔ اس کے علاوہ قلم و تصوف میں انہیں جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے ۔ اس نے بھی تذکرہ نویسوں کو متاثر کیا ۔ اور بالعموم انہیں شعر و شاعری میں وہ بلند مرتبہ دیا جاتا ہے جس کے خالص ادبی نقطۂ نظر سے وہ شاید مستحق نہیں ؂

غالبؔ اور خسرؔو کا موازنہ کرنا کسی قدر مشکل ہے ۔ خسرؔو کی شاعری اُس زمانے کی یادگار ہے ۔ جب سادہ خیالات کو دلنشیں طریقے سے ادا کرنا ہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا تھا اور ابھی مضمون آفرینی اور خیال بندی کو فروغ حاصل نہ ہوا تھا ۔ امیر خسرؔو اس سادہ طرزِ شاعری کے لئے خاص طور پر موزوں تھے ۔ خدا نے انہیں دلِ گداختہ عطا کیا تھا ۔ اس لئے کلام میں تاثیر تھی ۔ اس کے علاوہ موسیقی میں انہیں مہارت کلی تھی ۔ اور یہ واقفیت انہیں بحروں اور الفاظ کے انتخاب میں کار آمد ہوتی ۔ ان کے الفاظ اور خیالات ایسے ہوتے تھے ۔ جنہیں عوام الناس بھی سمجھ سکتے تھے ۔ اور ان کی بہترین غزلیں ایسی ہیں جن سے خواص ہی نہیں ، بلکہ عوام بھی لطف اندوز ہوتے ہیں ؂

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری — ہر چند وصفت میکنم در حسن ازاں زیباتری

آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام — بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

خسرو غریبست و گدا افتادہ در شہرِ شما — باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

من ندیدم چوں تو ہرگز دلبرے — ہر کشے عاشق کشے غارت گرے

از تو یک نازو ز خوباں عالمے — از تو تیرے و زدِ لہا لشکرے

من سرے دارم کہ در پایت کشم — گر تو در خوبی نداری ہمسرے

دست نہ بر سینہ ام تا بنگری — آتشے پوشیدہ در خاکسترے

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز

ملکِ دل کردی خراب از تیغِ ناز — واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ — نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

پیری و شاہد پرستی ناخوش است

خسروا تاکے پریشانی ہنوز

سلام خدمتِ مالے صبا بیار بگوئے — فغان و زاری بلبل بنو بہار بگوئے

برفت قوتِ عقل و نماند تابِ صبر — بگوئے حال من ایں راز نہار بگوئے

ہزار جور کشیدم ز غم کہ نتواں گفت — یکے اگر نتوانی ازاں ہزار بگوئے

لیکن انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ اس امر کا اظہار کر دیا جائے۔ کہ کلامِ خسرو میں ایسی غزلوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ اور پھر خسرو کے بہترین اشعار میں بھی وہ حکیمانہ ژرف بینی نہیں۔ جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالب اور خسرو کے طرز الگ الگ تھے۔ خسرو سادہ اور پر تاثر اشعار پسند کرتے تھے۔ اور مرزا اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب مشکل گوئی کا

رواج ہو گیا تھا۔ اس مشکل گوئی کی وجہ سے کلام میں غیر ضروری الجھنیں اور غیر شاعرانہ مضامین آ گئے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ کہ جب تک شعرا نے اپنے تئیں سادہ اور عام مضامین تک محدود رکھا۔ تب تک ان کے کلام میں حکیمانہ عمق اور بلند پردازی بھی نہیں آئی۔ اور یہ کمی کلیات خسرو میں نظر آتی ہے +

خسرو نے کئی بلند پایہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اور مثنوی نگاری میں ان کا مرتبہ غالب سے بہت بلند ہے۔ لیکن قصیدہ نویسی میں شاید مرزا امیر خسرو سے آگے نکل گئے ہیں۔ خسرو کے کئی قصیدے باا‌ثر ہیں۔ اور طرح طرح کی صنعتوں سے مرصع ہیں۔ لیکن ان میں وہ رفعتِ تخیل اور حکیمانہ خیالات نہیں جو مرزا کے قصائد میں ہیں۔ مرزا نے اپنے بہترین قصیدوں کی تشبیبیں مضامینِ فطرت یا زندگی کے متعلق حکیمانہ مسائل بیان کرنے کیلئے وقف رکھیں۔ اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن خسرو کی تشبیبیں اس قدر بلند پایہ نہیں۔ ان کے بعض قصیدے تعداد اشعار کے لحاظ سے بھی مختصر ہیں۔ اور بالعموم ان میں وہ بلندی اور رفعت نہیں۔ جو مرزا کے بہترین قصائد کو ممتاز کرتی ہے +

فیضی خسرو کے علاوہ ایک اور ہندوستانی جس کے فارسی اشعار کا ذکر مرزا نے قدرے احترام سے کیا ہے۔ دربارِ اکبری کا ملک الشعرا فیضی تھا۔ فیضی بہت پُر گو شاعر تھا۔ اُس نے مہابھارت اور بھاگوت گیتا کا فارسی مثنوی میں ترجمہ کیا۔ اکبر کے حکم سے خمسہ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن پانچوں کتابیں مکمل نہ کر سکا۔ آج کل فیضی کی مثنویاں بہت کم پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن غزلیں آج بھی مقبول ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اس کے کلام میں کئی باتیں ہیں۔ جو اور شعرا کے ہاں بہت کم ملتی ہیں +

فیضیؔ دربارِ مغلیہ کا اُس زمانے میں ملک الشعرا تھا۔ جب مغلوں کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور مرزا غالب دربارِ مُغلیہ سے اس زمانے میں وابستہ ہوئے۔ جب مغلیہ حکومت نزع کی حالت میں تھی۔ اس اختلافِ حالات کا عکس ان دونوں کی شاعری میں نمایاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند ایک خصوصیات فیضیؔ اور غالبؔ میں مشترک ہیں۔ ان خصوصیات میں سب سے اہم مذہب کے متعلق ایک آزاد خیالی ہے۔ جو فیضی میں تو تشکک کی حد تک جا پہنچتی ہے؛

فیضی کی آزاد خیالی

فیضیؔ اُس زمانے میں پیدا ہُوا۔ جب ہندوستان میں اسلام کے نام پر دو باا ثر علما (مخدوم الملک اور صدر الصدور) نے بڑا جابرانہ احتساب جاری کر رکھا تھا۔ ہر وہ شخص جس سے ان بزرگوں کو کوئی شکایت ہوتی۔ اسکے خلاف بدبختی ہونے کا فتویٰ عائد کر کے حدِ شرعی جاری کی جاتی فیضی' ابو الفضل اور انکے باپ شیخ مبارک کو اس سلسلے میں بہت پریشان کیا گیا۔ ان بزرگوں نے جس حد تک اسلام کی صحیح پیروی کی۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ جو اکبری "دینِ الٰہی" کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ وہ بھی ان بزرگوں کو "علماءِ سو" کہتے ہیں لیکن فیضیؔ پر ان کے ظلم و تشدد کا یہ اثر ہُوا۔ کہ وہ مذہب اسلام سے ہی کسی قدر برگشتہ ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اسلام فی الواقع وہی طریقہ ہے۔ جس کی یہ بزرگ پیروی کرتے ہیں۔ تو اس اسلام سے کفر اچھا ہے

زباں کشیدہ بدار القضائے عُجب رہا | شہودِ کذب زدعوئے گرانِ ایمانی
اگر حقیقتِ اسلام درجہاں این است | ہزار خندۂ کفر است بر مُسلمانی!

مذہب کے متعلق آزادانہ نقطۂ نظر کا فیضی نے کئی جگہ اظہار کیا ہے۔ ایسے شعر

بہت سے ہیں۔ جن میں کعبہ کے متعلق طنزیہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک غزل کا شعر ہے ؎

آنکہ می‌کرد مرا منع بہ پرستیدنِ بُت — درحرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

کعبہ و تعلیم آدابم مکن — گرم رو را فرصتِ احرام نیست
کاروانِ کعبہ شد منزل نشیں — رہروانِ عشق را آرام نیست

کئی جگہ یہ مضمون نظم کیا گیا۔ کہ کعبہ کو گرا کر اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنی چاہیے ؎

گر کعبہ شود ویراں سہل است کہ عشق از تو — کاخے دگر افرازد طرحے دگر اندازد!

ایک غزل میں اس خیال کو بڑے زور دار طریقے سے ادا کیا ہے ؎

بیا کہ روئے بمحرابگاہِ نور نہیم — بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
خطیمِ کعبہ شکستہ اساسِ قبلہ بریخت — بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم
علوِ طاقِ حرم تا بچند مصلحت است — کہ داغِ عشق بہ پیشانیٔ غرور نہیم

ایک اور غزل میں یہ اظہار اور بھی تفصیل سے ہے ؎

گو عشق کہ زنجیرِ درِ کعبہ گدازیم — وز بہر پرستش صنمے چند بسازیم
از پردہ در کعبہ بریشم بستانیم — بر چنگ بہ بندیم و بمسجد بنوازیم
ویں کعبہ کہ حجاج برافراختہ آں را — انداختہ چوں دیر اساسے بفرازیم
از بادۂ گلرنگ بہ سجادۂ طاعت — نقشے بنگاریم و بساطے بطرازیم
در سنگِ سیہ مہرہ بسازیم و بمحراب — با مغبچگاں شعبدۂ چند بسازیم
پے کردنِ جمازہ دریں راہ ثواب است — بر قافلۂ کعبہ رواں مست بتازیم
با ہم درِ میخانہ بہ از صد عرفات است — ما با ہمہ سازیم و بسالوس نسازیم!

ایک فارسی قطعہ میں بہشت اور دوزخ کے متعلق بھی ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن سے کلامِ غالب کے ناظرین بخوبی واقف ہیں ؎

ایا محیطِ مواعظ کمالِ ملت و دیں — دریغ گوہرِ وعظ ترا مصارف نیست
بہ پیشِ من سخن از دوزخ و بہشت مگو — کہ گوشِ ہوشِ حریفاں بریں خارف نیست
خدائے را زمن احوالِ حشر و نشر مپرس — کہ سادہ لوحِ محبت ابو المعارف نیست
غلامِ صوفیٔ صافی شوم کہ مے گوید
بہشت و دوزخ بجز بسط و قبضِ عارف نیست!

مرزا غالب نے ایک دو جگہ فقہی مسائل کی نسبت بڑے چلتے ہوئے فقرے لکھے ہیں۔ فیضی نے بھی ایک قطعہ میں اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اپنی نسبت لکھتے ہیں ؎

ایا حریف! دریں بزم گاہ فیضی را — گماں مبر کہ ز خیلِ تہی سبو یانست
کشیدہ بادۂ تحقیق در حدائقِ علم — ز شاخسارِ خرد دستہ دستہ بو یانست
بکوہ و دشتِ معانی کہ مرغ پر نہ زند — بچابکیٔ تعقل دو اسپہ پو یانست
مگر مسائلِ فقہ مقلدانِ ہوا — کہ علم حیلہ گراں[۱] و بہانہ جو یانست
مشاجراتِ فرائض کہ کس نخواندش — از و مپرس کہ آں علمِ مردہ شو یانست!

عقل و خرد فیضی کے کلام سے خیال ہوتا ہے۔ کہ جید عالم تھا۔ اور طبیعت بھی عالمانہ بلکہ کتابی پائی تھی۔ اپنی عقل سمجھ پر ناز بہت زیادہ تھا۔ اور خیال تھا۔ کہ اسکی مدد سے دنیا جہاں کے سارے عقدے حل ہو جائینگے۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ اور کئی

---

[۱] مخدوم الملک جو عہدِ اکبری کے شیخ الاسلام تھے۔ سال کے شروع میں اپنا سب مال بیوی کو ہبہ کر دیتے اور سال کے اندر اندر انہیں پھیر دیتے تاکہ دونوں زکوٰۃ سے بچ جائیں!!

اشعار میں اُس نے عقل کی کوتاہیوں کی شکایت کی ہے۔ ایک فارسی رُباعی ہے ؎

یارب ز کرم امیدِ بے بیمم دہ　　علمے کہ رضائے تُست تعلیمم دہ
تاریکئ عقل در کشاکش دارد　　از شمع رضا فروغِ تسلیمم دہ

ایک اور شعر میں عقل کی کوتاہیوں کا ذکر ہے ؎

اے کہ بمعراجِ عقل آمدہٗ سر بلند
رو کہ در دیوانِ عشق جائے تو نیست آمدہ

ایک فارسی رباعی میں یہ اظہار اس سے بھی صاف صاف اور زوردار لفظوں میں ہُوا ہے ؎

چندانکہ بعقل گیرودار است مرا　　صد گونہ گرد بکار و بار است مرا
اے عقل برو کہ از تو کارم نشود　　دے بخت بیا کہ با تو کار است مرا

فیضیؔ کے علاوہ اقبالؔ نے بھی جا بجا اپنے اشعار میں عقل کی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے برخلاف اس کے غالبؔ نے کئی جگہ عقل بالخصوص خِرد اور دانش کی تعریف کی ہے۔ کئی جگہ تو یہ اظہار ضمناً اور سرسری سا ہے۔ مثلاً مثلاً جہاں عقل کو "نہفتہ داں" کہا ہے۔ یا "کاروبارِ مردمِ ہشیار" اور "فرزانۂ بیدار مغز" کا ذکر تعریف کے پیرائے میں کیا ہے۔ لیکن ابر گہر بار میں متعدد اشعار صراحتاً خرد کی تعریف میں ہیں ؎

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است　　خرد را ولے تابشِ دیگر است
ہمانا بشبہائے چوں پرِ زاغ　　نہ بینی گہر جز بروشن چراغ
بہ پیرایشِ ایں کہن کارگاہ　　بدانش نواں دید آئیں نگاہ
بود بستگی را کشاد از خرد　　سرِ مرد خالی مباد از خرد!!

آگے چل کر یہ اظہار اور بھی زوردار ہوگیا ہے ؎

خرد چشمۂ زندگانی بود ــ خرد را بہ پیری جوانی بود
فروغِ سحرگاہِ روحانیاں ــ چراغِ شبستانِ یونانیاں
نخستیں نمودارِ ہستی گرائے ــ خرد بود کامد سیاہی زدائے
خرد جویم ار خود بود مرگ من
بہ ہستی خرد بس بود برگ من!

مرزا نے نہ صرف خرد اور دانش کی اپنے اشعار میں جابجا تعریف کی ہے۔ بلکہ انکی تصنیفات اور احوالِ زندگی سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خدا نے خرد اور دانشوری سے انہیں حصّہ وافر دیا تھا۔ اور جن لوگوں کو ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ ان کی اس خوبی کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کلیاتِ غالب کے آخر میں لکھتے ہیں ؎

تو قفلِ خرد را کلید آمدی
نہ آساں دریں جا پدید آمدی!

اقبال اور فیضی دونوں بلند پایہ فلسفی تھے۔ اور بمصداق ؏
جو خال حد سے گزرا وہ بیشک مسا ہوا

عقل و منطق کی فراوانی بھی فلسفیوں اور منطقیوں کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے لیکن عقل و خرد کے متعلق ان کا اور غالب کا اختلاف اس وجہ سے ہے۔ کہ جس عقل کے وہ ثنا کی ہیں۔ وہ غالب کی خرد اور دانش سے بالکل مختلف ہے۔ فیضی کے نزدیک عقل ایک طرح کی تنقیدی قوت ہے جس سے وہ صحیح و غلط اور حق و باطل کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہے ؎

فیضیم کز دلِ دقیقہ شناس ــ نقش سرِّ و علن شناختہ ام
آنچہ باید شناخت دانا را ــ بہ یقیں نے بظن شناختہ ام

ار الٰہی لعقل دُور اندیش تُنک از اہرمن شناختہ ام

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ تنقیدی نقطۂ نظر کو حد سے بڑھا دینے اور حسِ تناسب کو ہاتھ سے کھو دینے سے انسان اصل مقصد سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس سے مختلف طریقوں کی غلطیاں تو نظر آجاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا شبہاتی اسلوبِ خیال استوار ہو جاتا ہے جسکی موجودگی میں تسکین یا کسی ایک طریقے کے متعلق اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ فیضی کی بھی یہی حالت ہوئی تھی کہ وہ اپنی روحانی بے چینی سے بے تاب ہو کر پکار اُٹھتا ہے ؎

تاریکئ عقل در کشا کش دارد از شمع رضا فروغ تسلیم دہ

فیضی کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اسے شروع میں عقل، بالخصوص اپنی عقل پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور امید تھی۔ کہ اس سے "عقدہ دین و دول" حل ہو جائینگے۔ لیکن ایک تو خرد و دانش اور پھر جس تنقیدی نقطۂ نظر کو فیضی عقل سمجھا ہوا تھا۔ اُس کی کوتاہیاں ظاہر تھیں۔ خالص تنقیدی اور منفیانہ نقطۂ نظر کسی عظیم الشان حقیقت تک پہنچنے میں مدد نہیں دے سکتا مذہبی معاملات میں تو خاص طور پر یہ اصول مسلمہ ہے۔ کہ جو شخص شک سے شروع کرتا ہے۔ وہ بالعموم اسی وادی میں سرگرداں رہتا ہے۔ روحانی تسکین اور سربلندی کے لئے اپنے روحانی تجربہ اور مشاہدہ (چشمِ باطن) پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ "خردِ خردہ بیں" پر نہیں۔ فیضی نے بھی بالآخر اس حقیقت کو پالیا۔ اور "عقل" کی راہنمائی سے جو اُسے مایوسی ہوئی اُس کا اظہار اس کے اشعار میں ہے۔ لیکن مرزا غالب نے نہ ہی روحانی معاملات میں وہ تنقیدی اور منفیانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جو فیضی کا تھا اور نہ ہی انہیں اس طرح کی مایوسی ہوئی۔

اقبال کے نزدیک بھی عقل کی حیثیت منفیانہ ہے۔ لیکن جس عقل کے وہ شاکی ہیں۔ وہ ایک تنقیدی قوت نہیں جس سے روحانی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ تفکر و تامل کی وہ

عادت ہے جس سے عمل کی قوت شل ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں عشق ایک زبردست احساس ہے۔ جس سے متاثر ہو کر انسان کوئی عمل کرتا ہے۔ اور عقل کشمکش و پیچ اور تذبذب کی کیفیت پیدا کرتی ہے جس سے انسان کام کا اونچ نیچ سمجھتا ہے۔ لیکن جس سے اس کام کرنے کی خواہش کمزور ہو جاتی ہے۔ اقبال کو جس عقل بہانہ جُو کی شکایت ہے۔ اُس کی کارفرمائیاں شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کیرکٹر میں نمایاں کی ہیں ؎

To do or not to do; that is the question!

اقبال کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

انہوں نے ایک اور نظم میں نظیری کا شعر تضمین کر کے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے ؎

ہر کجا راہ دہد اسپ بداں تاز کہ ما — بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

اقبال جس عقل کے خلاف ہیں۔ اُس کی طرفداری کرنا مشکل ہے لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ عقل کا یہ مفہوم نسبتاً محدود ہے؟ جہاں تک عقل کا عمل سے تعلق ہے عقل نہ صرف ایک کام کے اُونچ نیچ پر متاملانہ نظر ڈالتی ہے۔ بلکہ اس کام کے کرنے کا عملی اور احسن طریقہ بتانا بھی اسی کا کام ہے۔ عشق کی مثال سٹیم یا بجلی کی طرح ایک طاقت کی ہے۔ جس سے کسی کام کرنے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور عقل یہ بتاتی ہے۔ کہ اس طاقت سے کس طرح کام لیا جائے۔ پیغمبروں کا اور خاص طور پر خوش نصیب آدمیوں کا معاملہ مختلف ہے۔ انہیں تو الہام سے یا چشمِ باطن کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک کام کرنے کا احسن طریقہ کونسا ہے لیکن عام انسان اگر اپنی عقل سمجھ کو کام میں نہ لائیں۔ تو وہ صحیح طور پر کسی کام کو مکمل نہ کر سکیں یا ایسے کاموں میں اپنی تمام قوت صرف کر دیں۔ جو بجائے انسان کو منزلِ مقصود سے

قریب لانے کے دُور تر لے جاتے ہیں ؀

فیضیؔ اور اقبالؔ کے نقطۂ نظر میں کمی یہ ہے۔ کہ انہوں نے جس قوت کو عقل مان کر اس کی مذمت کی ہے۔ اسے عقل کی مکمل صورت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ انہوں نے عقل کی جو صورتیں قرار دی ہیں۔ ان میں کوتاہیاں ہیں۔ لیکن عقل سمجھ مکمل اس صورت میں ہوگی۔ جب یہ اپنی خامیوں سے بھی واقف ہو۔ اور ان سے جو بُرے نتائج نکلنے والے ہوں۔ اُن کا پہلے سے اندازہ کر کے سدِ باب کر سکے۔ غالبؔ جس خرد اور دانشوری کا مداح ہے۔ دُور بینی اور مآل اندیشی اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ اُس کی نظر کام کے ہر پہلو پر جاتی ہے۔ فقط ظاہری یا منطقیانہ یا سطحی پہلوؤں پر نہیں۔ جو لوگ اس صحیح سمجھ سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ وہ تسفیدی یا متساملانہ نقطۂ نظر سے گمراہ نہیں ہو جاتے۔ ان کی نظر کام کے عملی اور آخری نتائج پر ہے۔ اور وہ ان کا پورا دھیان رکھتے ہیں ؎

راہ زیں دیدہ وراں جُوئے کہ از دیدہ وری نقطۂ گرد در نظر آرند سویدا بینید
راہ زیں دیدہ وراں پُرس کہ در گرم روی جادۂ چوں نبض تپاں در تنِ صحرا بینید

جو لوگ فیضیؔ یا اقبالؔ کی طرح باقاعدہ منطقی یا فلسفی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنا ذہن ایک خاص طریقے پر استعمال کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی کوشش کا میدان قیاسی اصولوں تک محدود رہتا ہے۔ عملی دُنیا سے اسے گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ طریق کار عملاً بہت مفید نہیں رہتا۔ اور "جانکنے تعقل" سے جو بڑی بڑی امیدیں باندھی جاتی ہیں۔ وہ پوری نہیں ہوتیں۔ فیضیؔ اور اقبالؔ کے اشعار میں اس ناکامی کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ جو لوگ اپنی ذہنی کوششیں اس طریقہ تک محدود نہیں کرتے۔ اور "جانکنے تعقل" سے غیر معمولی توقعات بھی نہیں رکھتے۔ ان کا بھی عقل کے متعلق یہی نقطۂ نظر ہو۔

غالبؔ نے کیا ٹھیک کہا ہے ؎

چوں اصل کار در نظرِ ہمنشیں نبُود ‏ ‏ ‏ ‏ بیچارہ خندہ بر روشِ جستجو گرفت!

عہدِ اکبری کا ترجمان

فیضیؔ اور غالبؔ دونوں مغلیہ دربار کے شعرا تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ایک مغلیہ حکومت کے زمانۂ عروج کا ترجمان ہے۔ اور دوسرا اس کے زوال کا نوحہ خواں۔ دونوں کی شاعری اس اختلافِ حالات کا آئینہ ہے۔ غالبؔ کے اشعار میں مایوسی اور ناکامی کا اظہار بہت صاف ہے۔ اور فیضیؔ میں خوشی، خود اعتمادی، طمانیت، اور ناز و فخر کا جوش و خروش نمایاں ہے ؎

امشب کہ سپہر بے ملال است ‏ ‏ ‏ ‏ در طبعِ زمانہ اعتدال است

بر جبیں امید در نشاط است ‏ ‏ ‏ ‏ بہرام ہراس در د بال است

ہم گردنِ وصل سر بلند است ‏ ‏ ‏ ‏ ہم فرقِ فراق پائمال است

طاؤسِ جمال خوش خرام است ‏ ‏ ‏ ‏ عنقائے ہوس کشادہ بال است

فیضیؔ نبود خروش مارا

پیغام دل از زبانِ حال است

ایک اور پُر زور اور پُر معنی غزل ہے ؎

دہر را مژدہ کہ روزِ دگرے پیدا شد ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ز خورشید سحر خیز نرے پیدا شُد

خفتہ بختانِ شبِ تفرقہ بیدار شدند ‏ ‏ ‏ ‏ کہ در آفاق مُبارک سحرے پیدا شُد

آسماں دید شب و روز جہانگردیٔ او ‏ ‏ ‏ ‏ گفت خورشید مرا ہمسفرے پیدا شُد

اے کہ از نیرِ اقبال نظرے خواہی ‏ ‏ ‏ ‏ چشم بکشائے کہ صاحب نظرے پیدا شُد

نیست یک ذرّہ ز خورشید ضمیرش پنہاں ‏ ‏ ‏ ‏ ہمچو خورشید عجب دیدہ ورے پیدا شُد

گمرہانِ رہِ تقلید بحیرت بُودند　　شکر کیں قافلہ را راہبرے پیدا شُد

چند تاریک نشینی شبِ ہجراں فیضیؔ

خیز کز صبحِ سعادت اثرے پیدا شُد

بدایونی فیضیؔ کے اشعار کے متعلق کہتا ہے۔ کہ الفاظ کی استخوان بندی اچھی ہے لیکن درد اور اثر سے خالی ہیں۔ یوں تو فیضیؔ کے متعلق بدایونی کا اظہارِ خیال شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن کم از کم اس معاملے میں بدایونی کی رائے صحیح ہے۔ فیضیؔ کے اشعار میں زور اور جوش کی کمی نہیں۔ لیکن درد و اثر تھوڑا ہے۔

ہندوستانی شعرا (بالخصوص میر تقی میرؔ) کے کلام میں سوز و الم کی اس حد تک فراوانی ہے۔ کہ ایک شخص جس کا کلام حزنیہ عنصر سے خالی ہو۔ غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ شاعر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بیگانہ رہے۔ یا عمداً ان سے آنکھیں بند کرلے۔ فیضیؔ کے اشعار سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اس نے زندگی کو شاہی دربار کے جھروکوں سے دیکھا تھا۔ اور زندگی کی وہ تلخ حقیقتیں جن کا صحیح مطالعہ نظر کو گہرائی، دل کو گداختگی اور طبیعت کو توازن دے دیتا ہے اُس کی نظر سے دُور رہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسکے کلام میں وہ عمق اور تاثیر نہیں۔ جو غالب کے کلام میں ہے۔ جس نے زندگی کے تلخ اور خوشگوار، دونو پہلو دیکھے تھے۔ اور دونو کی صحیح ترجمانی کی تھی۔

اقبالؔ اور غالبؔ

مولٰینا حالیؔ نے جب ۱۸۹۷ء میں یادگارِ غالب لکھی۔ تو انہوں نے مرزا غالب کی نسبت نواب ضیاء الدین کا ایک قول نقل کیا۔ کہ "ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسروؔ) سے ہوئی۔ اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔" لیکن ادبی معاملات میں صحیح پیشینگوئی

کرنا بہت مشکل ہے۔ اور عین اس وقت جب مولینا حالی نے اس رائے کو نقل کیا۔ پنجاب کی سرزمین پر ایک نوجوان نشو و نما پا رہا تھا۔ جو اس پیشینگوئی کو آگے چل کر غلط ثابت کرنیوالا تھا۔

اقبال اور غالب میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ دونوں کی شخصیت کا بہترین اظہار ان کے فارسی کلام میں ہے۔ دونوں کو خدا نے زبردست دل و دماغ دیا تھا۔ اور رفعتِ تخیل دونوں کے اشعار کی خصوصیت ہے۔ دونوں کی طبیعت جدت پسند تھی اور دونوں عام روش سے ہٹکر چلنا پسند کرتے تھے۔ دونوں گہری سوچ کے عادی تھے۔ اور ان کے اشعار میں حکیمانہ عمق اشکال کی حد تک موجود ہے۔ دونوں مضامین کی خوبی کے مقابلے میں زبان اور محاورہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور دونوں نئی نسل کو خاص طور پر پسند ہیں +

اقبال اور غالب میں سطحی مشابہت اس حد تک نمایاں ہے۔ کہ سر عبدالقادر بانگِ درا کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا۔ تو ضرور کہتا۔ کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو و فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا۔ اس نے ان کی روح کو عدم میں بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا۔ کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں۔ دوبارہ جنم لیا۔ اور محمد اقبال نام پایا۔"

علامہ اقبال کے متعلق سر عبدالقادر کی رائے جس ادب اور احترام کی مستحق ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے۔ کہ انہوں نے سطحی مشابہتوں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ ہم نے ان میں سے چند مشابہتیں سطور مندرجہ بالا میں گنا دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ان ظاہری مشابہتوں کے باوجود غالب اور اقبال کی شخصیتیں بالکل مختلف ہیں۔ اور ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ دو قالبوں میں

ایک ہی رُوح تھے۔ صحیح نہیں +

اقبالؔ اور غالبؔ میں ایک ظاہری فرق تو فنّی اور ادبی ہے۔ دونوں مختلف ادبی فضاؤں میں پلے۔ اور دونوں نے مختلف ادبی روایات کا تتبع کیا۔ غالبؔ کے پیشِ نظر شاعرانہ اظہار کے ذرائع بہت محدود اور ناقص تھے۔ یعنی غزل اور قصیدہ یا زیادہ سے زیادہ مثنوی اور رُباعی۔ شاعرانہ مضامین کا میدان اس سے بھی تنگ تھا۔ قدیم زمانے سے شعرا ایک تنگ دائرے میں شعر گوئی کرتے آئے تھے۔ اور اس سے باہر نکلنا کفر تھا۔ اگر کوئی جدّت پسند شاعر عام روش سے ہٹنا چاہتا۔ تو نہ اسکے سامنے کوئی صحیح نمونہ تھا۔ نہ شاعرانہ خوبیاں پرکھنے کے لیے کوئی صحیح معیار۔ نتیجہ یہ کہ مروجہ اسلوبِ شاعری ترک کرنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا۔ اور شاعر کسی مہمل بلکہ مضر انفرادیت (مثلاً طرزِ بیدلؔ یا ریختی) میں گرفتار ہو جاتا +

اقبالؔ اس معاملے میں بڑے خوش قسمت تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ السنۂ شرقیہ کے علاوہ مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی اور جرمن کے بہترین شعرا کے نمونے اُن کے سامنے موجود تھے۔ نئے اصنافِ شاعری اور نئے خیالات کے خلاف جو تعصب تھا۔ اُسے بہت حد تک حالیؔ اور کسی حد تک غالبؔ نے کم کر دیا تھا۔ اور اقبالؔ کو اس معاملے میں بڑی آزادی تھی ؎

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت　　منتے بر قدمِ راہ روانست مرا!

نتیجہ یہ کہ ان کے کلام میں مشرق اور مغرب کی بہترین خصوصیات ہیں مضامین میں بے حد تنوع اور شگفتگی ہے۔ اصنافِ شاعری میں بھی ان کے وسیع مطالعہ کا اثر نمایاں ہے۔ ؔپیامِ مشرق میں کئی ایسی شاعرانہ طرزیں ہیں۔ جو قدیم مشرقی شاعری میں معدوم ہیں۔ اور جنہیں شاعر نے مغربی یا جدید ایرانی شاعری سے اخذ کیا +

اقبال اور غالب کے مختلف حالات اور ماحول کی وجہ سے مندرجہ بالا اختلافات کا ہونا تو قدرتی امر تھا لیکن ان کے علاوہ دونوں میں ایسے اختلافات بھی تھے۔ جن کا سبب اتفاقی اثرات نہ تھے۔ مرزا غالب کی اقبال کی طرح مغربی ادبیات تک رسائی نہ تھی لیکن تمام فارسی شعرا کا کلام انکے سامنے تھا۔ اور انہوں نے اس سے بالخصوص ہندوستان کے فارسی شعرا سے کسب فیض کیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ انہوں نے فارسی کے سب سے بڑے شاعر کی کماحقہ قدر نہیں کی۔ اور اسکی خوبیوں کو نہیں پہچانا۔ حافظ کا ذکر غالب کے کلام میں چار پانچ جگہ آیا ہے لیکن سوائے ایک دو دفعہ کے بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ ان کے دل میں حافظ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

غالبم تشنہ تلخاب نہ ہمچو حافظ مائل شاخ نباتم نہ نہ ناہا یا ہو

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

آنکہ پندارند حافظ بودہ است غالب آشفتہ بود آں نیز ہم

حقیقت یہ ہے کہ فارسی شعرا بالخصوص متغزلین میں فقط حافظ ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری ایک خاص ملک یا خاص طرز شاعری کے شائقین کے لئے نہیں۔ بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے۔ اس کے اشعار میں انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا بیان ہے۔ زلف و خال اور گل و بلبل کا ذکر فقط اس قدر ہے۔ جس قدر ملح فی الطعام۔ اس کے علاوہ حافظ کی زبان عین شاعری کی زبان ہے۔ اشکال الجھنوں اور تکیہ کلاموں سے پاک۔ چاہئے تو تھا۔ کہ غالب اس کی خوبیاں سمجھتے۔ اور اس کا رنگ اختیار کرتے۔ لیکن غالب نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہاں بیدل اور عرفی اور حزیں مقبول تھے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کی روایات دور اکبری کے بعد قائم ہوئیں۔ اور اس وقت فغانی کے زیر اثر ہندوستان بلکہ ایران میں بھی مشکل گوئی اور

مضمون آفرینی کا رواج تھا۔ غالب نے اسی رنگ کا تتبع کیا۔ اور اگرچہ انہوں نے بیدل کی پیروی ترک کر دی لیکن پھر بھی انہوں نے جن شعرا کی پیروی کی۔ وہ سعدی اور حافظ کی نسبت فغانی شیرازی سے قریب تھے۔ اقبال نے حافظ کے فلسفۂ زندگی پر تنقید کی ہے۔ لیکن زبان اور طرزِ ادا کے معاملے میں انہوں نے حافظ کی پیروی کی ہے۔ اور اُن کی بہترین غزلوں میں حافظ کی سہل ممتنع شیرینی۔ سادگی اور دلآویزی ہے۔

شاعری کے متعلق دونوں کا نقطۂ نظر

اس اختلاف کے علاوہ غالب اور اقبال میں ایک اہم اختلاف فنِ شاعری کے متعلق نقطۂ نظر میں ہے۔ غالب کے لئے شعر گوئی محض دل لگی یا جودتِ طبع کا اظہار نہ تھی۔ وہ اسے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہ بھی ایک اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔

"ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بودم..... مرا بداں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است"

غالب کا شاعرانہ مطمحِ نظر بلند تھا۔ لیکن اقبال کا مطمحِ نظر ان کی نسبت بدرجہا بلند اور عام شاعروں کے نقطۂ نظر سے اصولاً مختلف تھا۔ انہوں نے "شمع اور شاعر" کی تصنیف (فروری ۱۹۱۲ء) کے بعد فنِ شاعری کو بطور شاعری کے نہیں بلکہ "جزوے از پیغمبری" سمجھ کر اختیار کیا ہے ؎

کہہ گئے ہیں شاعری "جزویست از پیغمبری"
ہاں سُنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

اور ؎

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے　　زندہ کر دے سوزِ دل کو جوہرِ گفتار سے

انہیں اس بات سے سخت نفرت ہے۔ کہ کوئی انہیں محض "شاعر" کہے ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست | کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست!
بکوئے دلبراں کارے ندارم | دلِ زارے غمِ یارے ندارم
نہ خاکِ من غبارِ رہگزارے | نہ در خاکم دلِ بے اختیارے
بجبریل امیں ہمداستانم | رقیب و قاصد و درباں ندانم

اقبال اور غالب کے درمیان یہ ایک بڑا اصولی فرق ہے۔ غالب محض شاعر تھا۔ اس نے اقبال کی طرح اپنے پیغام سے ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسکے علاوہ اس نے عام شعرا کی طرح اپنے دل کی داستان بیان کی ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا ؎

بکوئے دلبراں کارے ندارم | دلِ زارے غمِ یارے ندارم

اس کی شاعری کا بیشتر حصہ محبت اور اس کی گوناگوں کیفیتِ دل کا بیان ہے اور اسے "رقیب و قاصد و درباں" کی شناسائی سے کوئی عار نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے بہترین لمحوں میں "جبریل امیں" کے ساتھ ہمداستاں ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ذہنِ رسا اس سرزمین سے ناواقف نہیں جہاں شاعری اور فلسفہ اور مذہب کی حدیں مل جاتی ہیں۔ لیکن وہ اس سرزمین کی نسبت عام انسانی دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہے۔ اور وہ زیادہ انہیں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں بیشتر عام انسانی خواہشوں، امنگوں اور مایوسیوں کا ذکر ہے۔ اور ان کی نسبت اس کی واقفیت اقبال سے زیادہ گہری اور صحیح ہے۔

اقبال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اس دنیا کے غم و الم اور اس کی پیچیدگیوں سے ناواقف نہیں۔ لیکن انسان اور انسانی مسائل کی نسبت ان کا نقطۂ نظر فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ یا نفسیاتی نہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کی بنیادی خوبیوں اور خامیوں سے

واقف ہیں لیکن زندہ افراد سے اور ان کی گوناگوں بشری حماقتوں اور الجھنوں اور مصیبتوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ انسانی بستی پر نظر ڈالتے ہیں لیکن اتنی بلندی سے کہ انہیں اس بستی کے رہنے والوں کے خد و خال نظر نہیں آتے۔ انہیں اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد دنیا اور دنیا کے رہنے والوں کی ترجمانی نہیں سہ

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

ان کا مقصد تو اپنے تخیل کی مدد سے ایک ایسی بلند تر حقیقت کا بیان ہے۔ جس کی کشش سے متاثر ہو کر اُن کے پیرو اس دنیا میں ایک جہانِ تازہ کی بنیاد ڈال دیں سہ

آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود — رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود
حورِ او از حورِ جنت خوشتر است — منکر لات و مناتش کافر است
آفریند کائناتِ دیگرے — قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

غالب اور اقبال کے درمیان بڑا فرق بہت حد تک تو اس اختلافِ مقاصد کی وجہ سے ہے لیکن اس میں اختلافِ طبائع اور مختلف تعلیم و تربیت کو بھی بڑا دخل ہے۔ اقبال فلسفی تھے۔ اور مرزا محض شاعر۔ اقبال کے پیشِ نظر زیادہ تر وہی مسائل تھے۔ جن سے فلسفیوں کو دلچسپی ہے۔ اور مرزا کے اشعار میں بیشتر وہ مضامین ہیں۔ جو مشرقی شعرا کو مرغوب ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال حقائق و واقعات کو بلند حکیمانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے اور مرزا ذاتی جذبات اور احساسات کی روشنی میں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا اپنے فکرِ فلک پیما کی مدد سے ان مسائل پر بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ جو فلسفیوں کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اور ان کی زیادہ توجہ روزمرہ کے عام بشری مسائل پر ہی رہتی۔ اس کے برعکس اگرچہ اقبال

گاہے گاہے "جہانِ درد منداں" کے غم و مصائب کا بھی ذکر کر لیتے تھے۔ لیکن بیشتر ان کا طائرِ فکر حکمت اور فلسفہ کی ان بلندیوں پر ہی گرمِ پرواز رہتا۔ جہاں سے یہ جہان ایک دُھندلا سا ستارہ نظر آتا تھا۔

بہشت

اقبال اور غالب کے طرزِ شاعری میں جو فرق ہے۔ اُس کی ایک دلچسپ مثال اُن کے وہ اشعار ہیں۔ جو انہوں نے بہشت کے متعلق لکھے ہیں۔ بہشت کے متعلق رسمی نقطۂ نظر تو یہی ہے۔ کہ اسے تمام خوبیوں اور آسائشوں کا مخزن سمجھا جائے لیکن شوخ اور جدت پسند طبیعتیں اس میں بھی عیب نکال سکتی ہیں۔ بیدل نے کہا تھا ؎

گویند بہشت است و ہمہ راحتِ جاوید — جائیکہ بداغے نہ تپد دل چہ مقام است

غالب اور اقبال دونوں نے اس معاملہ میں رواجی نقطۂ نظر سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ اور بہشت کی نسبت اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ بظاہر تو اس اظہارِ رائے میں دونوں ہمخیال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دونوں مطمئن نہیں۔ لیکن اس ہمخیالی میں بھی دونوں کا اختلافِ طبائع نمایاں ہو گیا ہے۔ اقبال کی مایوسی ایک فلسفی کی مایوسی ہے۔ اور غالب کی مایوسی ایک عاشق مزاج شاعر کی۔

اقبال لکھتے ہیں ؎

کجا ایں روزگارِ شیشہ بازے — بہشت ایں گنبدِ گرداں ندارد
ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او — زلیخائش دلِ نالاں ندارد
خلیلِ او حریفِ آتشے نیست — کلیمش یک شرر در جاں ندارد
بہ صرصر در نیفتد زورقِ او — خطر از لطمۂ طوفاں ندارد
یقیں را در کمیں بوکِ مگر نیست — وصال اندیشۂ ہجراں ندارد

کُجا آں لذتِ عقلِ غلط سیر — اگر منزل رہِ پیچاں ندارد
مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد!

مرزا غالب لکھتے ہیں ؎

دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائشِ شورشِ نائے و نوش
سیہ مستئ ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ — غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ انیش کجا — فریبد بسوگند و بینش کجا
بُرد حکم و نبود لبش تلخ گو — دہد کام و نبود دلش کامجو
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مندِ دلالۂ — نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ می‌خواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل!

مرزا کی شوخی کسی حد تک ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی ان اشعار میں شخصی احساسات کا جو اظہار ہے۔ وہ اقبال کے اشعار میں نہیں۔ اور اقبال کا قطعہ ان کے مقابلے میں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال اور غالب کا فلسفۂ زندگی

اقبال اور غالب کے درمیان ایک اور اہم فرق فلسفۂ زندگی کے متعلق ہے۔ غالب کی نسبت

ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اس کے اشعار میں غم کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ ہم غالب کو قنوطی شاعر نہیں کہہ سکتے (اور زندگی کے متعلق غالب کا قنوطی یا رجائی کوئی بھی معین فلسفہ نہ تھا) تاہم مرزا کے اشعار انکے دلی جذبات کا اظہار ہیں۔ اور جن مایوسیوں اور ناکامیوں سے انہیں سابقہ پڑا۔ ان کا اظہار ان اشعار میں صاف صاف آگیا ہے۔ اقبال کا معاملہ اس بارے میں بالکل مختلف تھا۔ زندگی کے متعلق ان کا ایک معین فلسفہ تھا۔ رجائی — اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ مشرقی شعرا کے المیہ مضامین سے انہیں نفرت تھی۔ وہ اسرارِ خودی میں ان شعرا کی نسبت لکھتے ہیں ؎

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش — کلفتِ آہے متاعِ خانہ اش
سرخوش از دریوزہ میخانہ ہا — جلوہ دزدِ روزنِ کاشانہ ہا
ناخوشے افسردۂ آزردۂ — از لگد کوبِ نگہباں مردۂ
از غماں مانندِ نے کاہیدۂ — وز فلک صد شکوہ بر لب چیدۂ
پست بخت و زیر دست و دوں نہاد — ناسزا و نا امید و نامراد
شیونش از جانِ تو سرمایہ برد — لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ برد

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

لیکن اقبال کی نسبت یہ عام خیال کہ ان کی شاعری میں غم کا عنصر یا زندگی کی مشکلات کا بیان سراسر مفقود ہے۔ غلط ہے۔ اقبال کا زندگی کے متعلق یہ نقطۂ نظر نہ تھا۔ کہ یہ غموں اور دکھوں سے خالی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے۔ کہ انسانی زندگی میں غم و الم کا بھی حصہ ہے۔ اور جو انسان شخصی ارتقا کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ اسے تو مشکلات اور مایوسیوں سے

خاص طور پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اقبال کہتے تھے۔ کہ زندگی کا لطف ہی ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ہے۔ زندگی میں مشکلیں اور الجھنیں ضرور ہیں۔ لیکن ان کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اپنی تگ ودو برابر جاری رکھنی چاہیئے ؎

از من حکایتِ سفرِ زندگی مپرس
در ساختم بدرد وگزشتم غزل سرائے!

اقبال کے کلام میں کئی پراثر اشعار ہیں۔ جن میں حکیمانہ تاسف کا اظہار ہے۔ پیامِ مشرق میں کہتے ہیں ؎

سحر می گفت بلبل باغباں را | دریں گل جز نہالِ غم نہ ریزد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں | ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

زبورِ عجم میں ارشاد ہوتا ہے ؎

در بنگہِ فقیر و بکاشانۂ امیر | غمہا کہ پشت را بجوانی کند دوتائے

ایک اور غزل کے دو اشعار ہیں ؎

شنارا بادۂ ہر جام کردند | چہ بیدردانہ اورا عام کردند
تماشا گاہِ مرگِ ناگہاں را | جہانِ ماہ و انجم نام کردند

ایک بلند پایہ غزل میں 'کسی' سے خطاب ہے ؎

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری | تب و تابِ ما شناسی؟ دل بیقرار داری؟
چہ خبر ترا از اشکے کہ فرو چکد ز چشمے | تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری؟
چہ بگویمت ز جانے کہ نفس نفس شمارد | دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری؟

اقبال کے بعض نوجوان مداحوں کا خیال ہے۔ کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذکر کرنا یا ان سے واقف ہونا عیب ہے۔ ان کے نزدیک سوائے عمل اور جدوجہد کی تلقین اور

امید افزا فلسفہ کے شاعر کو کسی چیز سے سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ حضرات اس نقطۂ نظر کو واقعات کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ورنہ وہ دیکھتے کہ جو لوگ زندگی کے فقط خوشگوار پہلوؤں سے آشنا رہنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا میں کوئی قابل ذکر عملی کام نہیں کر سکتے۔ جب تک وہ اپنے خیلات یا خیالی فلسفہ کے نشہ میں مست رہتے ہیں۔ تب تک تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جونہی وہ خیالات سے گذر کر کوئی عملی کام شروع کرتے ہیں۔ اور انہیں کسی مایوسی یا وقتی ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو چونکہ وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتے وہ اس کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور جلد ہی ہمت ہار دیتے ہیں۔ اسکے برخلاف جو لوگ زندگی کے تاریک پہلو سے بھی واقف ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ کہ اس اہم عملی کام کرنے میں بسا اوقات مشکلات اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی کوششوں میں ایک طرح کا توازن ہوتا ہے۔ وہ ان مشکلات اور ناکامیوں کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اور ان کے سامنے بے بس نہیں ہو جاتے۔ اقبال اس قسم کی کھوکھلی رجائیت سے جو ان کے بعض نوجوان مداحوں کو پسند ہے۔ اور جس کی بنیاد محض انسانی زندگی سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بہت خلاف تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اس سے انسانی روح کی ارتقائی کوششوں میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں ؎

لذتِ تلخاب من بے جانِ غم فرسودنے!

زندگی کی مشکلات اور مصیبتوں کی نسبت مرزا کا نقطۂ نظر بھی کسی کم ہمتی یا فرومائگی پر مبنی نہیں۔ ان کا شروع سے ہی خیال تھا۔ کہ مشکلات سے انسان کو سبق سیکھنا چاہیئے۔ اور ان سے اپنی اصلاح میں مدد لینی چاہیئے۔ ایک ابتدائی فارسی قصیدے کی تشبیب ہے ؎

تو اے ستارہ ندانی کہ رنجم از آزار　　تو اے سپہر نسنجی کہ ترسم از بیداد

نراغمیست بسرمایۂ گرانیٔ کوہ مرادمیست بہ نیروئے تیشۂ فرہاد
من و بلائے تو نظیٔ ادیم و تابِ سہیل من و جفائے تو شاگرد و سیلئے اُستاد
من و ستم دلِ رنجور و التفاتِ طبیب من و خطرِ رگِ مجنوں و نشترِ فصّاد

ایک اور فارسی شعر ہے ؎

شود روانیٔ طبعم فزوں ز سختیٔ دہر
بسنگ تیز تواں کرد تیغِ بُرّاں را

مرزا نے مشکلات کا مردانہ وار اور بڑی ہمت سے مقابلہ کیا ؎

می ستیزم با قضا از دیر باز خویش را بر تیغ عریاں مے زنم
لعب با شمشیر و خنجر میکنم بوسہ بر ساطورِ دیگاں مے زنم

لیکن انہیں تلخ تجربے نے سکھا دیا تھا۔ کہ سب مشکلات انسانی لبس کی نہیں ہوتیں۔ اور زندگی میں کئی ایسے مرحلے آجاتے ہیں۔ جہاں قضا و قدر کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ انہوں نے دہلی کے قید خانے میں جو ترکیب بند لکھا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود

ایک اور فارسی شعر میں اسی طرح کے کسی اور مایوسی لمحے کا اظہار ہے ؎

نتواں کرد با فلک پرخاش خردِ خُردہ داں نمی خواہم

غالب کو اس طرح کے تلخ لمحے بہت سے دیکھنے پڑے۔ اور ان کے بیان کی وجہ سے ان کے اشعار میں حزن و الم اور مایوسی کا اظہار کثرت سے ہے +

اقبال کی نسبت یہ تو نہیں کہا جاسکتا۔ کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں شگفتگی اور

زندہ دلی کا عنصر مرزا سے زیادہ تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ کہ وہ اپنے اشعار میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہوتے ہُوئے بھی ارادتاً ان کی شکایت نہیں کرتے۔ زبورِ عجم میں کئی اشعار ہیں۔ جن سے ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے ؎

نشناخت مقامِ خویش افتاد بدامِ خویش　　عشقے کہ نمودے خواست از شورشِ یاربہا
آہے کہ ز دل خیزد از بہرِ جگرسوزی است　　در سینہ شکن اورا آلودہ مکن لب ہا

لب فرو بند از فغاں در ساز با دردِ فراق　　عشق تا آہے کشد از جذبِ خویش آگاہ نیست

دی مغبچۂ با من اسرارِ محبت گفت　　اشکے کہ فرو خوردی از بادۂ گلگوں بہ

اور ؎
باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست![1]

اقبال اور غالب کا مطمحِ نظر

علامہ اقبالؔ کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ ان کا مقصد سرزمینِ مشرق میں ایک ذہنی اور روحانی انقلاب پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام شاعرانہ قوتیں اس امر کے لئے وقف رکھیں۔ کہ وہ اپنے سامعین کو ایک بلند تر روحانی نظام کی طرف بُلائیں۔ اُن کی روحانی اور ذہنی کوتاہیوں،

---

[1] مرزا غالبؔ نے بھی بعض اشعار میں اس اصول کی تعریف کی ہے ؎

بینش بہ سعیِ ضبطِ جنوں نوبہار تر　　دل در گدازِ نالہ بہ نگاہ آبیار تر

؎ بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیِ گوہر　　وگر نہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے

لیکن یہ سب ابتدائی زمانے کے اشعار ہیں۔ جب ان پر مصیبتوں کے پہاڑ نہیں ٹوٹے تھے!

ان کے جمود و بے حسی، مایوسی اور پست ہمتی کا ازالہ کریں۔ اور انہیں عمل اور جد و جہد کی خواہش سے سرشار کر کے اس روحانی سربلندی تک پہنچا دیں۔ جہاں وہ "خلیفۂ الٰہی" کے خطاب کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے اپنے اشعار میں کئی جگہ ان لوگوں کے جنہیں یہ سربلندی حاصل ہے، اوصاف بیان کئے ہیں۔ زبورِ عجم کی ایک غزل ہے ؎

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند — ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بخلوت اند و کمندے بہ مہر و ماہ پیچند — بجلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر — بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند
نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند — ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند!

غالب کا اقبال کی طرح شاعری کے متعلق کوئی خاص "پیغمبرانہ" نقطۂ نظر نہ تھا لیکن انہوں نے بھی اپنے ایک فارسی قصیدے میں ان ہستیوں کی تعریف کی ہے۔ جن کی ان کے دل میں قدر و منزلت ہے۔ ہم نے ارمغانِ غالب میں ان اشعار کو سالکانِ طریقت کے عنوان سے انتخاب کیا ہے ؎

رہرواں چوں گہر از آبلۂ پا بینند
پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند

مذکورہ بالا اشعار خاص غور و فکر کے مستحق ہیں۔ کیونکہ وہ غالب اور اقبال کے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ اقبال کی نظروں میں مقبول بندوں کی سب سے بڑی خصوصیت اس دنیا میں ایک نظامِ تازہ کا قیام ہے ؎

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا — وز ہماں آب و گِل ایجادِ جہاں نیز کنند
اور ؎ عاشق آنست کہ تعمیر کند عالمِ خویش — در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ رزم و بزم اور خلوت وجلوت میں حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ اور دونوں میں ہی اپنی امتیازی شان برقرار رکھتے ہیں۔ اقبال نے اس روشِ ہمہ گیری کی اور بھی کئی جگہ تعریف کی ہے ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اور ؎　در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح　　در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

ان پاک بندوں کی تیسری خصوصیت سادگی اور اَقلّل مِن الدنیا کے اصول کی پیروی ہے۔ روئے زمین کے بادشاہ ان کے زیرِ نگیں ہیں۔ لیکن وہ خود خرقہ پہنتے ہیں۔ اور قلندرانہ زندگی بسر کرتے ہیں ؎

ع　ز شاہ باج ستانند و خرقہ مے پوشند

غالب نے اپنے اشعار میں جن بندگان [illegible] بڑی خصوصیت خبر یعنی مآل اندیشی اور صحیح سمجھ ہے۔ وہ ایک واقعہ کو دیکھ کر اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے تمام نتائج کا اندازہ کر لیتے ہیں ؎

شررے را کہ بنا گاہ بدر خواہد جست　　زخمہ کردار بنا بر رگِ خارا بینند

قطرہ را کہ بر آئینہ گہر خواہد بست　　صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

ان کی دوسری بڑی خصوصیت دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے اور ان کے ساتھ رواداری برتنے کی قابلیت ہے۔ وہ تمام طریقوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ کسی ایک پر ناک بھوں نہیں چڑھاتے ؎

ہر چہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند　　ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند　　نخروشند اگر محمل لیلیٰ بینند

قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند   بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند

چونکہ انہیں تمام طریقوں سے پوری پوری واقفیت ہے۔ اس لئے وہ کسی ایک کی مخالفت نہیں کرتے۔ اور دنیا کی تمام چیزیں انہیں اچھی ہی نظر آتی ہیں ؎

راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند   نقشِ کج بر ورقِ شہپرِ عنقا بینند

ان کی تیسری خصوصیت جود و عطا اور دوسروں سے نیکی کرنے کا شوق ہے ؎

خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند   خویش را چوں بسر مائدہ تنہا بینند

وہ دنیا سے اپنا دل نہیں لگاتے۔ اور اسکے واقعات کو بطور ایک تماشائی کو دیکھتے ہیں ؎

دل نہ بندند بہ نیرنگ درین دیر دو رنگ   ہر چہ بینند بعنوان تماشا بینند

لیکن پھر بھی وہ دنیا کی دلآویزیاں اور اس کی کشش خوب سمجھتے ہیں ؎

بُرَدا ز یاد کہ دنیا ست نمودِ بے بود   ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

مندرجہ بالا اشعار پر کسی طویل تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ان میں اقبال اور غالب کے مختلف مطمحِ نظر بڑی وضاحت اور دلآویزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور چونکہ دونوں میں بڑی عظمت اور شانِ محبوبی ہے۔ اس لئے اہلِ نظر دونوں سے محظوظ اور فیضیاب ہوں گے۔ لیکن غالب کی نسبت ہم کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اس کا مطمحِ نظر دیکھتے ہوئے۔ اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔ کہ جن خوبیوں اور خاصیتوں کی اس کے دل میں قدر تھی انہیں بڑی حد تک اس نے خود اپنی ذات میں اخذ کر لیا تھا۔ اور دوسرے ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ اس کے اشعار ایک مدحیہ قصیدے سے ماخوذ ہیں۔ جب ہم قدیم شاعری کی تنگ دامانی کا خیال کرتے ہیں۔ تو کیا ہمیں اس شاعر کے ذہنِ رسا اور طبعِ بلند کی داد نہیں دینی چاہیئے۔ جس نے ان پابندیوں کے باوجود اپنی شاعری کو ان حقائق کا ترجمان بنا لیا۔ جو فلسفہ

اور اخلاق اور مذہب کی معراج ہیں۔ اور 'محض شاعر' ہونے کے باوجود 'پیغمبرانہ' خوبیاں اخذ کرلیں +

غالب کی واقعیت پسندی

اقبال کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اس نے قصداً زندگی کی تلخ حقیقتوں کو تفصیل سے بیان نہیں کیا فی نفسہ تو یہ ایک خوبی ہے۔ لیکن اس کے ایک دو مضر نتیجے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ اقبال کے بعض نوجوان مداحوں نے اس کے اشعار سے جو رجائیت اخذ کی ہے وہ کھوکھلی اور نقصان دہ ہے۔ درحقیقت اس کھوکھلی رجائیت کا باعث تو ان نوجوانوں کی اپنی سطحیت اور زندگی کے نشیب و فراز سے ناواقفیت ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ کہ چونکہ اقبال کے کلام میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذکر بہت تھوڑا ہے۔ اس لئے اس کو بادی النظر سے مطالعہ کرتے وقت یہ خیال ہونا بھی ایک قدرتی امر ہے کہ زندگی میں تلخ حقیقتوں کی تعداد ہی تھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں۔ جن میں انسان کی ارتقائی کوششوں کا ذکر بڑی سہل انگاری سے ہوا ہے۔ اور جن سے یہ غلط خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ انسانی ارتقا کی انتہائی منزلیں طے کرنا کوئی کٹھن کام نہیں۔ ع جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است

مرزا غالب کا کلام اس نقص سے بری ہے۔ اس میں زندگی کی زیادہ مکمل اور زیادہ صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اور انسانی زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کا بھی پوری طرح ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ مرزا کو اپنی زندگی میں بہت سی مایوسیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس لئے جب وہ اپنے اولوالعزمانہ ارادوں کا ذکر کرتے تب بھی وہ جوش میں آپے سے باہر نہ ہو جاتے۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے   یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

غالب نے بھی ایک شعر میں قریب قریب یہی خیال نظم کیا ہے۔ اور عملی بلند ہمتی اس میں بھی کوئی کمی نہیں۔ لیکن حقیقت پسندی اس میں اقبال کے شعر سے زیادہ ہے ؎

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال
گفتمش کوششِ من در طلبش گفت رواست

جہاں تک عملی بلند ہمتی، جرأت اور جد و جہد کا تعلق ہے۔ مرزا غالب اقبال سے پیچھے نہ تھے۔ ان کا اپنا شاعرانہ ارتقا ہی اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اور ان کے اشعار میں بھی کئی جگہ اس کا اظہار ہے۔ ایک شوخی سے بھرا ہوا اردو شعر ہے ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ایک فارسی مثنوی میں جو بڑی مایوسی اور کرب و بے چینی کے زمانے میں لکھی گئی۔ انہوں نے اپنی گزشتہ زندگی کا محاسبہ کر کے اس بات پر افسوس کیا ہے۔ کہ ان کی زندگی کا بہترین حصّہ کچھ تو "متاعِ شیوۂ بتاں" کی خاطر تلف ہوا۔ اور کچھ جائداد کی ہوس میں ضائع ہوا۔ اس مثنوی میں سروش کی آواز انہیں سنائی دیتی ہے ؎

خیز و چو منصور نوائے بزن   ہستیِ خود را سرِ پائے بزن
ساقیِ ہمت کہ صلا مے دہد   بادہ ز خمخانۂ لا مے دہد
ہمت اگر بال کشائی کند   صعوہ تواند کہ ہمائی کند
نیّرِ توفیق اگر بر دمد   لالہ عجب نیست کز اخگر دمد!

مرزا غالب کا اپنا عمل تو اسی نصیحت پر تھا۔ جو سروش نے انہیں دی لیکن انہیں زندگی میں جن تلخ کامیوں سے واسطہ پڑا اُس نے ان کے ولولے سرد کر دیے۔ اور اگرچہ

بھی انہوں نے اپنی جدوجہد برقرار رکھی۔ لیکن ناموافق حالات کا بھی انہیں پورا احساس تھا۔ اور ان کی شرح انہوں نے اپنے اشعار میں کی۔ ایک فارسی شعر میں اپنی نسبت کہتے ہیں ؎

بوادئے کہ دراں خضر را عصا خفت است
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

ان کا اب یہ عملی نقطۂ نظر ہو گیا۔ کہ انتہائی کامیابی اور عروج کے جو خواب دیکھتے تھے۔ ان کا پورا ہونا تو قضا و قدر پر منحصر ہے لیکن اپنی طرف سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ اور اپنی بساط کے مطابق اصلاحی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ ایک نہایت بلند پایہ فارسی شعر ہے ؎

طور و نخلِ طور نبود گرچہ در خیمہ گاہِ خویش
ہر کس افروزد چراغے چوں شبِ تارے رسد!

غالب اور اقبال میں ایک اہم فرق

اقبال اور غالب میں ایک لطیف لیکن اہم فرق یہ ہے۔ کہ اقبال کے کلام میں انسانی ارتقا کی کئی ایسی منزلوں کا بیان ہے۔ جو شاعر کے ذاتی تجربے سے بالا تھیں اور جن کا احساس اسے محض بطور ایک مفکر کے ہوا۔ اقبال ایک فلسفی تھا جس نے خودی کی نشوونما کے تمام طریقوں اور پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ اور وہ تمام طریقے جو حصول مقصد کے لئے مفید نظر آئے اُن کی اپنے اشعار میں تعریف کر دی۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ اُن تمام طریقوں کا اسے ذاتی تجربہ ہو۔ بعض طریقوں کا اسے خود تجربہ ہو گا بعض اس نے دوسرے ذرائع (مثلاً نیٹشے۔ رومی) سے اخذ کئے۔ اور بعض کی تشکیل میں تخیل کو دخل تھا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اسے ان سب طریقوں کا قوی احساس ہو گا۔ ورنہ وہ انہیں اس خوبی سے نظم نہ کر سکتا۔ لیکن اقبال کی بعض تعلیمات اور خیالی تصویروں اور اس کی اپنی زندگی میں اتنا بُعد تھا۔ کہ ان

تخیلات اور خیالی تصویروں کو "آپ بیتی" نہیں کہا جاسکتا۔

مرزا کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ اُن کے کلام میں بیشتر انہی کیفیتوں اور روحانی مرحلوں کا بیان ہے۔ جن کا تجربہ انہیں خود بطور ایک انسان کے ہوا۔ اُن کے کلام اور ان کی اپنی شخصیت میں وہ بُعد ہرگز نہیں۔ جو اقبال کے کلام اور اقبال کی شخصیت میں ہے۔ ان کا کلام ان کی اپنی آپ بیتی ہے۔ انہوں نے اقبال کی طرح ایک بلند تر روحانی نظام پیش کرنا اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا۔ بلکہ جن جذباتی کیفیتوں اور روحانی منزلوں سے انہیں سابقہ پڑا۔ ان کو اپنے اشعار میں نظم کر دیا۔ مرزا کی اس خصوصیت کا اندازہ نہ صرف ان کی شخصیت اور ان کے کلام کے موازنہ سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ مرزا نے بڑی صاف گوئی سے ان روحانی خوبیوں سے انکار کر دیا۔ جن سے وہ محروم تھے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعۂ نظیری را　　کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

معترضین جب ان لن ترانیوں کا شاعر کی اپنی زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو انہیں قرآن مجید کی سورۂ شعرا یاد آجاتی ہے۔ جس میں شعرا کا بڑا عیب یہ بتایا گیا ہے۔ کہ وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں لیکن مرزا اس نقص سے بہت حد تک بری ہیں۔ وہ گفتار اور کردار اور خیال اور عمل کو ہم آہنگ کرنے پر بڑا زور دیتے ہیں ؎

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گو　　گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود!

جو منزلیں ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان کی نسبت وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں ؎

پایۂ من فروتر افتاده است　　سر خود بر سناں نمے خواہم!!

ایک اور شعر ہے ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم زعصیاں مے زنم

مرزا کے کلام کی یہ خصوصیت فنی نقطۂ نظر سے ایک خوبی ہے۔ چونکہ مرزا کا کلام ذاتی احساسات اور تجربہ کا بیان ہے۔ اسلئے ان کا طرزِ بیان زیادہ موثر ہے۔ اور چونکہ اسمیں عام بشری تجربوں اور مشاہدوں کا ذکر ہے۔ اس لئے عام لوگ بھی انہیں پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ غالب اقبال کی نسبت زیادہ مقبول ہے۔ لیکن ارتقائی نقطۂ نظر سے یہ خصوصیت ایک خامی بھی ہے۔ علامہ اقبال نے قصداً اپنے اشعار میں روزمرہ کی بشری زندگی کی بجائے ایک بلند تر روحانی نظام کی تصویر پیش کی تھی ۔

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند   چہ آید زاں غزلخوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

انہوں نے جس بلند تر روحانی نظام کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ وہ ہمارے بلکہ شاید شاعر کے اپنے ذاتی تجربے سے بالاتر سہی لیکن کیا عجب ہے۔ کہ مستقبل میں کوئی اللہ کا مقبول بندہ اس تصویر سے متاثر ہو کر اس نظام کو خیالی دنیا سے واقعات کی دنیا میں لے آئے۔ اور اقبال نے جو شاندار خواب دیکھا ہے۔ وہ پورا ہو جائے !!

غالب اور وطنیت

مرزا کے چند مداحوں نے انکے اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ بڑے محبِ وطن تھے۔ حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور انکے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط اندازے پر مبنی ہے۔ مرزا بقولِ خود شہد کی مکھی نہ تھے۔ بلکہ مصری کی مکھی تھے۔ اور ان کی طبیعت کا تمام رجحان خیال پرستی نہیں بلکہ واقعیت پسندی کی طرف تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا۔ کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اسکے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو۔ تو مرزا نے فوراً ملکہ وکٹوریہ کی

خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کردیں۔ کہ شام و روم کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں۔ مجھے کیوں نہ "کوئین پوئٹ"[1] گنا جائے۔

مرزا معاملہ فہم تھے۔ اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کی وابستگی کبھی اتنی گہری نہیں ہوئی۔ کہ وہ اسکی بربادی سے بے قرار ہوجاتے۔ اور اگر ایسا ہوتا بھی تو مرزا اپنے سوا کس کو اسقدر اہم سمجھتے تھے۔ کہ اس کے لئے آنسو بہاتے؟

مرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ کئی انگریزوں کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ "اسٹرلنگ" کے مرجانے کے بعد اُنہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے۔ اسے کسی طرح رسمی یا خودغرضانہ نہیں کہا جاسکتا۔ میجر جان جاکوب کے ساتھ انکے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور جب میجر دہلی آتے تو مرزا انکے ٹھہرنے کا انتظام کرتے۔ سرجان میکلوڈ۔ میٹکاف اور طامسن نے اُنکے ساتھ بہت شریفانہ برتاؤ کیا۔ نہ صرف کئی انگریزوں سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بلکہ وہ انگریزی نظام کو بھی مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ جب سر سید احمد خاں نے بڑی محنت سے آئین اکبری کی تصحیح کی اور اشاعت کے وقت مرزا کی رائے طلب کی۔ تو انہوں نے ایک مثنوی لکھی جس سے ان کا مافی الضمیر بخوبی ظاہر ہوتا ہے ؎

گر ز آئیں میرود با ما سخن ۔۔۔ چشم بکشا اندریں دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر ۔۔۔ شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر
تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند ۔۔۔ آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت ۔۔۔ سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

---

[1] مرزا نے سرجان میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب کیلئے اپنی اردو نظم و نثر کا انتخاب کیا تھا۔ اسکے دیباچے میں لکھتے ہیں "البتہ میں اس کا مستحق ہوں۔ کہ کوئین پوئٹ گنا جاؤں۔ اور اس علاقہ سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں"
(ادبی دنیا اگست ۱۹۲۴ء)

"(در ہندوستان) اسپِ خوب نے۔ گوشت خوب نے۔ انگور و خربزہ و میوہ ہائے خوب نے۔ یخ و آبِ سرد نے۔ حمام و مدرسہ نے۔ شمع و شمعدان نے...... در باغ و عمارت ہا آبہائے رواں نے۔ در عماراتِ او صفا و ہوا و اندام و سیاق نے۔ رعیت و مردم ریزہ و تمام پائے برہنہ میگردند۔ لنگوٹہ گفتہ یکے چیزے می بندند"۔

اس حالت اور جہانگیر اور شاہجہان کے ہندوستان میں جو فرق تھا۔ اُسکی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مغلوں کی نفاست پسندی ہی تھی جس نے یہاں کے طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدن میں اصلاح کی کوشش کی۔ اُنہوں نے نئے نئے میوے اور پھول باہر سے لاکر ہندوستان میں عام کئے۔ نئے اصولوں پر اور نئے سلیقوں سے یہاں باغ لگوائے۔ کپڑوں میں کئی قسم کی اختراعیں کیں۔ اور انہیں تیار کروانے کے لئے۔ دلی۔ لاہور۔ آگرہ۔ احمدآباد میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کئے۔ خس کی ٹٹی اکبر کی ایجاد ہے۔ شورہ سے پانی ٹھنڈا کرنے کا طریقہ بھی اُس نے شروع کیا۔ فنِ مصوری کو جہانگیر اور فنِ تعمیر کو شاہجہان نے جو ترقی دی۔ اس سے زمانہ واقف ہے۔

مرزا غالب کو خدا نے وہ جاہ و جلال اور ثروت و حشمت عطا نہیں کی۔ جو مغل بادشاہوں یا امرائے سلطنت کو میسر تھی۔ لیکن جہاں تک ان سے بن پڑا۔ انہوں نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسی نفاست پسندی اور خوش مذاقی کا ثبوت دیا۔ جس کی مثالیں مغل حکمرانوں یا امرا نے قائم کردی تھیں۔ مرزا کی جو تصویریں موجود ہیں۔ اُن سے نہ صرف وہ بدن و جثہ کے لحاظ سے "ایک نووارد تورانی" معلوم ہوتے ہیں[1]۔ بلکہ لباس اور وضع قطع کے معاملے میں بھی اُن کا

---

[1] یادگارِ غالب ص ۱۷

حسنِ مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی غذا کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ پُرخور نہیں لیکن خوش خور ضرور تھے۔ وہ اپنی اخیر عمر کی غذا کے متعلق خود ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ' دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی' قریب شام کے کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب' چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر"۔

اشیائے خوردنی کے متعلق غالب کا ایک پُرلطف اُردو قطعہ ہے۔ جسے لکھ کر انہوں نے لوہارو کا ایک بلاوا ٹالا تھا۔ یہ قطعہ محض دل لگی کا اظہار ہے۔ اور اس سے کوئی اہم نتائج اخذ کرنا غلطی ہوگا۔ لیکن اس سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا کو کھانے کی جزئیات کا بڑا خیال رہتا تھا۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج ہے جو کہ مطلوبِ جاں — نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جاکے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت! سو بھیڑ کا ریشہ دار! — کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں!

غذا تو خیر پھر بھی ایک اہم چیز ہوتی ہے۔ معمولی آب خوردنی کی مختلف خاصیتوں پر بھی مرزا کی بڑی گہری اور جامع نظر تھی۔ رام پور کے قیام کا ایک خط ہے۔ وہاں انہیں کھانا سرکار سے آتا تھا۔ اور شاید خاص طور پر پسند نہ تھا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں"۔ لیکن پانی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے متعلق ایک لفظ

ایسا نہیں لکھا۔ جو زائد اور غیر ضروری ہو۔ لیکن جو باتیں قابلِ تعریف آبِ خوردنی میں ہونی چاہئیں ان میں سے کوئی نظر انداز نہیں کی۔ لکھتے ہیں۔ "پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی" سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے۔ کہ یہ پھیکا شربت ہے، صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔"

مرزا کی غذا کا ایک ضروری جزو شراب تھا۔ اور اس میں بھی وہ خاص نقادانہ رائے رکھتے تھے۔ دیسی شراب جو شکر کے شیرہ سے بنتی ہے۔ اس کی انہوں نے کئی جگہ مذمت کی ہے۔ ایک فارسی قصیدہ کے دو شعر ہیں ؎

کنوں کہ ملک مطیع است و راہ بے خس و خار
زمن بگو بفروشندگانِ بادۂ ناب
شرابِ قندیِ ہندوستاں دماغم سوخت
ز شیرہ خانۂ کشمیر آورند شراب!

ایک اور فارسی شعر ہے ؎

بد است آنچہ بہ ہندوستاں کشند از قند
ہم از فرنگ بیار، ار نباشد از شیراز!

مرزا کے خطوں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ زیادہ تر ولائتی شراب پیا کرتے تھے۔ دیسی بہت کم اور صرف تنگدستی کی حالت میں۔ غدر کے بعد ایک خط میں بالو ہرگوبند سہائے کو لکھتے ہیں۔ "دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام۔ یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا۔" ان دو قسم کی شرابوں کے علاوہ ان کے خطوں میں فرنچ کا کثرت سے ذکر آتا ہے۔ جس سے غالباً ان کا مطلب فرانسیسی ساخت کی میٹھی شراب

ہے۔ قیمتی ولائتی شرابوں (مثلاً شامپین اور پورٹ وائن) کا ذکر بھی ان کے خطوط اور اشعار میں ہے۔ ایک اردو خط میں لیکور کا ذکر بڑی حسرت سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

”لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا قوام پتلا۔“

مرزا کی نفاست پسندی صرف لباس، وضع قطع، غذا اور شراب تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تھی۔ غالب کے سکونتی مکان کی نسبت مولینا مہر لکھتے ہیں ”مکان اگرچہ اپنا کبھی نہیں بنوایا۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا۔ لیکن مذاق اس باب میں بھی بے حد نفیس اور عمدہ تھا۔“ یہی حال کتابوں کی چھپائی، بلکہ ان کی جلد بندی کا تھا۔ مرزا کے مذاقِ طباعت کی واضح ترین شہادت وہ خطوط ہیں جو انہوں نے دستنبو کی طباعت اور جلدوں کی تزئین کے متعلق مرزا تفتہ اور مرزا حاتم علی مہر کو لکھے۔ ان کتابوں کی نسبت تو شاید کہا جائے۔ کہ چونکہ وہ حکام اعلےٰ کو جانے والی تھی۔ اس لئے مرزا نے ان کی طباعت اور تزئین میں خاص اہتمام کرایا۔ لیکن مرزا نے فقط اپنی کتابوں کی اچھی طباعت کا خیال نہیں رکھا اپنی تو اپنی، اگر کسی شاگرد کی کتاب اچھی طرح نہ چھپتی۔ تو انہیں دکھ ہوتا۔ تفتہ کی سنبلستان چھپی ہے۔ طباعت اچھی نہیں۔ مرزا بے قرار ہو جاتے ہیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

”اجی مرزا تفتہ

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی۔ کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف۔ ”سنبلستان“ ایک معشوقِ خوبرو ہے۔ بدلباس ہے۔“

ہموار طبعی نفاست پسندی اور خوش معاشی کے علاوہ مغلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہموار طبعی یا افراط و تفریط سے پرہیز ہے۔ ہندوستان میں قریباً تین صدیاں مغلوں نے حکومت کی۔ اور اس تمام عرصے میں سوائے اورنگ زیب کے (جو خاص حالات سے متاثر ہوا) کوئی بادشاہ ایسا نہ تھا۔ جس نے کسی خاص مسلک کے لئے غیر معمولی جوش یا غلّو دکھایا ہو۔ مغلوں کا نظامِ حکومت کسی خاص کتابی یا قیاسی اصول پر مبنی نہ تھا۔ اسکی بنیاد عام سمجھ اور معاملہ فہمی پر قائم تھی۔ مغل عملی آدمی تھے۔ اور کتابی اصولوں کے بجائے عملی تجربہ اور مشاہدہ ان کا راہنما تھا۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ جوشیلے آدمی نیکوکاری کے زعم میں' یا خیالی اصولوں کی غلامی کرتے ہوئے اس طرح کی زیادتیاں اور حماقتیں کر بیٹھتے ہیں۔ جنکے سامنے عام دنیاداروں کی خطائیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور جن سے بچنا کسی مفروضہ اصول کی پیروی کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ انسانی کاموں کی دنیا میں عجیب کیفیت ہے۔ ایک مصلح یا قانون دان جب اپنے حجرے یا گوشۂ فکر میں بیٹھ کر انسانوں کے لئے کوئی اصلاحی اصول یا قانون وضع کرتا ہے۔ تو اُسے یہ اصول انسانی ترقی اور فلاح کا یقینی ذریعہ نظر آتا ہے۔ جس کی پیروی پر تمام دُنیا کی نجات منحصر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ توقعات شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اور ان اصلاحی کوششوں کے عملی نتائج خیالی توقعات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہے۔ کہ جو انسان ان کاموں کو عملی نتائج کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ اور قیاسی اصولوں کے بجائے عملی تجربہ کو چراغ راہ بناتے ہیں۔ اُن میں وہ غلّو اور افراط و تفریط کی عادت نہیں آتی۔ جو بعض "خدائی فوجداروں" کا خاصہ ہے۔ اس کے بجائے طبیعت میں ایک طرح کا توازن' بالغ نظری' رواداری' اور انسانی کوتاہیوں کا تحمل کرنے کی عادت آجاتی ہے۔ جو قطع نظر اس امر سے کہ یہ بجائے خود بڑی خوبیاں ہیں۔ حقیقی اور پائدار مصلحانہ کوشش کے لئے بھی

ضروری ہیں +

مغل بادشاہوں کی مصلحانہ کوششیں، ممکن ہے بہت نمایاں نہ ہوں۔ لیکن غالباً اس امر سے سب اتفاق کرینگے۔ کہ ان کے نظامِ حکومت میں ایک غیر معمولی توازن تھا۔ اور انہوں نے بالعموم ہر قسم کے افراط و تفریط سے پرہیز کیا۔ یہی خوبیاں غالب کی طبیعت کا جزو تھیں۔ اور انہیں ان پر بڑا ناز تھا۔ دیوان فارسی کے مقدمہ میں کہتے ہیں ؎

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش — از فسونِ کسے ہراس کنم
نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ — عالمے را خدا شناس کنم
نہ کہ اخبارِ باستانے را — دلو افسانہا قیاس کنم
نہ کز آثار ہر چہ مشہور است — اثرے تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہرِ حلہ ہائے بہشت — ترکِ آرائش لباس کنم
نہ کہ در عالمِ فراخ روی — عار از ژندۂ پلاس کنم
چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم — نہ بہ بزم نہ مے بکاس کنم

زیبد اجب ز کسی در مانم
نہ بہر مدعا مکاس کنم!

یک اردو قطعہ میں کہتے ہیں ع

ہم نہ تبلیغ پہ مائل نہ غلو کے قائل

رواداری

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ جو لوگ مختلف طریقوں اور اصولوں کو عملی نتائج کے اعتبار سے پرکھتے ہیں۔ ان میں قدرتاً رواداری اور متحمل مزاجی آجاتی ہے۔ مغل بادشاہوں بالخصوص بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں کے نظامِ حکومت کی بنیاد

اس رواداری پر تھی۔ اور یہ رواداری اور وسعتِ مشرب مرزا غالب کی بھی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ عملی زندگی میں ہندوؤں اور عیسائیوں سے جو ان کے تعلقات تھے وہ سب کو معلوم ہیں۔ اشعار میں بھی جابجا اس رواداری کی تعریف کی ہے ؎

سر از حجابِ تعین اگر بردل آید　　چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش می تواں کردن

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کلام مجید میں جہاں جابجا رواداری کی تلقین کی ہے۔ وہاں نصاریٰ کو دوسری قوموں کے مقابلے میں بالصراحت سراہا ہے۔ لیکن غالب اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب ہندوستان کی حکومت مُسلمانوں کے قبضے سے نصاریٰ کے قبضے میں منتقل ہو رہی تھی۔ اور اس تبدیل حالات سے جو شکایتیں مسلمانوں کو ہوئیں۔ انہوں نے اُن کے تمام نقطۂ نظر پر اثر ڈالا۔ اور اس زمانے میں بعض مسلمانوں نے عیسائیوں کی طرف ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس میں اسلامی رواداری یا خوش خلقی کا شائبہ نہ تھا[۱]۔ غالب نے اس موقع پر بھی اپنی حکیمانہ رواداری کو ترک نہیں کیا۔ اور نہایت سخت الفاظ میں اس طرزِ عمل کی مذمت کی ؎

غالب کساں نہ جہل حکیمش گرفتہ اند
بے دانشے کہ طعنہ براہلِ کتاب زد

اولوالعزمی اور بلند معیاری

مغلوں میں رواداری اور دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی قابلیت تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنے معیار پست کر دیتے تھے۔ مغل ہندوستان میں حکمران ہو کر آئے اور حکمران ہو کر رہے۔ اور ان کی ذہنیت بھی شروع سے آخر تک حاکمانہ ہی رہی۔ اقوامِ مشرق کی تاریخ میں مغلوں کا

---

[۱] ایک مشہور عالم کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ جب اُنہوں نے ایک یورپین انسپکٹر سے ہاتھ ملایا۔ تو جب تک اس ہاتھ کو دھو کر پاک نہ کر لیا۔ اسے باقی جسم کو چھونے نہیں دیا۔

وہی مرتبہ ہے۔ جو مغرب میں اہلِ روما کا۔ اور جو خصوصیتیں قدیم اہلِ روما کے کیرکٹر میں موجود تھیں۔ وہی مغلوں میں پائی جاتی تھیں۔ اہلِ روما کی طرح ان کی بھی شاندار شخصیتیں تھیں۔ جو جہاں جاتیں۔ اپنا سکہ جما لیتیں۔ انہی کی طرح ان کے عزائم اور حوصلے بلند تھے۔ انہی کی طرح تیز اور عقابی نظریں تھیں۔ انہی کی طرح اپنی بنیادی فوقیت اور برتری کا قوی احساس تھا۔ بابر نے بیانہ کے ایک نافرمان حاکم کو مطیع کرنے کے لئے جو فارسی قطعہ لکھا۔ اس سے اس قومی احساس کا اندازہ ہوتا ہے ؎

با ترک ستیزہ مکن اے میرِ بیانہ   چالاکی و مردانگیٔ ترک عیانست
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش   آنرا کہ عیانست چہ حاجت بہ بیانست!

بدقسمتی سے مرزا غالب اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور مغلیہ سپرٹ اور ذہنیت کے اظہار کے لئے جو باتیں درکار تھیں وہ انہیں میسّر نہ آئیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ان کی زندگی اور شاعری میں وہی رُوح جلوہ افگن ہے۔ جس نے زیادہ سازگار حالات میں مغلوں کو مشرق کے سب سے عظیم الشان حکمران بنا دیا تھا۔ مرزا کی شخصیت یادگارِ غالب اور اُردوئے معلّٰی میں پُوری طرح جلوہ گر ہے۔ اور اس کی عظمت اور وجاہت سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اولوالعزمی اور بلند ہمتی میں وہ بہترین مغل امرا یا ارکین سلطنت کے ہم پایہ ہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ مغل امرا کے بلند عزائم کا اظہار تو میدانِ کارزار میں یا سلطنت کے نظم و نسق میں ہوتا تھا۔ اور مرزا کی روحانی عظمت اور سربلندی کا امتحان شعر گوئی میں ہُوا۔ مرزا کو اس امر کا قوی احساس تھا۔ کہ شعر گوئی میں کمال حاصل کرنا بھی کارِ نمایاں ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں۔ کہ میرے آباؤ اجداد سپہ سالار اور "زرہ آرائے کلاہ و کمر" تھے مجھے یہ تو نصیب نہ ہُوا۔ مَیں نے سوچا کہ حقیقت سے پردہ اُٹھانا بھی

ایک عظیم الشان کام ہے۔ اسی کو اختیار کر لیا۔ "ذوقِ سخن کہ از لی آوردہ بودم .... مرا بدال فریفت۔ کہ آئینہ زدودن وصورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است .... بسخن گستری روئے آر۔ ناگزیر ہیچیاں کردم و سفینہ در بحرِ شعر رواں کردم و قلم علم شد و نیر پائے شکستہ آبا قلم"۔ مرزا اور قدیم مغل امرا اور حکمرانوں کی کوششوں کے میدان مختلف تھے۔ لیکن کیا کوئی اس امر سے انکار کر سکتا ہے۔ کہ مرزا نے اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے وہی بلند ہمتی اور الوالعزمی دکھائی۔ جو ان کے دوسرے ہم قوموں نے ملک گیری اور نظم و نسق سلطنت میں کیا۔ قلمروِ شعر و سخن میں مرزا کے مقاصد اسی طرح بلند نہ تھے۔ جس طرح سیاسیات کی دُنیا میں مغل فاتحین کے؟ اور کیا ان کے حصُول کے لئے انہوں نے اسی طرح مُسلسل جدّوجہد نہیں کی؟ مرزا کے ابتدائی طرزِ شاعری میں بڑے عیب تھے۔ اور جس طرح انہوں نے خود اس میں مسلسل اصلاح اور ترقی کر کے اپنے تمام پیشرو ہندوستانی شعرا سے سبقت حاصل کی ہے۔ وہ خود ان کی روحانی سربلندی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ فارسی دیوان کے اخیر میں لکھتے ہیں "گمان نبرند۔ کہ رہ گزر تنگ بود۔ یا رہ انجام لنگ۔ حاشا کہ رہرو را بدل زنگاریں رباطہائے سرِ راہ بندے وخوے را بہرِ راہ نشیناں ایں مرحلہ پیوندے بودہ باشد۔

درسلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم

کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش"

غم کا مُقابلہ

مرزا کی نسبت شاید کہا جائے۔ کہ اگر وہ واقعی بلند حوصلہ تھے تو اُن کی شاعری میں غم والم کا عنصر کیوں اس قدر نمایاں ہے؟ لیکن کیا ایک حوصلہ شخص کو غم والم سے دوچار نہیں ہونا پڑتا؟ مصیبتوں سے بری رہنا تو ایک اتفاقی بات ہے اس میں باحوصلہ یا بےحوصلہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ باحوصلہ انسان

مصیبتوں کے سامنے بے بس نہیں ہو جاتا۔ نامساعد حالات کا اسے بھی افسوس اور رنج ہوتا ہے۔ لیکن وہ ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ مرزا غالب کے متعلق بھی یہ ایک امر واقعی ہے۔ اگرچہ ان کے اشعار میں جن کا تعلق دوسروں سے زیادہ ان کی اپنی ذات سے ہے۔ مایوسی کا اظہار صاف ہے۔ لیکن زندگی میں انہوں نے غم کے آگے سر نہیں جھکایا اور اپنی زندہ دلی برقرار رکھی ہے۔ ایک ابتدائی قصیدہ کے اشعار ہیں ؎

در جیبِ رفیقاں گلِ شاداب فشاندم   ہر چند تفِ تشنگیم سوخت بہ صحرا

در بزمِ حریفاں رگِ مہتاب کشودم   گر خود ہمہ گردوں نمکم ریخت بہ صحرا

اس کے علاوہ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مرزا کی زندگی اور شاعری میں غم پر قابو پانے کی مسلسل کوشش ہے ؎

در پیچ و خمِ ہستیِ موہومئے من ہیں

آویزشِ بختِ و رَم و طبعِ جواں را

مرزا کے کلام میں غم کا بیان میر تقی میر کی طرح نہیں۔ جو ذرا سی ٹھیس سے پھوڑے کی طرح پھوٹ بہتے ہیں۔ اس میں ضبط کی مسلسل کوشش ہے۔ اس نفسیاتی کشمکش کو خود انہوں نے ایک دلچسپ تشبیہ کی مدد سے واضح کیا ہے ؎

بسکہ روکا میں نے اور سینے پہ ابھریں پے بہ پے

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

مرزا کے غم دائم کے متعلق یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے۔ کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب مغلیہ حکومت نزع کی حالت میں تھی۔ ان کی اپنی ذاتی مصیبتوں میں بھی مغلیہ حکومت کے زوال و ادبار کو بڑا دخل تھا۔ وہ خود بار بار اس بات پر رنج و حسرت کا

اظہار کرتے ہیں۔ کہ وہ اکبر یا شاہجہاں کے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔ اور یہ امر بھی قرین قیاس ہے۔ کہ اگر وہ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں پیدا ہوتے۔ تو ان کی حسب استحقاق قدر ہوتی۔ اور انہیں مالی مشکلات اور مصائب سے بُری طرح دوچار نہ ہونا پڑتا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جس زمانے میں مرزا پیدا ہوئے۔ اس میں مغلوں کی جو حالت تھی۔ اس کو دیکھتے ہُوئے۔ اگر مرزا اپنے کلام میں غم اور مایوسی کا اظہار نہ کرتے۔ تو وہ مغلوں کے صحیح ترجمان ہی نہ ہوتے!

حُبِّ دُنیا کے نقصانات

مرزا میں اگر مغلوں کی قومی خوبیاں موجود تھیں۔ تو ان کی قومی خامیوں سے بھی وہ بری نہ تھے۔ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ نفاست پسندی اور دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت مغلوں کی ایک قومی خصوصیت ہے۔ اور جس قوم کو دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہو۔ اسے "اقلل من الدنیا" کا اصُول سمجھنا اور اخذ کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ زرّیں اخلاقی اصُول جسے اختیار کئے بغیر انسان اپنی ضرُوریات اور مادی دُنیا کا مالک نہیں بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ اور جس کی عظمت اور اہمیت عہدِ صحابہ کے عربوں (اور حال کے بعض ہندو راہنماؤں) نے بخوبی سمجھی ہے مغلوں نے کبھی اختیار نہ کیا۔ اپنی حکومت کے زمانے میں تو شاید انہوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ لیکن جاہ و حشمت ختم ہو جانے کے بعد بھی ہر ایک کی یہی کوشش رہی۔ کہ جس طرح ہو سکے۔ گزشتہ شان و شوکت کی کم از کم ایک کھوکھلی سی نقل برقرار رہے۔

مرزا بھی اس سے مستثنٰے نہ تھے۔ اللہ نے ان کو نیک طبیعت اور حساس دل دیا تھا۔ ان کے ارمان تو یہ تھے۔ کہ جس شہر میں وہ رہیں۔ اس میں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ لیکن ان کی اپنی ضروریات اتنی بڑھی ہُوئی تھیں۔ اور نوکر چاکر، مکان، خورد و نوش پر ہی

ان کا اتنا خرچ آجاتا تھا۔ کہ انہیں اپنے نیک ارمان پُورے کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ یہی نہیں۔ بلکہ اپنی ضروریات پُوری کرنے کے لئے انہیں جس طرح دوسروں کے سامنے سرِ خم کرنا پڑتا تھا، اس سے مکاتیب غالب کے ناظرین واقف ہوں گے۔

یہ مرزا کی انتہائی بدقسمتی تھی۔ کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب عبدالرحیم خانخاناں جیسے شعر کے مربی موجود نہ تھے۔ اور مغلیہ شان و شوکت کا سرچشمہ، جو فیضی، عرفی اور نظیری کے زمانے میں زور شور سے بہہ رہا تھا۔ خشک ہو چلا تھا ؎

چُوں دورِ خسرد آمدمے در سبُو نہ ماند!

ایسی حالت میں اگر وہ اقلل من الدنیا کے اصُول پر عمل کرتے اور قناعت کو اپنی سپر بناتے تو شاید زندگی ذرا اطمینان سے کٹ جاتی۔ لیکن قومی کیرکٹر اور ابتدائی تربیت کا اثر غالب رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہایت تلخ گھونٹ پینے پڑے ؎

سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک　　لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک

لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی دُنیا کی اچھی چیزوں سے محبت برقرار رہی۔ اور بعض اوقات تو ان پر وہ قابلِ رحم نفسیاتی کیفیت طاری ہو جاتی۔ جسے اُنہوں نے ایک شعر میں نظم کیا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اخیر عمر میں جب انہوں نے "مشقِ فنا" شروع کی۔ ان کی خواہشات میں زیادہ توازن آگیا۔ اور اگرچہ اقتصادی مشکلات سے مرتے دم تک چھٹکارا نہ ہُوا۔ لیکن اب

طبیعت میں پہلے کی نسبت صبر و قرار زیادہ تھا ۔

اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت　　در فنِ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
نے بود دو لائے ما بہ پیری غالبؔ　　زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

غالبؔ کے معاصرین

مرزا نے اپنے اشعار اور خطوط میں جا بجا اپنی محرومیٔ قسمت اور معاصرین کی قدر ناشناسی کی شکایت کی ہے ۔ اس سے اور یادگارِ غالب کے بعض اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے ۔ کہ اپنی زندگی میں مرزا کی کوئی قدر نہیں ہوئی ۔ حقیقتاً یہ خیال جس قدر عام ہے ۔ اسی قدر غلط ہے ۔ اور مرزا کے زمانے کے حالات اور اس زمانے کے تذکروں میں جتنی تحقیق کی جائے ۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حالاتِ زمانہ کے مطابق مرزا کی قدر شناسی میں اہلِ ادب نے کوتاہی نہیں کی ۔ اور اگر مرزا اس سے مطمئن نہ تھے ۔ تو اس کی ایک وجہ یہ تھی ۔ کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کے متعلق جو اچھی رائے رکھتے تھے ۔ اس سے پورا پورا اتفاق صحیح ادبی مذاق کو ناگوار تھا ۔ یہ درست ہے کہ شاعری میں جب کوئی نئے راستے نکالتا ہے تو اس کی قدر آہستہ آہستہ ہوتی ہے ۔ لیکن مرزا نے فنِ شعر میں کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کیا ۔ فقط پرانی روش میں اپنے طبعی جوہر سے کامیابی حاصل کی ۔ اور اپنے کمالِ شاعری سے غزل کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا ۔ اس کے علاوہ اگرچہ آجکل تعلیم اور چھاپے خانوں کی توسیع سے کلامِ غالب کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود غزل کی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس نسل میں جس کی ذہنی تربیت نئے اصولوں پر ہو رہی ہے ۔ غالبؔ کے معاصرین سے کچھ زیادہ نہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہم تمام حالات کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں ۔ تو پتہ چلتا ہے ۔ کہ زمانہ غالب کی نہیں ۔ بلکہ معاصرینِ غالب کی

رائے کی تائید کر رہا ہے۔ مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی نثر پر بے انتہا ناز تھا۔ اور فارسی غزل گوئی میں وہ شاید خواجہ حافظؔ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہم مرزا کے فارسی کلام کی قدر و قیمت خوب سمجھتے ہیں (اور اس کتاب میں ہماری مسلسل کوشش یہ رہی ہے۔ کہ مرزا کے منتخب فارسی اشعار، مختلف عنوانوں اور مختلف سلسلوں میں پرو کر ناظرین کے پیش کرتے رہیں۔ تاکہ وہ ان جواہرِ بے بہا سے واقف ہوں) لیکن پھر بھی کلیاتِ غالب کو دیوانِ حافظؔ سے بہتر یا اس کے ہم پایہ کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اس کے متعلق مرزا کے معاصرین (مثلاً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ۔ مولٰنا فضل حق۔ نواب ضیاء الدین نیرؔ و رخشاں۔ بےخبرؔ)[1] کی جو رائے تھی۔ وہی درست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اُن کی شاعری کی جو شہرت ہے۔ وہ اُن کے منتخب دیوانِ ریختہ کی وجہ سے ہے۔ عوام الناس مرزا کا یہ مصرع ؏

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

پڑھتے ہیں۔ اور سر دُھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے۔ جسکے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزہ کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دُوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ رباعی حکیم آغا جان عیشؔ کی ہے۔ جو انہوں نے اجمیری دروازے کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ حکیم صاحب شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ لیکن سخن فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہ تھا۔ جو اس رباعی سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین کو حاصل تھا۔ اور آخر یہ رباعی

---

[1] ملاحظہ ہو یادگارِ غالب صہ ۲۰۰-۲۰۱ (اشاعتِ اول)

اس منتخب دیوان کے متعلق نہیں۔ جس کو سب شعر فہم حرزِ جان بنائے ہُوئے ہیں۔ اسمیں جن اشعار کے دقیق ہونے کی شکایت ہے۔ انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اور لکھا کہ منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں۔ انہیں میرا نہ سمجھا جائے۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس مسئلے میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی۔ تو اس کا جواب نسخۂ حمیدیہ ہے۔ جس میں خارج شدہ اشعار شائع ہُوئے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا۔ تو ان پر کفر کا فتوےٰ عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ اُردو ادب ان کا ممنون ہے۔ کہ انہوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو سُرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا۔ اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی۔ جس میں غواصی کا صلہ وہ بے بہا موتی ہیں۔ جو اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں +

سر والٹر رالے نے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کے متعلق لکھا ہے کہ "ملٹن کا سب سے بڑا مداح ملٹن ہے۔ اور جو کوئی ملٹن کی تعریف لکھے گا۔ اُسے ملٹن کے اپنے خیالات ہی مختلف الفاظ میں ادا کرنے پڑیں گے"۔ یوں تو شاعرانہ خودنمائی میں ہمارے سب شعرا مغربی شعرا سے بہت آگے ہیں۔ لیکن رالے نے ملٹن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ غالب پر لفظ بلفظ صادق آتا ہے۔ لوگ ڈاکٹر بجنوری کے "مقدس وید اور دیوانِ غالب" والے فقرے کو دُہراتے ہیں۔ اور اسے خوش اعتقادی اور مبالغے کا انتہائی اظہار سمجھتے ہیں لیکن آخر بجنوری نے غالب ہی کے دو فارسی اشعار لکھ کر شاعرانہ نثر میں ان کی تشریح کر دی تھی ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے   دیوان مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے   آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

مرزا اپنی تعریف میں بھی وہی مبالغہ روا رکھتے تھے۔ جو مدحیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں کرتے تھے۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا مذاق سلیم کو گوارا نہیں۔ اور یہ امر افسوسناک ہے کہ کلامِ غالب کی موجودہ شہرت اور مرزا کے معاصرین کی مزعومہ اور مفروضہ قدر ناشناسی سے یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے کہ ایک شاعر کی صحیح قدردانی اس کے اپنے زمانے یا ملک میں نہیں ہو سکتی۔ اور آج ایسے شعرا پیدا ہو گئے ہیں۔ جو جرمن زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ لیکن اپنا اُردو کلام جرمن قوم کے نام معنون کرتے ہیں[1]۔ یعنی ہندوستان میں تو شعر فہم کوئی نہیں رہا۔ ان حضرت کے کلام کو اگر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ تو وہ جرمن قوم کے افراد ہیں۔ ہم شاعرانہ تعلّی کو (اگر اسے شاعرانہ تعلّی ہی سمجھا جائے) بہت بڑا عیب نہیں گنتے۔ لیکن موجودہ شاعروں اور ان کے حواریوں کی یہ روش کہ ناظرین کو اپنے اشعار کی خوبیوں سے واقف کرنے کی بجائے انہیں مرعوب کر کے اور ان کی ناقابلیت جتا کر داد لی جائے کسی طرح قابلِ تحسین نہیں۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اس طرزِ استدلال کے عام ہونے کی ایک وجہ مرزا کی موجودہ شہرت اور یہ خیال ہے کہ اپنے زمانے میں اُن کی صحیح قدر نہیں ہوئی +

مرزا غالب کی شخصیّت

ہماری کتاب میں صرف مرزا غالب کے سوانح حیات کا خلاصہ اور ان کی تصانیف پر تبصرہ نہیں۔ اس میں ہم نے مُسلسل یہ کوشش کی ہے کہ مرزا کی شخصی خصوصیات، بلکہ ان کا

---

[1] ملاحظہ ہو آیاتِ وجدانی از مرزا یاس یگانہ۔

مافی الضمیر اور ان کے ذہنی ارتقا کی نشو و نما، نظر کے سامنے آجائے۔ کئی مباحث ایسے ہیں (مثلاً جہاں مرزا کو مغلیہ تہذیب و تمدن کا بہترین مظہر بتایا ہے) جن میں مرزا کی افتادِ طبع پر تفصیلی تبصرہ ہُوا ہے۔ اندریں حالات ان خصوصیات کو دوبارہ نمایاں کرنا بظاہر غیر ضروری نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ مرزا کے اخلاق و عادات کی نسبت ملک کے بااثر حلقوں میں ایک خاص نظریہ قائم ہو رہا ہے۔ جو نہ صرف واقعات کے خلاف ہے۔ بلکہ جس سے مرزا کی اصلی شخصیت نظر انداز ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مبحث پر علیٰحدہ روشنی ڈالی جائے۔

مرزا غالبؔ کا ایک شوخ اور ظریفانہ شعر ہے ؎

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس میں انھوں نے مسائلِ تصوّف، اور معرفت کے بیان کی بنا پر ولایت کا دعوےٰ کیا تھا لیکن انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ ان کا یہ دعوےٰ، جو محض تفننِ طبع کا اظہار تھا، فقط مسائلِ تصوّف کے بیان کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اخلاق و عادات کی بنا پر قبول کر لیا جائیگا!!

مرزا غالبؔ کی نسبت اس نقطۂ نظر کے قائم ہونے میں سب سے زیادہ دخل مولٰینا حالؔی کو ہے۔ ان کی کتاب (جیسا کہ انہوں نے خود حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے) غالب کی ہمدردانہ ترجمانی ہے۔ اس میں حالؔی نے مرزا غالب کی زندگی اور تصانیف پر کڑی تنقید نہیں کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس کڑی تنقید کا ابھی وقت نہ آیا تھا۔ یادگارِ غالبؔ، ایک منصف مزاج لیکن ایک عقیدتمند شاگرد کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ جس میں اس نے اپنے اُستاد، اور زمانہ کے بہترین شاعر کو عقیدت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش

کی ہے۔ اور اپنی "نگہِ پاک بیں" کی مدد سے اس کی ایسی تصویر کھینچی ہے۔ جس سے وہ شخصیت نہ صرف بے عیب نظر آتی ہے۔ بلکہ اس میں خدا ترسی، دریا دلی، رقیق القلبی، اور تقدس کے نقوش بھی نمایاں ہیں +

مولینا مہر نے اس خاکے میں رنگ بھرا ہے۔ اور غالب کو پورا پورا ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب (اشاعت اول) میں سب ٹائٹیل پہ غالب کو غالب لکھا ہے۔ اور مرزا کے جو اخلاق و عادات انہوں نے بارھویں باب میں جمع کئے ہیں۔ وہ بھی بیشتر اولیا و صلحا کے ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔ "سادہ دل و راست گفتار"۔ "ایثار و کرم" "بے نواؤں سے ہمدردی"۔ "بیکرِ حسنِ اخلاق"۔ "احسان لینا گوارا نہ تھا"۔ "تواضع اور انجاح مقاصدِ خلق"۔ "انکسار"۔ "مروت"۔ "نذر و تبرک"۔ "مخالفت سے عفو و درگزر" "تصوف"۔ اور اس سلسلے میں ان کی تمام تحریر کی رجحان اس طرف ہے۔ کہ مرزا ایک سمجھدار۔ دنیادار نہ تھے۔ بلکہ ایک "سادہ دل" ولی صفت انسان تھے +

مشرقی ادبیات کا پرانا اصول ہے۔ کہ جس شخص کا زیادہ سے زیادہ احترام دکھانا ہو۔ اسے ایک فرشتہ یا کم از کم ایک ولی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ خواہ اس مقصد کے لئے ٹھوس واقعات کو ہی کیوں نہ نظر انداز کرنا پڑے۔ اور خواہ تقدس کا ذرا دیپ دینے سے ممدوح کے اپنے خوبصورت خط و خال ہی کیوں نہ چھپ جائیں،

اس رجحان کی نمایاں مثال سعدی کی نسبت عام نقطۂ نظر ہے۔ اس کی ہزلیات کو چھوڑئیے "گلستان" کے بابِ پنجم اور "بوستان" کے بعض اندراجات میں جو بارود جمع ہے۔ اس کی موجودگی میں سعدی کو ولی سمجھنا، دل لگی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا، اور اگر اس حصے سے قطع نظر سعدی کی باقی تصانیف اور اس کی زندگی کے کارناموں پر نظر

ڈالی جائے تب بھی وہ ایک بڑا، بلند پایہ، تجربہ کار، معاملہ فہم، جہاں دیدہ بزرگ (بلکہ گرگِ باراں دیدہ) نظر آتا ہے۔ لیکن عوام کو اس تجربہ کاری اور معاملہ فہمی کے لئے احترام کا اظہار مقصود ہے۔ اس لئے مذہبیت اور تقدس کی سرزمین میں اسے ایک ولی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور اب اگر کوئی شخص، سعدی کا ذکر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ لکھے نہ کرے۔ تو وہ مذاقِ سلیم سے بے بہرہ سمجھا جائے گا!

یہی عمل غالب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ احترام و عقیدت کے اس غلط اظہار کے لئے نہ صرف مرزا کی زندگی کے بعض ا[illegible]ناک اور ناقابلِ انکار واقعات سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ غالب کی شگفتہ اور بوقلموں شخصیت کے ساتھ بھی یہ ایک بے انصافی ہے۔ کہ اسے اس طرح محدود اور یکرخہ طریقے سے پیش کیا جائے۔ معتقدین چاہتے ہیں۔ کہ تقدس و ولائت کے ایک مختصر شوالے میں غالب کی مورتی رکھی جائے۔ جس کے سامنے لوگ سرِ نیاز جھکائیں اور اعتقاد کی گردنیں خم کریں۔ لیکن وہ نہیں دیکھتے۔ کہ بعض مجسموں کا قد و قامت اتنا بڑا ہوتا ہے۔ کہ وہ مختصر شوالوں میں نہیں آسکتے۔ اور ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ مورتوں کو شوالوں کے اندر نصب کرنے کے بجائے، انہیں اپنے حال پر، آزاد اور بے قید چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ان کا قد و قامت اور نقش و نگار پوری شانِ دلربائی کے ساتھ نمودار ہو!

مرزا کی شخصیت میں جو غیر معمولی کشش ہے اُس کا ایک سبب ان کی بشریت اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ہم اقبال اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے اس امر کو واضح کر چکے ہیں۔ کہ مرزا کے کلام میں عام انسانی مسائل اور الجھنوں کا بیان ہے۔ اور انہیں اس امر کے اظہار میں ذرا بھی باک نہ تھا۔ کہ وہ بشری کمزوریوں سے بالا نہیں ۔

خوئے آدم دارم ' آدم زادہ ام   آشکارا دم ز عصیاں مے زنم

مرزا کے کلام کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے ۔ اُن کا دل یوگیوں یا ولیوں کا دل نہ تھا ۔ بلکہ عام انسانوں کا ۔ وہ شاعر تھے ۔ عام انسانوں سے زیادہ حساس اور اپنے احساسات کے موثر اظہار پر قادر ۔ لیکن ان کے جذبات و احساسات وہی تھے ۔ جو تمام انسانوں کو بیقرار رکھتے ہیں ۔ اس لئے ناظرین ان کے دل کی داستان میں اپنی کہانی پڑھتے ہیں ۔ اور لُطف اُٹھاتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے ۔ کہ مرزا کی زندگی میں ایک قابلِ عزت انسان ہونے کی مُسلسل کوشش ہے ۔ لیکن شاید وہ روایتی اصولوں کے مُطابق فرشتہ یا ولی بننا قبول نہ کرتے ۔ وہ غالباً یہ حقیقت خوب سمجھتے تھے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا   مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

اگر تمام قدیم نظریوں سے قطع نظر کر کے ' مرزا کے واقعاتِ زندگی اور ان کی شخصیت پر غور کیا جائے ۔ تو خیال ہوتا ہے ۔ کہ اس میں تقدس اور ایثار و کرم اسقدر نمایاں نہیں ۔ جس قدر مضبوط عقل و ہوش اور متوازن دل و دماغ ۔ مرزا طبعاً نیک تھے ۔ اور چونکہ انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں خود سہی تھیں ۔ انہیں دوسروں کی تکالیف کا پُورا احساس تھا ۔ اور دل میں انہیں دُور کرنے کی مخلصانہ خواہش تھی ۔ لیکن یہ خواہش اسقدر قوی نہ تھی ۔ جس قدر ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی ۔ وہ مضبوط ہوش و خرد کے مالک تھے ۔ اور ان کے واقعاتِ زندگی میں سب سے معتمد اور با اثر راہنما ان کی عقلِ سلیم ہی ہے +

مرزا کے جاننے والے ان کی عقل و سمجھ کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے ۔ میر مہدی مجروح لکھتے ہیں ؎

زہے غالبؔ آں صاحبِ عقل و رائے   فراست فزائے و غوامض کشائے

خجستہ صفات و فرشتہ سرشت ... بخوئے خوش خویش خرّم بہشت
خرد کردہ زینگو نہ باوے خطاب ... کہ اے چرخ اندیشہ را آفتاب
نبودہ بدیں ساں عیارِ سخن ... تو افزودۂ اعتبارِ سخن
اگر مرغِ معنی ست عرش آشیاں ... کند تیز فکرت ہمانجا نساں

تو قفلِ خرد را کلید آمدی
نہ آساں در ینجا پدید آمدی!

ان کی زندگی میں اِس مضبوط عقل سمجھ کی کارفرمائی صاف نمایاں ہے اور کئی لحاظ سے اسے مثالی زندگی سمجھنا چاہیئے۔ جب مرزا پیدا ہوئے۔ تو سلطنت مغلیہ کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ آٹھ سال کے تھے۔ کہ لارڈ لیک نے دہلی اور آگرہ فتح کیئے۔ اور شمالی ہندوستان میں کمپنی کی مستحکم حکومت قائم کر کے، ان مغل اور افغان قسمت آزماؤں کی سب قابلِ حصول آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ جن سے بیقرار ہو کر، انہوں نے اطرافِ ملک میں حکومتیں قائم کی تھیں۔ یا دوسری طرح اپنے آپ کو دُنیا میں سربلند کیا تھا۔ اب اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور اگر ہوتی بھی۔ تو مرزا کے اپنے حالات سازگار نہ تھے۔ مرزا نے یہ دیکھا۔ کہ اب دنیاوی قدر و منزلت تو میسّر نہیں آسکتی۔ زیادہ سے زیادہ کسی کچہری میں محرّری یا اہلمدی مل جائے گی۔ انہوں نے اپنی کوشش کی باگ اس راستے پر پھیری، جو اس سیاسی زوال اور کمپنی کے تسلّط سے بھی بند نہ ہوا تھا۔ اور شعر و سخن میں عروج حاصل کرنے کو اپنا مطمعِ نظر بنایا۔

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ مرزا کا یہ فیصلہ صحیح سمجھ پر مبنی نہ تھا۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے سے وہ اپنے ہمچشموں بلکہ اپنے تمام ہمعصروں سے آگے نہیں نکل گئے؟

اور اس بلند مرتبہ کے حصول کے لئے جو محنت اور جد و جہد مرزا کو کرنی پڑی اسکا اندازہ تب ہوتا ہے۔ جب ان کے ابتدائی کلام کا بعد کے اشعار سے مقابلہ کیا جائے:

مرزا خود اس عظیم الشان کایا پلٹ سے واقف تھے۔ کلیاتِ فارسی کے ختمہ پر کہتے ہیں:

"کیست تا از من پرسد اگر نا پرسیدہ گویم در دلش فرود آید کہ

دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزشہا رفتہ دادہ"

مرزا کی تگ و تاز کا میدان شعر و ادب تھا۔ اور انکی ہمت اور جد و جہد کے اصل کارنامے اسی میدان میں نظر آتے ہیں۔ لیکن عام دنیاوی زندگی میں بھی انہوں نے کوشش اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ اقتصادی نقطہ نظر سے ان کی سب سے بڑی مہم جاگیر کی بازیابی کی تھی جو ناکام رہی لیکن اسکی تکمیل کے لئے انہوں نے عمر بھر جو کوشش کی ہے۔ وہ کسی سے چھپی نہیں۔ سعی و کوشش کا کوئی پہلو نہ تھا۔ جو انہوں نے نہ آزمایا ہو۔ کلکتہ وہ اسی مقصد کے لئے گئے کئی سال سرگرداں رہے اور دہلی میں بھی جو کچھ ان سے ہو سکتا تھا۔ وہ انہوں نے کیا۔ اس بڑی کشمکش کے علاوہ عام دنیوی معاملات میں بھی ان کا طرزِ عمل ایک مستعد اور ہوشمند واقف کار آدمی کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے عمل میں آتا ہے۔"

مرزا غالب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ انکی زندگی کی اقتصادی مہم اس طرح ناکام رہی۔ کہ اس سے ایک تھوڑے دل والا انسان بد دل اور مایوس ہو جاتا۔ لیکن مرزا کی روزمرہ کی زندگی میں تلخی و ناکامی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ان کے اشعار یا ذاتی خطوط میں وہ درد و غم ابل پڑا ہے جو ان کے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا لیکن اپنی زندگی میں اور دوسروں کے سامنے انہوں نے جس طرح رکھ رکھاؤ قائم رکھا ہے۔ اس پر ان کے اشعار اور خطوط اور معاصرانہ تذکرے گواہ ہیں۔ مثنوی ابر گہر بار میں کہتے ہیں:۔

زمن جوئے در بد نکو زیستن — جگر خوردن و تازہ رُو زیستن
درشتی بہ نرمی زبوں داشتن — رسد گر ستم، غمزہ پنداشتن
بہ عجز از دروں سُو جگر سوختن — بہ ناز از بروں سُو رُخ افروختن
ز دل خار خارِ غم انگیختن — خسک در گزار نفس ریختن
سمن چیدن و در رہ انداختن — دِل افشردن و در چہ انداختن
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود — نہفتن شرارے کہ در دل بود!!

مرزا نے نہ صرف غم والم اور مایوسی و ناکامی کے عالم میں بھی اپنی شوخ طبعی اور شگفتگی برقرار رکھی۔ بلکہ اقتصادی مشکلات کے باوجود خوش معاشی اور نفاست پسندی کا ایک شاندار نمونہ قائم کیا۔ اسکے علاوہ مرزا کی نفاست پسندی امورِ ظاہری تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اسکی بنیاد بہت گہری تھی۔ اور نیک نہادی اور نکوکاری بھی اسکا جزو تھی۔ مرزا غالب ترک بچہ تھے۔ اسلئے جب ان کا کسی سے معرکہ ہوتا۔ تو وہ حریف کا منہ نہ دیکھتے رہتے۔ بلکہ اسکے خلاف سارے حربے استعمال کرتے۔ اسکے علاوہ ان کی مالی حالت اسقدر پست تھی۔ کہ اپنا رکھ رکھاؤ قائم رکھنے میں ہی ان کا سارا اندوختہ ختم ہو جاتا۔ اس سے محتاجوں کی حاجت روائی اور غمزدوں کی تسکین کے جو ارمان تھے۔ انہیں پورا کرنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن ان ارمانوں اور نیک خواہشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا!

مضبوط ہوش و خرد، مسلسل جد و جہد، زندہ دلی، اور نیک نفسی کے علاوہ جو چیز مرزا کی زندگی میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ ان کی وضعداری، حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ ہے۔ مرزا ایک شاعر اور آزادہ رو انسان تھے۔ لیکن طبقۂ شرفا کے ترجمان بھی تھے۔ اور عام جمہوری طرزِ معاشرت کی بے آئینی اور یکسانیت شاید ہی انہیں پسندِ خاطر ہوتی۔ اپنی زندگی میں

انہوں نے حفظِ مدارج کا بڑا خیال رکھا۔ اور اشعار و خطوط میں بھی کئی جگہ اس پر زور دیا۔
ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ع

رعایتِ ادب آئینِ من بود ناچار!

ایک نہایت پر لطف شعر ہے ؎

اگرچہ بدرو شتم، پاسِ ہر روش دارم
چراغِ دیر و حرم نورِ چشمِ صرصرِ من

مرزا کے قوم اور ملک پر بڑے احسانات ہیں۔ لیکن یہ احسانات محض ادبی نہیں۔ مرزا کا صرف یہی کارنامہ نہیں۔ کہ انہوں نے ہماری نظم و نثر کے خزانے میں بیش بہا جواہرات کا اضافہ کیا۔ بلکہ ان کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی ہماری قومی روایات کا بیش بہا زیور ہے۔ داستان تاریخِ اردو کا مصنف ان کی نسبت لکھتا ہے: "غالب، انسان، دوست، استاد، مربّی، مخدوم، خادم، شہری، ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے"۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بہت کم ہستیاں ہونگیں۔ جو اولوالعزمی، ذہانت، آزاد خیالی، وضعداری، ہمواطبعی، وسیع المشربی، نفاست پسندی، اور شوخی و ظرافت میں مرزا کے ہم پایہ ہوں۔ مرزا بھی اپنی طبیعت کی بوقلمونی سے خوب واقف تھے۔ ایک شوخ فارسی شعر میں محبوب سے کہتے ہیں ؎

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گر فتم رحم بر قسمِ یاد و افغانم نمے آید!

جس بارگاہ میں غالب کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ وہاں گردنیں تعظیم و احترام کے زور سے جھک جاتی ہیں۔ اور مرزا کے عظیم الشان کارناموں اور ادبی ارتقا پر تحسین و آفرین کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن آپ اس بارگاہ سے صرف عقیدت و احترام کے خیالات ہی

لے کر نہ جائیں گے ۔ بلکہ محبت ۔ دوستی اور یار باشی کے جذبات سے بھی متاثر ہوں گے ۔ جو ہستی یہاں صدر نشیں ہے ۔ وہ فقط پُرشکوہ اور لائقِ احترام ہی نہیں ۔ بلکہ ہمارے ادب کی سب سے ملنسار اور خوش صحبت ہستی بھی ہے ۔ آپ خواہ کس مذاق کے ہوں ۔ اور کس رنگ میں یہاں آئیں ۔ وہ ہستی آپ کے رازِ دروں اور دردِ دل سے واقف ہو گی ۔ اور آپ کی تسکین و آسودگی کا سامان کرے گی +

اگر آپ دل لگی اور شوخی و ظرافت کا سامان چاہتے ہیں ۔ تو یہاں خیال آفرینی اور شوخ نگاری کی پھلجھڑیاں ہیں ۔ جن سے آپ کے دل و دماغ پر لطیف تبسّم کی لہر دوڑ جائے گی ۔ اگر آپ شباب کی رنگیں داستان اور حُسن و عشق کے افسانے سُننا چاہیں ۔ تو یہاں وہ سوز و گداز اور نشہ و مستی کی باتیں ہونگیں ۔ جن سے مُردہ دلوں میں بھی جان پڑ جائے اور اگر آپ زندگی کے رازِ نہاں کی پردہ کشائی چاہتے ہیں ۔ تو وہ پختہ کار ہستی آپ کو ایک ایسی سر بفلک بلندی پر لیجا کر اس کارگاہِ ہستی کی سیر کرائے گی ۔ جہاں سے اس عالمِ کون و مکاں کی ایک ایک چیز صاف نظر آتی ہے +

یہ ہستی کسی خاص طریقے، کسی خاص روش میں مقیّد نہیں ۔ لیکن ہر رستے کے نشیب و فراز، اور ہر روش کے پیچ و خم سے واقف ہے ۔ اُسے یہ کہنے کا حق ہے ؎

رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں مے زنم !

اُردو بک اسٹال لاہور